عصر حاضر کے جہاد کی
فکری بنیادیں
تاریخ کے آئینے میں
اولڈ ورلڈ آرڈر سے نیو ورلڈ آرڈر تک
فسطائیت
لادینیت
اشتراکیت
جمہوریت
سرمایہ دارانہ نظام
عالمی حکومت
ہدایت اللہ مہمند
حطین

عصرِ حاضر کے جہاد کی فکری بنیادیں

تاریخ کے آئینے میں

(اولڈ ورلڈ آرڈر سے نیو ورلڈ آرڈر تک)

ہدایت اللہ مہمند

ادارۂ حطین

نامِ کتاب: عصرِ حاضر کے جہاد کی فکری بنیادیں: تاریخ کے آئینے میں

نامِ مؤلف: ہدایت اللہ مہمند

تاریخِ اشاعت: ذوالحجہ ۱۴۳۴ھ

تعدادِ اشاعت: ۵۰۰۰

ناشر: ادارۂ حطین

قیمت:

فہرست

باب دوم

حصہ دوم

نیو ورلڈ آرڈر کا پہلا دور

پیش لفظ

الحمد للہ والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ وبعد،

مغرب نے امتِ مسلمہ کو اس کے دین سے کاٹنے اور اپنا غلام بنانے کے لیے جن ذرائع کو استعمال کیا ہے، ان میں سے ایک اساسی ذریعہ یہ ہے کہ امت کو اس کی اصل روشن و سنہری تاریخ سے کاٹ دیا جائے اور اسلامی تاریخ کا ایک متبادل مسخ شدہ تصور اس کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ مسلمان اپنی تاریخ کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھنے لگیں، اپنے اسلاف کے ذکر سے شرمانے لگیں اور ایک ایسی کشتی کی مانند ہو جائیں جس کا کوئی لنگر نہ ہو اور جسے مغرب کی ہوائیں جس سمت بھی چلانا چاہیں، وہ بلا مزاحمت اسی سمت چلتی چلی جائے۔ دوسری طرف مغرب نے اس امر کا بھی پورا اہتمام کیا ہے کہ وہ ہر قسم کی علمی دیانت کو پسِ پشت ڈال کر اپنی اصل تاریخ پر پردے ڈالے، اس کے بھیانک حقائق کو دنیا کی نگاہوں سے او جھل رکھے، اپنی جہالت، ظلم و بربریت اور فساد فی الارض کو چھپائے، خود کو دنیا کی سب سے مہذب، علم دوست اور متمدن ترین قوم کے طور پر پیش کرے اور یوں انسانیت پر اپنی جھوٹی دھاک بٹھائے۔ افسوس کہ مسلم دنیا پر استعماری طاقتوں کے قبضے کے بعد سے ہمارے نصابِ تعلیم میں (سکول سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک) تاریخ کا یہی مسخ شدہ نسخہ ہی پڑھایا جاتا رہا ہے اور آج تک پڑھایا جا رہا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے گھروں میں ایسی نئی نسل تیار ہو رہی ہے جو اپنی تاریخ سے، اپنے اسلاف سے، اپنی روایات سے، حتی کہ اپنے دین کی محکم تعلیمات تک سے لاعلم ہے اور اگر اسے اپنے بارے میں کسی چیز کا علم ہے تو وہ بھی ان غلط معلومات پر مبنی جو اس کے ذہنوں میں انڈیل دی گئی ہیں! دوسری جانب اسی نسلِ نو کو مغرب کی تاریخ، اس کے عقائد و نظریات، اس کے نظام، اس کی اقدار کا ایک ایسا حسین و جمیل غیر حقیقت پسندانہ تعارف کروایا گیا ہے کہ وہ مغرب سے آنے والے ہر تصور کو نقد سے بالا، خطاء سے پاک اور من و عن واجب الاتباع سمجھنے لگی ہے۔ تبھی معاشرے کی کیفیت ایسی ہو گئی ہے کہ ربِ کائنات کے نازل کردہ ناقابلِ تغیّر احکامات کو فرسودہ اور ناقابلِ عمل قرار دینے والوں کی عقلوں پر کوئی ماتم نہیں کرتا، لیکن جمہوریت، وطنی ریاست، وطنی افواج، اقوامِ متحدہ کے چارٹر، انسانی حقوق کے تصورات پر کوئی سوال اٹھا دے تو سب اسے حیرت سے تکنے لگتے ہیں اور اس کی 'جہالت' پر افسوس کرتے ہیں!

اسی لیے آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس مسخ شدہ تاریخ کی جگہ ایک بار پھر امت کے سامنے اس کی اور مغرب کی اصل تاریخ منظم اور سہل انداز میں پیش کی جائے۔ تاریخ کو ٹھیک طرح سمجھ لینے سے خود بخود بہت سی گتھیاں سلجھتی جاتی ہیں، بہت سی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں اور بہت سے حقائق منکشف ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے محترم مجاہد بھائی جناب ہدایت اللہ مہمند صاحب کو بہترین جزا دیں کہ انہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ یقیناً تاریخ کے وسیع اور عمیق مطالعے کے سبب آپ ہی کا حق بنتا تھا کہ آپ اس موضوع پر کچھ لکھیں۔ الحمدللہ اس کتاب میں آپ نے نہایت سہل انداز میں مسلمانوں اور ان کے بنیادی دشمنوں کی تاریخ کو بیان کیا ہے اور بہت طویل مباحث کو نہایت مختصر اور جامع اسلوب میں پیش کیا ہے۔ مصنفِ محترم نے تصنع اور لفاظی سے کام لینے کی بجائے تاریخی حقائق کو بلا کم و کاست، جیسے وہ ہیں ویسے ہی بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اس سادہ اور سہل اسلوب نے تحریر کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب ایک رواں انداز میں قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے اور نہایت ہلکے پھلکے اور غیر محسوس انداز میں تاریخ کے اہم اسباق اس کے ذہن میں اتارتی چلی جاتی ہے۔ کتاب کا مطالعہ مکمل ہونے پر قاری کو خود بخود ان سوالات کے جواب مل جاتے ہیں کہ عصرِ حاضر کی عالمی جہادی تحریک کیوں برپا ہوئی ہے؟ اس نے جہاد و قتال کی راہ کیوں اختیار کی ہے؟ اس تحریک کی بنیادی دعوت کیا ہے؟ اس کے اہداف و مقاصد کیا ہیں؟ اور کیوں پوری امت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مجاہدین کی پشت پر کھڑی ہو؟

مصنف نے تاریخ بیان کرنے کے دوران ہی یہودیت، عیسائیت اور سیکولرازم کے عقائد و افکار کو بھی نہایت سلیس انداز میں بیان کر دیا ہے اور ان عقائد کا غیر محسوس رد بھی ساتھ ساتھ کرتے گئے ہیں۔ یقیناً مغرب کی تاریخ سمجھنے کے علاوہ مغرب کے عقائد و افکار سمجھنے کے لیے بھی اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید رہے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مغرب کی جدید فکری یلغار کا اردو زبان میں مقابلہ کرنے کے لیے جو جہد مطلوب ہے، اس مطلوب کو پورا کرنے میں یہ کتاب ان شاء اللہ ایک اہم کردار ادا کرے گی، تو اللہ سے امید ہے کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا۔

ہم اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کے علم، عمر اور فہم میں مزید برکت دیں اور ان کی اس تحریر کو جہادی تحریک اور پوری امتِ مسلمہ کے لیے نفع کا باعث اور راہِ ہدایت پر جمنے کا ذریعہ بنا دیں اور اس تحریر کو مصنف کی مغفرت کا وسیلہ بھی بنا دیں، آمین! ہم اللہ تعالیٰ سے محترم بھائی مولانا مثنیٰ حسان صاحب کے لیے بھی دعا گو ہیں جنہوں نے نہایت عرق ریزی سے کتاب کی مراجعت کی، اس کی لغت کو مزید رواں اور شستہ بنایا، کتاب پر مفید حاشیوں کا اضافہ کیا اور بحیثیتِ مجموعی کتاب کے حسن و نکھار کو بڑھا دیا۔ اللہ ان سے یہ مبارک

عمل قبول فرمائیں،آمین ! اللہ تعالیٰ کی لاکھوں رحمتیں ہوں ادارۂ حطین سے وابستہ رہنے والے مجاہد عالمِ دین مولانا عبدالصمد (محمد علی صدیقی) رحمۃ اللہ علیہ پر جنہوں نے چند سال قبل اس کتاب کے ابتدائی مسودے کی مراجعت کی تھی،اس پر اپنے مفید تبصروں سے نوازا تھااور کتاب کے لیے ''عصرِ حاضر کے جہاد کی فکری بنیادیں،تاریخ کے آئینے میں''کا خوبصورت نام تجویز کیا تھا۔اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ان کے درجات کی بلندی کا ذریعہ بنادیں۔آمین ! اسی طرح ہم محترم مولانا عبیدالرحمن صاحب کے لیے بھی دعا گو ہیں جنھوں نے کتاب کی تالیف کے زمانے میں مصنف کی بھرپور معاونت کی اور اپنی مخصوص تحقیقی نظر کے ساتھ مسودے کی مراجعت کی۔اللہ تعالیٰ انھیں اس کے بدلے بہترین جزاء عطا فرمائیں،آمین۔آخر میں رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس پوری محنت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں اور اسے دنیا میں مسلمانوں کے عروج کے راستے کا ایک نشانِ راہ بنادیں،آمین۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم

ادارۂ حطین

مقدمہ

عصر حاضر کے جہاد کی فکری بنیادیں

تاریخِ عالم میں نوعِ انسانی کو دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم کے انسان وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر (کسی نہ کسی صورت میں) اعتقاد رکھتے ہیں اور اس سے اجر کی توقع بھی رکھتے ہیں۔ اس قسم کے انسانوں کے تین بڑے گروہ ہیں؛ مسلمان، یہود اور نصاریٰ۔ ان کے علاوہ وہ مشرکین بھی اس قسم میں شامل ہیں جو اللہ پر یقین تو رکھتے ہیں مگر اپنے دیوی اور دیوتاؤں کو اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ دوسری قسم کے انسان وہ ہیں جو ذاتِ باری تعالیٰ کا تصور نہیں رکھتے اور نہ ہی اس سے اجر اور ثواب کی توقع رکھ کر عمل کرتے ہیں۔ اس گروہ میں وہ بت پرست شامل ہیں جو اپنے تراشیدہ بتوں کو ہی خالق، مالک اور رازق کا درجہ دیتے ہیں اور انھی سے اجر کی توقع رکھتے ہیں۔ اس قسم کے انسانوں میں دوسرا گروہ وہ ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ صرف انسانیت کی خاطر عمل کرتا ہے۔ اس کا ظاہری شعار بس انسان کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔ وہ اپنے اس عمل پر اللہ تعالیٰ یا کسی بھی مافوق الفطرت ہستی سے اجر کی توقع نہیں رکھتے۔ پوری انسانی تاریخ ان مختلف گروہوں کے درمیان کشمکش کا نام ہے۔ امتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی مختلف انسانی گروہوں کے من گھڑت باطل نظریات کا رد کرنا اور دنیا میں دینِ حق کے مطابق زندگی گزارنا اور آسمانی ہدایت کا پرچار کرنا ہے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اور جس دنیا میں جی رہے ہیں، اس کی تشکیل میں انسانی تاریخ کے چار واقعات کا بنیادی کردار ہے[1]۔ ان میں سے

- پہلا واقعہ تین سو سال قبلِ مسیح میں یونانی فلسفے کا عروج ہے،

---

[1] اس وقت پوری دنیا میں جو مخصوص نظریاتی، جغرافیائی اور معاشرتی ترتیب پر مشتمل عمرانی نظام رائج ہے، صاحبِ کتاب اس کی تشکیل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور یہ بات وہ تاریخِ انسانی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ یہاں یہ اشتباہ وابہام پیدا نہ ہو کہ وہ پوری تاریخِ انسانی میں ہر جہت اور ہر پہلو کے اعتبار سے مطلقاً انھی چار واقعات کو سب سے اہم قرار دے رہے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ تاریخِ انسانی میں ایسا واقعہ محض ایک ہی ہے جس نے ہر جہت اور ہر اعتبار سے دنیا کے نظام اور ترتیب...... خواہ وہ معاشرتی ہو، معاشی ہو، سیاسی ہو، عمرانی ہو...... پر اثر ڈالا اور نہ صرف اثر ڈالا بلکہ اسے آسمانی ہدایت کے عین مطابق درست کر دیا، اور وہ عظیم واقعہ بعثتِ محمدی ﷺ ہے۔ فعلی نبینا وسیدنا مئه آلاف صلوات وسلام! (م۔ح)

- دوسرا واقعہ پہلی صدی عیسوی میں یہودیوں کی طرف سے قتلِ عیسیٰ علیہ السلام کی سازش اور ان کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا ہے،
- تیسرا اہم واقعہ شہادتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہے جو امتِ مسلمہ میں فتنوں کے آغاز کے لیے دروازہ ثابت ہوا،[2]
- اور چوتھا بڑا واقعہ ۱۷۸۹ء کا انقلابِ فرانس ہے جس میں پورے یورپ نے عیسائی کلیساء کے بنائے ہوئے اللہ کی حکومت اور انسان کی حکومت کے نظام کو بیک جنبشِ قلم مسترد کر دیا اور اس کی جگہ لادین عقائد کو اپنالیا تھا۔

پہلا واقعہ: تین سو سال قبلِ مسیح میں فلسفہ یونان کا عروج

تقریباً تین سو سال قبلِ مسیح میں یورپ کے علاقے یونان میں ایک ایسی تہذیب اٹھی جس نے علم وحی اور انسانی عقل کے درمیان کشمکش کی بنیاد ڈالی۔ یونان میں اللہ کے تصور اور علم وحی کی رہنمائی کے بغیر انسانی عقل کے مطابق زندگی گزارنے کے تصورات پر تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک نے بہت سے معروف فلسفیوں کو جنم دیا جن میں افلاطون اور ارسطو نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ وہاں ابتداء ہی سے ایسی بحثوں کا آغاز ہو گیا جن کا مرکز و محور وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو کر محض اپنی عقل سے انسانی زندگی کو درپیش مسائل کا حل پیش کرنا تھا۔ یہ تمام فلسفی مذہب کے عطا کردہ مختلف عقائد خصوصاً عقیدۂ تقدیر کے خلاف تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ

---

[2] یہاں یہ اصولی بات پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین جو واقعات پیش آئے، جمہور علمائے سلف نے ان کے بارے میں گفتگو سے اعراض کیا ہے اور ان معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا ہے، نیز تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہی اعتقاد رکھا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے حق میں اپنی رضا کا فیصلہ کیا ہے اور انھوں نے اجتہاد کیا ہے اور اپنے اجتہاد کی بدولت وہ ثواب کے مستحق ہیں۔ یہی اعتقاد جو علمائے سلف سے مروی ہے، ہمارا بھی ہے کہ ہم ان معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن نہیں کرتے اور انھیں عند اللہ ماجور سمجھتے ہیں۔ یہاں صاحبِ کتاب نے شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعے کا تذکرہ اس تناظر میں کیا ہے کہ اس واقعے کے بعد جن فتنوں نے جنم لیا، عقائد و سیاست کے باب میں ان کے کیا اثرات ہوئے؟ اور اس تذکرے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مبارک ہستیوں کو بحث کا موضوع نہیں بنایا۔ اس مقام پر ہر قاری سے التماس ہے کہ مشاجراتِ صحابہ کے باب میں جو کچھ مستشرقین اور ان سے متاثر حضرات نے ہرزہ سرائی کی ہے اور جس انداز میں تاریخِ اسلامی کے اس خیرِ قرون کا تذکرہ و تجزیہ کیا ہے، اس کی طرف ہرگز التفات نہ کیا جائے کیونکہ ان کا کوئی اعتبار نہیں اور خاص طور پر جبکہ اس باب میں شیعہ روافض کی من گھڑت روایات ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ (م۔ح)

اگر کوئی بیماری سے مر جائے تو مذہب کا یہ کہنا کہ اللہ کی مرضی یہی تھی، غلط ہے کیونکہ اگر اس بندے کے پاس پیسے ہوتے اور علاج کرتا تو اس کی جان بچ جاتی۔ وہ کہتے تھے کہ مذہب تو انسان کو افیم پلا رہا ہے۔ انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے مسائل خود حل کرے مگر انسان کو مذہب کی قید ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتی لہٰذا انسان کو مذہب سے آزادی حاصل کرنا ہوگی۔ گویا ان فلسفیوں نے مذہب کے خلاف ایک ردِ عمل پیدا کیا۔ اس کے نتیجے میں انسانی مسائل کے حل کے لیے الہامی تعلیمات سے روگردانی پر مبنی نئے نئے فلسفے جنم لینے لگے۔ ان فلسفوں نے مذہب کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا اور یوں انسان کی ساری کاوشیں رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر کھپنے کی بجائے بے منزل راستوں پر بکھرنے لگیں اور نتیجے میں اپنے مسائل اپنی اپنی عقل سے حل کرنے کی منظم فکری جدوجہد کا آغاز ہو۔ ابتدائی طور پر ان فلسفیوں کے گمراہ نظریات کو کسی بھی معاشرے میں چاہے وہ یہودی معاشرہ ہو یا ہندو معاشرہ، خاص پذیرائی نہ ملی بلکہ انھیں لادین اور ملحد قرار دے کر سختی سے دبایا گیا۔

امتِ مسلمہ میں ان افکار کا پرچار اس وقت ہوا جب خلیفہ مامون الرشید کے دار الحکمت نے یونان کے اس فلسفے کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ ان تراجم کی وجہ سے امت مسلمہ میں معتزلی فتنے کا آغاز ہوا۔ انسانی عقل کی بنیاد پر عقائد اور علمِ کلام کی نئی بحثوں کا آغاز ہوا، جس نے امت میں نئے فتنوں کا دوازہ کھول دیا۔ علمائے حق نے ان فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دلیل کی قوت سے ان کا باطل ہونا واضح کیا۔ مگر دوسری طرف عیسائی مغرب میں ان افکار نے بعد کے ادوار میں تباہی مچا کر رکھ دی اور خود انقلابِ فرانس انھی افکار کی جیت کا نام تھا۔ آج یہی لادین نظریات دنیا پر راج کر رہے ہیں۔

دوسرا واقعہ: یہودیوں کی قتلِ عیسیٰ علیہ السلام کی سازش اور ان کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا

فلاسفہ یونان کا تعلق انسانوں کے اس گروہ سے تھا جو اللہ سے کسی اجر کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ جبکہ اللہ سے اجر کی توقع رکھ کر عمل کرنے والوں کی فکری تقسیم کا آغاز بنی اسرائیل کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرنے، ان کے قتل کی سازش تیار کرنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفعتِ آسمان سے ہوتا ہے۔ یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی سازش کو اللہ تعالیٰ نے ناکام بنا دیا تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بعثت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اللہ نے دینِ حق کی پیروی اور اس کی تبلیغ کے لیے بنی اسرائیل کو منتخب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے پے در پے انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث

فرمائے۔ ان انبیائے بنی اسرائیل کے سلسلے کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ بنی اسرائیل کی اکثریت اتنی گمراہی میں مبتلا ہو چکی تھی کہ اسی دور میں پہلے انھوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا، اس کے بعد ان کے والد حضرت زکریا علیہ السلام کو شہید کیا اور اب ان کا آخری ہدف حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو راہ سے ہٹانے کے لیے بنی اسرائیل کے علمائے سو نے رومی گورنر کے ساتھ مل کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب چڑھانے کا مطالبہ کر دیا۔ رومیوں نے جب یہ فیصلہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ ہی آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ یہودی یہ سمجھتے رہے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے مگر اس معاملے میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شبہ میں ڈال دیے گئے اور بعد میں آنے والے نصاریٰ بھی اسی شبہ میں مبتلا ہو گئے [3]۔

اس واقعے کے بعد بنی اسرائیل ......جو دینِ حق کے پیروکار، اللہ کی چہیتی قوم اور بیت المقدس کے وارث تھے...... کافر اور اللہ کی مغضوب قوم بن گئے۔ اب دینِ حق کی ذمہ داری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں کے سپرد ہو گئی جنھوں نے تبلیغِ دین کا کام شروع کر دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد ایک یہودی سینٹ پال نے دین حق کو قبول کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے ساتھ مل کر دین کی تبلیغ کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس نے دینِ حق میں اپنے گھڑے ہوئے عقائد شامل کرنا شروع کر دیے اور امتِ نصاریٰ سینٹ پال کے عقائد کی وجہ سے گمراہ ہو گئی، یہاں تک کہ اسلام کے ظہور سے پہلے پوری انسانیت گمراہی کے اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔ خود اسلام کا ظہور اور اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا مقصد یہود اور نصاریٰ کی ان گمراہیوں کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ہدایت اور دینِ حق کا پھیلانا تھا۔[4]

---

[3] اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ (النساء: 157،158)

''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح (اور) اللہ کے رسول، حضرت عیسی بن مریم (علیہ السلام) کو قتل کر دیا جبکہ انھوں نے نہ تو اسے قتل کیا اور نہ ہی سولی دی لیکن ان پر معاملہ مشتبہ کر دیا گیا۔ اور جو لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں مبتلا ہیں، ان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں بلکہ وہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں۔ اور بلاشبہ ان لوگوں نے اسے قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے پاس اٹھا لیا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے''۔

[4] ارشادِ باری ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ (التوبة: 33)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا انسانی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں سے ہے۔ اس واقعے کے بعد نہ صرف اللہ سے اجر کی توقع رکھنے والے تین گروہوں یعنی مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان فکری حد بندی ہوگئی بلکہ سیاسی طور پر بھی پوری دنیا کی تنظیمِ نو میں اس واقعے نے اہم کردار ادا کیا، چاہے وہ 'اولڈ ورلڈ آرڈر' (Old World Order) ہو یا 'نیو ورلڈ آرڈر' (New World Order) یعنی دنیا کی قدیم ترتیب ہو یا دنیا کی جدید ترتیب۔

اولڈ ورلڈ آرڈر دراصل اللہ سے توقع رکھ کر عمل کرنے والے انسانوں کے دو بڑے گروہوں کی پرانی ترتیب ہے جس میں امتِ مسلمہ اور یورپ کے رومن کیتھولک عیسائیوں کے درمیان مقابلہ تھا، جبکہ نیو ورلڈ آرڈر انھی گروہوں کی مختلف اور نئی ترتیب کا نام ہے۔ اس ترتیب میں رومن کیتھولک عیسائیوں کی جگہ پروٹیسٹنٹ عیسائی، لادین عیسائی اور یہودی زیادہ واضح دشمن کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ چنانچہ امتِ مسلمہ کے دشمن تو وہی ہیں مگر نیو ورلڈ آرڈر پرانے شکاریوں کا نیا جال ہے جس کا تفصیلی ذکر ہم آگے کریں گے ان شاء اللہ۔

تیسرا واقعہ: شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ

شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی بنیادی وجہ عبداللہ بن سباء کا پھیلایا ہوا رافضی فتنہ تھا۔ یہ خطرناک سبائی فتنہ اپنے بعد آنے والے ان گنت فتنوں کا ایسا دروازہ ثابت ہوا جو شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد یوں کھلا کہ آج تک بند نہ ہو سکا۔ دوسری طرف شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کا مطالبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جنگِ صفین کا موجب بنا۔ جنگِ صفین میں بعض لوگوں نے ناحق تحکیم کا مسئلہ کھڑا کیا جس سے خارجی فتنے کا آغاز ہوا۔ خارجی فتنہ معتزلہ اور مرجئہ فرقوں کے ظہور کا باعث بنا۔ اس طرح شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا المناک حادثہ امتِ مسلمہ میں فکری اور سیاسی فتنوں کا ایک دروازہ ثابت ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان فتنوں نے کئی شکلیں بدلیں اور امتِ مسلمہ کو بہت نقصان پہنچایا۔ علمائے حق نے ہر فتنے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور داخلی طور پر سنت و بدعت اور دین و بے دینی کی تقسیم کو واضح کرکے باقاعدہ فرقہ ناجیہ کی حد بندی کر دی جسے ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کہا گیا۔ اس طرح تمام باطل و گمراہ عقائد و نظریات دینِ

''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے دیگر ادیان پر غالب کر دے، چاہے مشرکوں کو ناگوار ہی گزرے''۔

اسلام میں کوئی جگہ نہ پاسکے اور دینِ اسلام ہر قسم کی گمراہی سے محفوظ رہا۔ نیز علمائے حق نے ایسے عقائد اور اعمال کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر دی جنھیں اپنانے اور ان پر عمل پیرا ہونے سے مسلمان ملتِ اسلامیہ سے خارج ہو کر کافر بن جاتا ہے۔

چوتھا واقعہ: انقلابِ فرانس (نیو ورلڈ آرڈر)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی سازش سے لے کر انقلابِ فرانس تک کا دور آغاز میں امتِ یہود، امتِ نصاریٰ اور مشرکین کے درمیان کشمکش کا دور تھا۔ پھر ساتویں صدی عیسوی میں ظہورِ اسلام کے بعد سے یہ یہود، نصاریٰ اور امتِ مسلمہ کے درمیان مسلسل کشمکش کا دور رہا۔ اس دور کو مغرب کے مؤرخین 'اولڈ ورلڈ آرڈر' (Old World Order) کے نام سے جانتے ہیں۔ انقلابِ فرانس کے بعد دنیا بظاہر ایک نئے دور میں داخل ہو گئی، جو در حقیقت قدیم ملحدانہ یونانی فلسفے ہی کا تسلسل تھا۔ اس دور کو تاریخ میں 'نیو ورلڈ آرڈر' (New World Order) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ نیو ورلڈ آرڈر انسانی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں لے کر آیا، مگر حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں بدلا۔ نیو ورلڈ آرڈر اب یہودیوں اور ان کے صلیبی اتحادی پروٹیسٹنٹ فرقے کے ہاتھ میں ہے۔ اولڈ ورلڈ آرڈر میں امتِ مسلمہ کا مقابلہ رومن کیتھولک عیسائیوں سے تھا، اب امتِ مسلمہ کے مقابل 'صلیبی صہیونی اتحاد' ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر یہودیوں کی قدیم تاریخ کو دوبارہ حاصل کرنے کا نام ہے جس میں وہ فلسطین پر قبضہ کرنے سے لے کر 'مسجدِ اقصیٰ' کا انہدام کر کے اس کی جگہ 'ھیکلِ سلیمانی' کی تعمیر اور پھر اپنے مسیحا کی مدد سے عالمگیر حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس طرح نیو ورلڈ آرڈر دراصل پرانے شکاریوں کا نیا جال ہے۔ اس نظام میں وہی یہودی، عیسائی اور مشرک اپنے قدیم شرک، قدیم سودی نظام اور قدیم فحاشی و عریانی کے ساتھ موجود ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ پرانے نام اور اصطلاحات کی جگہ اب نئے ناموں، نئی اصطلاحات اور نئی ترتیب نے لے لی ہے۔ ان نئے ناموں، اصطلاحات اور جدید ترتیب نے امتِ مسلمہ میں سے بہت سوں کو اپنے نئے جال میں پھنسا کر تذبذب اور الجھن کا شکار کر دیا ہے۔ امتِ مسلمہ کے دورِ زوال سے یہ کیفیت ایک بیماری کی طرح امتِ مسلمہ میں پھیل گئی۔ اس فکری انتشار اور ارتداد کے دور میں اللہ تعالیٰ نے 'علمائے حق اور مجاہدین کے گروہ' کو پوری امت میں سے اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا فرما دیا جو الحمد للہ تسلسل کے ساتھ ان پرانے شکاریوں کے نئے جال کا پردہ چاک کر رہے ہیں۔

ہماری اس کتاب کا اصل مقصد یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے۔ ہمارے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ امتِ مسلمہ کا درد رکھنے والے بہت سے نوجوان ایسے ہیں جو عصر حاضر میں جہاد کی فکری بنیادوں کے پس منظر سے واقف نہیں ہیں۔ اگر وہ کچھ جانتے بھی ہیں تو چند ایک ٹوٹے واقعات۔ وہ اتنی صلاحیت نہیں رکھتے کہ ان واقعات کو ایک مربوط شکل میں سمجھ سکیں۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم ان واقعات کا احاطہ کریں جو عصر حاضر میں برپا تحریکِ جہاد کی فکری بنیادوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں اور ان واقعات کو آسان اور مربوط انداز میں پیش کریں تاکہ بات سمجھ میں آجائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقصد میں کامیاب فرمائے اور اپنی جناب سے اس کام کی انجام دہی کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اس کتاب کو ہم نے دو حصوں اور اختتامیہ میں تقسیم کیا ہے؛

- پہلا حصہ: اولڈ ورلڈ آرڈر یعنی دنیا کی قدیم ترتیب
- دوسرا حصہ: نیو ورلڈ آرڈر یعنی دنیا کی جدید ترتیب

کتاب کا پہلا حصہ 'اولڈ ورلڈ آرڈر' دو ابواب پر مشتمل ہے:

- باب اول: یہود اور اولڈ ورلڈ آرڈر
- باب دوم: مغرب اور اولڈ ورلڈ آرڈر

باب اول میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ یہودیوں کی قدیم تاریخ میں وہ کون سے عقائد اور واقعات ہیں جنھوں نے پہلے قدیم دنیا پر اور پھر جدید دنیا پر اثرات ڈالے؟ اور وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر بنی اسرائیل مسلمان سے یہودی بن گئے؟ باب دوم میں ہم نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد 'دینِ حق' عیسائیت میں کیسے تبدیل ہو گیا؟ پھر ہم یورپ میں عیسائیت کے عروج اور پھر وہاں ہونے والی فکری تبدیلیوں کا جائزہ لیں گے۔ آخر میں انقلاب فرانس کے باعث یورپ میں قدیم دینا کی ترتیب ٹوٹنے کی وجوہات اور ان کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'نیو ورلڈ آرڈر' چار ادوار پر مشتمل ہے:

- نیو ورلڈ آرڈر کا پہلا دور؛ انقلابِ فرانس سے لے کر جنگِ عظیم اول تک
- نیو ورلڈ آرڈر کا دوسرا دور؛ جنگِ عظیم اول سے لے کر جنگِ عظیم دوم تک
- نیو ورلڈ آرڈر کا تیسرا دور؛ روس اور امریکہ کے مابین سرد جنگ
- نیو ورلڈ آرڈر کا چوتھا دور؛ سرد جنگ کے خاتمے سے لے کر آج تک

اس حصے میں ہم انقلابِ فرانس کے بعد سے عصر حاضر تک کی دنیامیں فکری اور جغرافیائی تبدیلیوں کا مرحلہ وار جائزہ پیش کریں گے۔ اس حصے میں ہماری کوشش ہوگی کہ اِن سوالات کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں کہ نیو ورلڈآرڈر یعنی دنیاکی جدید ترتیب ...... جس کاآج کے زمانے میں بہت چرچاہے......دراصل ہے کیا؟ اس کی فکری بنیادیں کیاہیں؟ یہ کیسے وجود میں آیا؟ اس کے مقاصد کیاہیں؟ اولڈورلڈآرڈر، نیو ورلڈآرڈر میں کیسے تبدیل ہوا؟ نیو ورلڈآرڈر کواپناکر امتِ مسلمہ کو کیاملا؟نیو ورلڈآرڈرامتِ مسلمہ کو کہاں لے کر جارہاہے؟

اختتامیہ میں ہم نے پوری تاریخ کو سمیٹتے ہوئے نیو ورلڈآرڈر کے نمایاں خدوخال واضح کیے ہیں اور اس کے زندہ پہلوؤں کواجاگر کیاہے۔اور یہ پوری تصویر دکھانے کے بعد امتِ مسلمہ کے سامنے حل پیش کیاہے اور ان اقدامات کی نشاندہی کی ہے جو صلیبی وصہیونی اتحاد کے عالمی نظام کو مغلوب کرنے، امت کوآزاد کرکے اسے دنیا میں غالب کرنے اور خلافت علی منہاج النبوۃ کو قائم کرنے کے لیے لازم وضروری ہیں۔

آخر میں ہم وضاحت کرتے چلیں کہ اس کتاب کے پہلے مخاطب دنیاکے مختلف خطوں میں برسرِپیکار مجاہدین فی سبیل اللہ، خاص طورپر خراسان میں برسرِجہاد مجاہدینِ فی سبیل اللہ ہیں اور مقصود یہ ہے کہ وہ عصرِحاضر کی دنیا سے بخوبی واقف ہوسکیں اور اپنے دشمنوں کی حقیقت اور ان کی چالوں سے کامل آگاہی حاصل کرلیں تاکہ اس وقت جاری تحریکِ جہاد درست سمت میں رواں رہے، نشانِ راہ آنکھوں کے سامنے رہیں اور جادہ ومنزل معلوم ومتعین ہو۔اللہ تعالیٰ تمام مجاہدین کے حامی وناصر ہوں، آمین۔

اس کے بعد یہ کتاب پوری امتِ مسلمہ اور اس کے سنجیدہ طبقوں کو مخاطب کررہی ہے اور ان کے سامنے عصرِحاضر کے حالات کادرست تجزیہ اور پھراس کادرست حل پیش کرنے کی سعی کررہی ہے۔بلاشبہ ہر صاحبِ نظر مسلمان جانتاہے کہ موجودہ 'یہود کے ہاتھ غلام' عالمی ذرائع ابلاغ نے حقیقی صورتحال کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کررکھاہے اور ان کابنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمان حقیقت سے دور رہیں اور شکوک وشبہات کا شکار رہیں، تاکہ یہ امت بحیثیتِ امت کہیں جاگ نہ جائے، ان کے مقابلے کے لیے کھڑی نہ ہوجائے اور وہ خلافت دوبارہ معرضِ وجود نہ آجائے جس نے صدیوں دنیاپر حکمرانی کی۔ ہم اپنی محبوب امتِ مسلمہ کے سامنے یہ واضح کرتے چلیں کہ یہ جنگ محض گروہِ مجاہدین کی جنگ نہیں اور نہ ہی دشمن یہ جنگ محض ان چند نوجوانوں کے خلاف لڑرہاہے، بلکہ یہ جنگ تو صلیبی صہیونی اتحاد تمام مسلمانوں اور امتِ مسلمہ کے خلاف لڑرہاہے اور اس کا اصل ہدف دینِ اسلام ہے۔ لہٰذا اس کا مقابلہ چند مجاہدین کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ یہ وہ وقت ہے جب امتِ مسلمہ کو بحیثیت ایک 'امت' دوبارہ میدانِ عمل میں اترناہے، میدانِ قتال میں موجود اپنے بیٹوں کی پشتیبانی کرنا

ہے اور قتال کے علاوہ دیگر تمام محاذوں پر...... دستیاب وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے...... خود بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کرنا ہے۔ پس یہ کتاب پوری امتِ مسلمہ کے لیے پیغامِ عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں اور اسے امتِ مسلمہ کی بیداری کا موجب بنا دیں، آمین۔

ہدایت اللہ مہمند

حصہ اول

اولڈ ورلڈ آرڈر

باب اول

یہود اور اولڈ ورلڈ آرڈر

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی سازش اور ان کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے واقعے سے جدید دنیا کا آغاز ہوتا ہے۔ جدید دنیا کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں سے ایک دنیا کی قدیم ترتیب ہے جسے انگریزی میں 'اولڈ ورلڈ آرڈر' کہتے ہیں۔ یہ تقسیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے ستر سال بعد شروع ہو کر انقلابِ فرانس تک چلتی ہے۔ دنیا کی دوسری تقسیم انقلابِ فرانس سے شروع ہو کر عصر حاضر تک جاری ہے۔ اسے 'نیو ورلڈ آرڈر' یعنی 'دنیا کی نئی ترتیب' کہا جاتا ہے۔ اولڈ ورلڈ آرڈر ہو یا نیو ورلڈ آرڈر دونوں کی تاریخی جڑیں یہودیوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی سازش تیار کرنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے سے ہی شروع ہوتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے ستر سال بعد ۷۰ء میں رومیوں کے گورنر ٹائیٹس (Titus) نے یہودیوں کو یروشلم سے نکال دیا تھا۔ ۷۰ء سے ۱۹۴۸ء تک اٹھارہ سو بیاسی سال یہ یہودی یورپ اور مسلم دنیا میں دربدر پھرتے رہے۔ ۱۷ اکتوبر سن ۱۹۱۷ء کو پہلی جنگِ عظیم میں برطانیہ کے جنرل ایلن بی (General Edmund Allenby) نے یروشلم مسلمانوں سے چھین لیا۔ جنرل ایلن بی کی اس فوج میں ہندوستان سے بھرتی کی ہوئی فوج بھی شامل تھی جس کے سپاہیوں میں نام نہاد مسلمان بھی تھے۔ ۲ نومبر سن ۱۹۱۷ء کو لارڈ بالفور (Lord James Balfour) ......جو اس وقت برطانیہ کا وزیر خارجہ تھا......نے بدنامِ زمانہ 'بالفور اعلامیہ' (Balfour Declaration) جاری کیا جس میں صہیونی تحریک (Zionist Movement) کو ریاستِ اسرائیل کے قیام کے لیے برطانیہ کی حمایت کا یقین دلایا گیا اور یروشلم کو یہودی آبادکاری کے لیے برطانیہ کے قبضے میں دے دیا گیا۔ سن ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ (United Nations) نے اپنے ایک اعلامیہ کے تحت برطانوی قبضہ ختم کرتے ہوئے فلسطین کو یہودی ریاست کے طور پر تسلیم کر لیا۔

یہود کی مکمل تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان دنیا میں تو یہ یہودی ذمی بن کر امن سے رہتے رہے جبکہ یورپ کی عیسائی دنیا میں رومن کیتھولک عیسائی انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قاتل تصور

کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عیسائی دنیا میں یہودیوں کی حیثیت تیسرے درجے کے شہری سے بھی گئی گزری تھی اور ان کے لیے حکومت اور فوج کی ملازمتیں بند تھیں۔ یورپ میں یہودی صرف تجارت کر سکتے تھے جو کہ یورپ کے جاگیردار معاشرے میں ایک تیسرے درجے کا پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن ان اٹھارہ سو بیاسی سالوں میں یہودیوں نے بالآخر اپنے سب سے بڑے دشمن 'عیسائیوں' کو اپنا دوست بنالیا اور ان کی مدد سے وہ نہ صرف فلسطین میں اپنی ریاستِ اسرائیل قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے بلکہ دنیا کی معیشت پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے چند سوالات جنم لیتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن کیوں بن گئے؟ وہ کون سی وجوہات تھیں جنھوں نے اللہ کی چہیتی قوم بنی اسرائیل کو مسلمان سے یہودی بنا دیا؟ مسلمان سے یہودی بننے کے بعد اس قوم نے ۷۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کے اٹھارہ سو بیاسی سال کن مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے صرف کیے اور ان مقاصد کو کیسے حاصل کیا؟ یورپ کی عیسائی دنیا...... جو کبھی یہودیوں کی جانی دشمن تھی...... آج ان کی اتنی دوست کیسے بن گئی کہ ان کی خاطر اپنی فوج بھیج کر ریاستِ اسرائیل کے قیام میں بھرپور معاونت کی؟ یورپی عیسائی آخر یہودیوں کے دوست کیسے بن گئے؟

ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے ہمیں یہودیوں کی قدیم اور جدید تاریخ کے اوراق کو الٹنا ہوگا۔ یہودیوں کی قدیم تاریخ حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تقریباً دو سے اڑھائی ہزار سال پر محیط ہے اور ان کی جدید تاریخ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عصر حاضر تک تقریباً دو ہزار سال پر محیط ہے۔

یہودیوں کی قدیم تاریخ دراصل بنی اسرائیل کی وہ تاریخ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں بہت تفصیل سے کیا ہے۔ یہ تاریخ حضرت یوسف علیہ السلام کی مصر آمد سے شروع ہوتی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عروجِ آسمان کے ستر سال کے بعد یعنی ۷۰ء میں رومیوں کے یروشلم پر قبضے اور یہودیوں کو وہاں سے نکالنے تک مکمل ہوتی ہے۔ یہ تمام عرصہ تقریباً اڑھائی ہزار سال بنتا ہے۔ اس تمام عرصے میں بنی اسرائیل پر بہت سے ادوار گزرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے بے شمار انبیائے کرام علیہم السلام کو بھیجا۔ ان کی ہدایت کے لیے تورات، زبور اور انجیل نازل فرمائی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے انبیاء کی بجائے علمائے سوء کی باتوں کو زیادہ ماننا شروع کر دیا، اللہ کی کتابوں میں تحریفات شروع کر دیں اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق جھوٹے قصے کہانیاں گھڑ کر ان کے مقام کو عوام کی نظروں میں گرانا شروع کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے پے در پے انبیاء علیہم السلام بھیجے جو ان کو کتاب اللہ میں تحریفات سے منع کرتے اور دین پر چلنے کی ہدایت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے بنی اسرائیل کو بتادیا کہ اپنی نافرمانیوں کے سبب ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا اور وہ یروشلم سے نکال دیے جائیں گے۔ پھر بخت نصر کے دور میں ایسا ہی ہوا۔ گو اس وقت بنی اسرائیل اپنے نبیوں کی دعاؤں سے واپس یروشلم چلے گئے، لیکن انھوں نے پھر سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں شروع کردیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نہ صرف تکذیب کی بلکہ انھیں نعوذ باللہ اپنی طرف سے قتل کردیا۔ اس جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے عذاب کے طور پر انھیں دوسری مرتبہ ۷۰ء میں رومیوں کے ہاتھوں یروشلم سے نکال دیا۔

۷۰ء کے بعد سے بنی اسرائیل کی جدید تاریخ شروع ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے یروشلم سے نکلنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سزا تھی تاکہ بنی اسرائیل ایک بار پھر اللہ کی طرف رجوع کریں، دینِ عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کریں اور ان کے بعد دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کریں جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرما کر ان کو واپس یروشلم لے جائے، وہ اللہ کی رضا اور جنت کے مستحق بن جائیں۔ لیکن یروشلم سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل نے کمال ڈھٹائی سے نہ صرف اللہ کی نافرمانی کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ اپنی قدیم تاریخ سے اپنے لیے نئے اور جھوٹے عقائد گھڑ کر ایک نیا دین بنالیا جسے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

ان جھوٹے عقائد میں فلسطین کو یہودیوں کا 'الارض الموعودہ' قرار دینا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ کسی اور جھوٹے کو 'مسیحاء' قرار دینا، یہودیوں کو 'اللہ کی چہیتی' قوم قرار دینا، مسجدِ اقصیٰ کی جگہ 'ھیکلِ سلیمانی' کی تعمیر کا عقیدہ اور ایسے بہت سے عقائد شامل ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان عقائد کی بنا پر یہودیوں نے فلسطین کو حاصل کرنے اور پوری دنیا میں اپنی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھنا شروع کردیا اور ساتھ ہی اپنی نئی جدوجہد کا آغاز کردیا۔ **اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ یہودیوں کی جدید تاریخ اپنی قدیم تاریخ کو حاصل کرنے کی جدوجہد ہی کا نام ہے تو غلط نہ ہوگا۔** یہودیوں کے ان عقائد کا جدید دنیا کی نئی تشکیل...... جسے 'نیو ولڈ آرڈر' کہا جاتا ہے...... سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے مسلمانوں اور خاص طور پر مجاہدین کے لیے اس کا علم رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ عصرِ حاضر کے جہاد کی فکری بنیادوں کا لازمی جزو ہے۔ تاریخ بہت طویل ہے جس کا پورا احاطہ کرنا ممکن ہے اور نہ ہی مطلوب ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ صرف ان حصوں کا ذکر کیا جائے جن کا تعلق عصرِ حاضر سے ہے اور جن کا جاننا امتِ مسلمہ اور مجاہدین کے لیے ضروری ہے۔

بنی اسرائیل (یہودیوں) کی قدیم تاریخ

'بنی اسرائیل یا یہودیوں کی قدیم تاریخ' آج کی جدید اصطلاح ہے۔ حقیقت میں یہ صرف یہود کی تاریخ نہیں بلکہ اس میں انبیاء علیہم السلام کی تاریخ بھی شامل ہے اور بنی اسرائیل کے ان اہلِ ایمان کی تاریخ بھی جنھوں نے انبیاء علیہم السلام کی پیروی کی اور ان لوگوں کی تاریخ بھی جنھوں نے ان انبیاء کی نافرمانی کی اور بعد میں یہودی بن گئے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا دور: بنی اسرائیل کے کنعان سے مصر منتقل ہونے تک (۲۵۰۰ سے ۱۲۰۰ ق م)

دوسرا دور: خروجِ مصر سے لے کر فلسطین میں آباد کاری تک (۱۲۰۰ ق م سے ۵۸۶ ق م)

تیسرا دور: بخت نصر کا حملہ اور بابل میں پہلی جلاوطنی (۵۸۶ ق م سے ۵۳۹ ق م)

چوتھا دور: بابل سے واپسی سے لے کر دوسری جلاوطنی تک (۵۳۹ ق م سے ۷۰ء)

پہلا دور: بنی اسرائیل کے کنعان سے مصر منتقل ہونے تک (۲۵۰۰ سے ۱۲۰۰ ق م)

حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے اور جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا علاقہ فلسطین میں کنعان کے مقام پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنا نبی بنایا اور ان کو اسرائیل کا لقب عطا کیا جس کا مطلب 'عبداللہ' یا 'اللہ کا بندہ' ہے۔ یہود کے باطل عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ یہ لقب ان کو (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی شکل میں آنے والے ایک فرشتے کو کشتی میں شکست دینے پر ملا تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ (۱۲) بیٹے تھے۔ ان بارہ بیٹوں کی نسل اس قدر پھیلی کہ بارہ قبیلے بن گئے جنھیں قرآن میں 'بنی اسرائیل' کہا گیا ہے۔

جب اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ نے مکہ میں اسلام کی دعوت کا آغاز کیا تو قریشِ مکہ نے اپنا ایک وفد یہودِ خیبر سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے بارے میں دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ خیبر کے یہودیوں نے انھیں کہا کہ اگر آنحضرت ﷺ سچے نبی ہیں تو ان سے پوچھو کہ بنی اسرائیل اپنے اصل وطن کنعان سے مصر کیسے پہنچے؟ جب یہ سوال اللہ کے رسول ﷺ سے کیا گیا تو اس کا جواب آپ ﷺ کے علم میں نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے

حضرت یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ سورۂ یوسف میں ایک ہی نشست میں نازل فرما کر جواب مرحمت فرمادیا۔[5] جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے بغض وحسد کی وجہ سے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے کنویں میں پھینک دیا تو ایک قافلہ انہیں غلام بنا کر مصر لے گیا جہاں انہیں عزیزِ مصر نے خرید لیا۔ عزیز مصر کی بیوی کی سازش سے آپ علیہ السلام جیل میں ڈال دیے گئے۔ اس وقت مصر پر قبطی خاندان کا بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس نے ایک عجیب خواب دیکھا جس کی صحیح تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام کے علاوہ کوئی نہ بتا سکا۔ اس وجہ سے آپ علیہ السلام جیل سے نکل کر بادشاہ کے مقرب بن گئے اور آپ علیہ السلام کو قحط کے زمانے میں وزیرِ خزانہ بنادیا گیا۔ بالآخر یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے حسنِ تدبیر کے بل بوتے پر مصر کے بادشاہ بن گئے۔ آپ علیہ السلام نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سمیت اپنے خاندان والوں کو بشمول گیارہ بھائیوں کے مصر بلالیا، اس طرح بنی اسرائیل مصر میں آباد ہو گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے رحلت فرما جانے کے بعد بنی اسرائیل سات آٹھ سو سال تک مصر کے حکمران رہے۔ اس دوران وہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار رہے، مگر آہستہ آہستہ ان میں برائیاں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ چنانچہ ان سے مصر کی حکمرانی چھن گئی اور وہاں کی مقامی نسل سے فرعونوں کی بادشاہت قائم ہو گئی۔ بنی اسرائیل جو مدت سے مصر کے بادشاہ تھے، اب محکوم اور غلام بن گئے۔ بعض مؤرخین کے مطابق بنی اسرائیل کی غلامی کا یہ دور تقریباً تین سے چار سو سال پر محیط ہے۔ یہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ اس میں فرعونوں نے ان کو ایک غلام کی حیثیت سے رکھا اور ان پر ظلم کرتے رہے، یہاں تک کہ فرعون 'رعمسیس دوم' (Ramses II) کے دور میں اس کے نجومیوں نے اسے بتایا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہو گا جو اس کی حکومت کو ختم کر دے گا۔ 'رعمسیس دوم' وہ فرعون ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بادشاہ تھا۔ اسی فرعون کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے[6]۔ اپنی حکومت بچانے کے لیے فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا

---

[5] سورۂ یوسف کے سببِ نزول کے تحت اکثر مفسرین نے یہود کے سوال کا ذکر کیا ہے، بیشتر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہود نے یوسف علیہ السلام کے قصے کے بارے میں پوچھا تھا، البتہ علامہ بغوی رحمہ اللہ نے بعینہ یہی سوال نقل کیا ہے جو مصنف نے یہاں ذکر کیا ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں: ''وذلک أن الیهود سألوا رسول اللهﷺ عن قصة یوسف وقیل عن سبب إنتقال ولد یعقوب من کنعان إلی مصر فذکر لهم قصة یوسف''۔ دیکھیے معالم التنزیل۔ (م ح)

[6] بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ''رعمسیس دوم'' وہ فرعون تھا جس کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور اسی نے آپ علیہ السلام کو اپنے محل میں پالا تھا، جبکہ وہ فرعون جس کی طرف آپ علیہ السلام مدین سے واپسی پر دین کی دعوت لے کر آئے تھے، وہ رعمسیس دوم کا بیٹا ''منفتاح''

بھی پیدا ہو، اسے قتل کر دیا جائے۔ کچھ عرصہ بعد اس کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ اگر یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو ان کے پاس بنی اسرائیل کی صورت میں غلاموں کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ اس پر فرعون نے حکم دیا کہ ایک سال پیدا ہونے والے تمام بچوں کو قتل کر دیا جائے اور دوسرے سال کے بچوں کو زندہ رکھا جائے۔ سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اسے بنی اسرائیل پر 'بلاء عظیم' کہا ہے، یعنی یہ بنی اسرائیل پر ایک عظیم آزمائش تھی۔[7]

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال کے لڑکوں کو قتل کیا جانا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے انھیں ایک صندوق میں بند کر کے دریائے نیل کی لہروں کے حوالے کر دیا۔ یہ صندوق جب فرعون کے محل کے قریب سے گزرا تو فرعون کی ملکہ حضرت آسیہ (آپ پر سلامتی ہو) نے اسے نکلوا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی محبت ڈال دی اور آپ نے فرعون کی مخالفت کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ یوں اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں پرورش پانے لگے۔[8] یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود

تھا اور وہی آپ علیہ السلام کا پیچھا کرتے ہوئے دریا میں غرق ہوا تھا۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ یہ محض تاریخی تحقیقات ہیں جو یقینی دلائل پر مبنی نہیں اور اس میں قطعی بات نہیں کی جا سکتی کہ قرآن میں مذکور فرعون فلاں تھا۔ البتہ قرآن کے سیاق سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرعون ایک ہی تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کی اور جس کی طرف آپ بعد میں دعوتِ دین لے کر آئے اور اس کتاب کے محترم مصنف کی رائے میں وہ رعمسیس دوم تھا۔ اور بلاشبہ حقیقت کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ (م ح)

[7] ارشادِ باری ہے:

﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾ (البقرۃ: 49)

''اور (اے بنی اسرائیل! یاد کرو) جب ہم نے تمھیں فرعون والوں سے نجات دی تھی، وہ تمھیں بدترین عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔ اور بلاشبہ اس میں تمہارے لیے بڑی آزمائش تھی''۔

[8] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ (٧) فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ (٨) وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ (القصص: 7-8)

نہیں کیونکہ یہ موضوع کا حصہ نہیں ہے، تاہم اتنا جاننا ضروری ہے کہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے نبوت پر فائز ہونے اور ان کی دعوت سے بنی اسرائیل کی تاریخ پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کو نبوت پر فائز کیا اور ان کو فرعون اور بنی اسرائیل کی طرف ہدایت دے کر بھیجا۔ فرعون نے آپ عَلَیْہِ السَّلَام کی تکذیب کی اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلے اور صحرائے سینا کی طرف چل دیے۔ صحرائے سینا مصر اور فلسطین کے درمیان ایک سو میل لمبا صحرا ہے۔ جب حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام بنی اسرائیل کے ساتھ بحرِ احمر (Red Sea) کے کنارے اس جگہ پہنچے جسے آج 'خلیجِ سویز' (Gulf of Suez) کہا جاتا ہے تو فرعون اپنے لشکر سمیت آپ عَلَیْہِ السَّلَام کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے اپنا عصاء سمندر میں مارا جس سے اس میں راستہ بن گیا۔ بنی اسرائیل اس راستے سے سمندر کو عبور کر کے صحرائے سیناء میں پہنچ گئے۔ جب فرعون اور اس کے لشکر نے اس سمندر کو عبور کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو غرق کر دیا۔ یوں بنی اسرائیل پر فرعون کی غلامی کا دور ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بنی اسرائیل کو اپنا یہ احسان یاد دلایا ہے[9]۔ آج بھی بنی اسرائیل کے عقائد اور تاریخ میں اس دن کو ...... جس دن وہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی قیادت میں مصر سے نکلے اور فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کی...... اور اس پورے سفر کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہودی آج بھی اس دن کو 'یومِ کپور' (Yom Kippur) کے نام سے مناتے ہیں اور یہ ان کے نئے سال کا آغاز بھی ہے۔ پھر ان کی تاریخ میں حضرت یعقوب عَلَیْہِ السَّلَام کا کنعان (فلسطین)

''اور ہم نے حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی والدہ کو الہام کیا کہ تم انھیں دودھ پلاؤ، پھر جب ان کے بارے میں خوف محسوس ہو تو انھیں (صندوق میں بند کر کے دریا کے) پانی میں بہا دو، اس پر نہ خوف کھاؤ اور نہ غمگیں ہو، بلاشبہ ہم انھیں تمہارے پاس واپس لوٹا دیں گے اور انھیں رسولوں میں سے بنائیں گے۔ پس فرعون کے خاندان والوں نے (دریا سے) انھیں اٹھالیا، تاکہ وہ انھی کے حق میں بربادی اور تباہی کا سامان ثابت ہوں۔ بے شک فرعون، ہامان اور ان کے لشکر غلط کار تھے۔ اور فرعون کی بیوی (حضرت آسیہ) نے (فرعون سے) کہا: یہ بچہ تو میرے اور تمہارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، مبادا کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں، اور وہ (ایسا کرتے ہوئے حقیقتِ حال سے) ناواقف تھے''۔

[9] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ﴾ (البقرۃ: 50)

''اور (یاد کرواے بنی اسرائیل!) جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو دولخت کر دیا تھا، پھر ہم نے تمہیں نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے''۔

سے نکل کر مصر آنا اور پھر حضرت موسیٰ عَلَیہِ السّلام کی قیادت میں مصر سے نکل کر واپس فلسطین کا سفر شروع کرنا ایک دینی اہمیت رکھتا اور دورِ جدید میں یہودی عراق، مصر اور فلسطین کو اپنے عقیدہ 'الارض الموعودہ' میں شامل کرتے ہیں جس کا ذکر ہم آگے کریں گے ان شاءاللہ۔

دوسرا دور: خروجِ مصر سے لے کر فلسطین میں آبادکاری تک

(۱۲۰۰ق م سے ۵۸۶ق م)

حضرت موسیٰ عَلَیہِ السّلام سے حضرت سلیمان عَلَیہِ السّلام تک کا دور یہودیوں کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان کو فرعون کی غلامی سے نجات دی بلکہ ان کی ہدایت کے لیے تورات کی شکل میں مکمل شریعت عطا فرمائی، فلسطین اور ارضِ مقدس یروشلم کا قبضہ عطا فرمایا اور ان کو زمین میں ایک دفعہ پھر حکمرانی دی۔ اس دور میں یہ صحرائے سینا سے نکلے اور فلسطین میں باقاعدہ حکومت کا آغاز کیا۔ اس دور کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ سینا میں صحرانوردی، دوسرا یروشلم کی فتح اور تیسرا بنی اسرائیل میں خلافت کا قیام ہے۔ ہم ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ عَلَیہِ السّلام کی قیادت میں فرعون کی غلامی سے نکل کر صحرائے سینا میں آ گئے تھے۔ صحرائے سینا میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ عَلَیہِ السّلام کو کوہِ طور پر چالیس دنوں کا روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ چالیس دن پورے ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے اور آپ عَلَیہِ السّلام کو تورات عطا فرمائی۔ یہ ایک مکمل شریعت تھی۔ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ عَلَیہِ السّلام کا لقب 'کلیم اللہ' ہے۔ جن دنوں حضرت موسیٰ عَلَیہِ السّلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو رہے تھے اور اللہ انھیں تورات عطا فرما رہے تھے، ان کے پیچھے بنی اسرائیل کو سامری نے گمراہ کر دیا اور وہ بچھڑے کی پوجا کرنے لگے[10]۔ حضرت موسیٰ عَلَیہِ السّلام نے واپس آ کر اس فتنے کا خاتمہ کیا۔

[10] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَى أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ﴾ (البقرۃ: 51)

''اور (اے بنی اسرائیل!) جب ہم نے موسیٰ عَلَیہِ السّلام سے چالیس دن کا وعدہ کیا تھا، ان کے پیچھے تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا تھا اور تم ظلم کرنے والے تھے''۔

صحرائے سینا میں ہی میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے بارہ چشمے جاری کیے اور ان کے لیے آسمان سے من وسلویٰ اتارا۔ بنی اسرائیل نے اس تیار کھانے پر قناعت نہیں کی بلکہ اللہ سے مختلف کھانوں کی فرمائش بھی کی اور اللہ نے انھیں وہ سب کچھ بھی عطا فرمادیا۔ صحرائے سینا کی ہی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو جہاد کا حکم دیتے ہوئے ارضِ مقدس فلسطین پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ علماء فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل فرعون کی غلامی کی وجہ سے ذہنی طور پر اس قدر پست اور کم ہمت ہو چکے تھے کہ انھوں نے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بہانے تراشنا شروع کر دیے کہ اے موسیٰ! وہاں تو ایک جابر قوم رہتی ہے جس کے ساتھ لڑنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ پوری قومِ بنی اسرائیل میں سے صرف دو شخص ایسے نکلے جنھوں نے اللہ کے حکم پر لبیک کہا[11]۔ تفاسیر میں ان دونوں اشخاص کا نام حضرت یوشع بن نون علیہ السلام اور کالب بن یوفنا آیا ہے[12]۔ یہ دونوں بنی اسرائیل کے بارہ نقباء میں سے تھے، جبکہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام حضرت موسی علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے نبی بھی مقرر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کم ہمتی کی وجہ سے سزا کے طور پہ بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں چالیس سال بھٹکائے رکھا[13] جس کے دوران ان کی نئی نسل تیار ہوئی جو فرعون کی غلامی سے آزاد تھی۔ صحرائے سینا میں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی رحلت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو نبی مقرر کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ارضِ فلسطین میں جہاد کریں۔ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پوری سرزمینِ فلسطین فتح کرلی مگر بیت المقدس (یروشلم) کی فتح سے پہلے ہی آپ علیہ السلام کی وفات ہوگئی۔ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے بعد کچھ عرصہ بنی اسرائیل اور فلسطین کے عمالقہ کے درمیان جنگیں چلتی رہیں، یہاں تک کہ حضرت سموئیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا نبی مقرر فرمایا۔ آپ علیہ السلام کے دور میں یروشلم کا بادشاہ 'جالوت' تھا جس نے بنی اسرائیل کے علاقوں پر قبضہ کر کے وہاں قتل وغارت برپا کر رکھا تھا۔

---

[11] اس واقعے کا ذکر سورۂ مائدۃ کی آیات ۲۰ تا ۲۳ میں بیان ہوا ہے۔

[12] ملاحظہ ہو تفسیرِ طبری، زاد المسیر، تفسیر ابن کثیر وغیرہ۔ حضرت کالب کا نام بعض روایات میں کلب اور کالوب بھی آیا ہے۔

[13] ارشادِ بار تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾ (المائدۃ: 26)

''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: پس یہ (ارضِ مقدس فلسطین) ان پر چالیس سال تک حرام ہے، یہ لوگ یونہی زمین میں بھٹکتے رہیں گے۔ پس فاسقوں پر کوئی افسوس نہ کرے''۔

بنی اسرائیل نے اللہ کے نبی حضرت سموئیل عَلَیہِ السّلام سے جالوت کے ظلم کی شکایت کی اور اپنے لیے ایک سپہ سالار مقرر کرنے کا مطالبہ کیا جو جالوت کے ظلم کے خلاف جہاد کرے۔ قوم کے اس مطالبے پر حضرت سموئیل عَلَیہِ السّلام نے اللہ کے حکم سے طالوت علیہ السلام کو بادشاہ مقرر کیا اور ان کی قیادت میں بنی اسرائیل کو یروشلم فتح کرنے کے لیے جہاد کا حکم دیا۔ طالوت چونکہ غریب سقہ تھے اور قوم کے کمزور افراد میں سے تھے، اس لیے بنی اسرائیل کے سرادروں نے ان کی امارت پر بہت اعتراض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعے بنی اسرائیل پر یہ واضح کیا کہ طالوت کو ان کا سردار مقرر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی قوم میں سے علم اور جسمانی قوت میں سب سے بہتر ہیں۔ مگر بنی اسرائیل کو پھر بھی اعتراض رہا، اس لیے انھوں نے اپنے دل کی تسلی کے لیے حضرت سموئیل عَلَیہِ السّلام سے ان کی امارت کی سچائی کی نشانیاں مانگنا شروع کر دیں۔ حضرت سموئیل عَلَیہِ السّلام نے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کا چھنا ہوا ''صندوقِ سکینت'' اپنے معجزے سے لوٹا دیا جس میں تورات اور حضرت موسیٰ عَلَیہِ السّلام کی کچھ اشیاء تھیں اور بنی اسرائیل اس کو بہت مقدس سمجھتے تھے۔ اس طرح بمشکل بنی اسرائیل حضرت طالوت کی قیادت میں جہاد کے لیے تیار ہوئے۔ اس واقعے کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں دوسرے پارے کے آخر میں بیان فرمائی ہے۔[14]

طالوت کی قیادت میں مسلمانوں کا یہ لشکر جب جالوت سے جہاد کرنے کے لیے روانہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس لشکرِ جہاد کو ایک عجیب آزمائش میں ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سموئیل عَلَیہِ السّلام کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ اس لشکر کے راستے میں جو نہر آئے گی، اس سے کوئی بھی پانی نہ پیے اور اگر پینا بھی ہو تو صرف چلو بھر پی سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ لشکر نہر پر پہنچا تو سوائے تین سو تیرہ کے سب نے چلو بھر سے زیادہ پانی پیا۔ پس جو بھی زیادہ پانی پیتا گیا، اس کی جہاد کرنے کی ہمت جواب دیتی گئی اور وہ پیچھے رہ گیا۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صرف اصحابِ بدر جتنے یعنی تین سو تیرہ لوگ رہ گئے[15]۔ اللہ تعالیٰ نے صرف سچے مجاہدین کی مدد فرمائی اور جالوت کے لشکر کو شکست ہوئی۔ انھی مجاہدین میں حضرت داؤد عَلَیہِ السّلام بھی تھے جنھوں نے جالوت کو قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کے بعد آپ عَلَیہِ السّلام کو نہ صرف بادشاہت دی بلکہ نبی بھی مقرر فرمایا اور پھر آپ عَلَیہِ السّلام کے بعد آپ کے بیٹے حضرت سلیمان عَلَیہِ السّلام کو ایک عظیم حکومت اور بادشاہت سے نوازا۔ یہ حضرت سلیمان عَلَیہِ السّلام ہی

---

[14] سورۂ بقرۃ کی آیات ۲۴۶ تا ۲۵۲ کی طرف اشارہ ہے۔

[15] صحیح البخاري؛ کتاب المغازي، باب عدۃ أصحاب بدر

کی بادشاہت ہے جس کے تصور میں آج کے دورِ حاضر کے یہودی ایک عالمگیر حکومت بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

بنی اسرائیل حضرت یوسف عَلَیہِ السَّلام کے زمانے میں کنعان سے نکلے اور مصر کے بادشاہ بنے، پھر فرعونوں کے غلام بنے۔ حضرت موسیٰ عَلَیہِ السَّلام کے دور میں فرعون کی غلامی سے نکلے اور سینا میں آ گئے۔ حضرت یوشع بن نون عَلَیہِ السَّلام کی قیادت میں انھوں نے ارضِ مقدس فلسطین کو فتح کیا اور حضرت طالوت کی قیادت میں یروشلم فتح کیا۔ حضرت داؤد عَلَیہِ السَّلام کی قیادت میں پورے فلسطین کے بادشاہ بن گئے اور حضرت سلیمان عَلَیہِ السَّلام کے دور میں ان کو وہ عالمگیر حکومت ملی کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کسی کو نہ ملی۔ حضرت سلیمان عَلَیہِ السَّلام کے دور میں ہی مسجدِ اقصیٰ کی تعمیرِ نو اور توسیع ہوئی تھی۔ آج کی جدید دنیا میں یہودی حضرت سلیمان عَلَیہِ السَّلام کے دور کی حکومت کی طرح اپنی عالمگیر حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس دور میں جو مسجدِ اقصیٰ تعمیر ہوئی تھی، اسے آج یہودی اپنی قربان گاہ 'ہیکلِ سلیمانی' کی جگہ پر واقع قرار دیتے ہیں۔ اس کا ذکر ہم قدرے تفصیل کے ساتھ آئندہ کریں گے ان شاءاللہ۔

تیسرا دور: بخت نصر کا حملہ اور بابل میں پہلی جلاوطنی (۵۸۶ ق م سے ۵۳۹ ق م)

حضرت داؤد عَلَیہِ السَّلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کے بیٹے حضرت سلیمان عَلَیہِ السَّلام کو بھی بادشاہت کے ساتھ نبوت بھی عطا کی۔ آپ عَلَیہِ السَّلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی دانائی دی جو پہلے کسی کو عطا نہ کی تھی۔ بنی اسرائیل کے مطابق آپ نے دار الحکومت 'یروشلم' میں ایک عظیم عبادت گاہ تعمیر کی تھی۔ اس عبادت گاہ کی تعمیر کے سلسلہ میں یہودیوں اور مسلمانوں میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت سلیمان عَلَیہِ السَّلام نے مسجدِ اقصیٰ کی توسیع کی تھی جبکہ سب سے پہلے مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ دونوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتوں نے تعمیر کیا تھا۔ پہلی مسجد جو تعمیر ہوئی وہ مسجدِ حرام یعنی کعبہ ہے، اسی لیے قرآنِ مجید میں اس کو ''بیت العتیق''، یعنی قدیم گھر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس دنیا میں دوسری مسجد 'مسجدِ اقصیٰ' تعمیر ہوئی ہے۔ مسجدِ اقصیٰ مسجدِ حرام کے چالیس سال بعد تعمیر ہوئی۔ یہ دونوں مسجدیں حضرت آدم عَلَیہِ السَّلام کے دور سے قائم ہیں اور شعائر اللہ یعنی اللہ کی نشانیاں ہیں۔ بعد میں یہ دونوں طوفانِ نوح میں تباہ ہو گئی تھیں۔ پھر مسجدِ حرام کو حضرت ابراہیم عَلَیہِ السَّلام اور حضرت اسمٰعیل عَلَیہِ السَّلام نے دوبارہ تعمیر کیا جبکہ مسجدِ اقصیٰ کو حضرت یعقوب عَلَیہِ السَّلام نے تعمیر کیا اور حضرت داؤد عَلَیہِ السَّلام نے اسے وسعت دی تھی، اور اس کی سب سے بڑی توسیع حضرت سلیمان عَلَیہِ السَّلام نے جنوں کی مدد سے کی تھی۔

یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجدِ اقصیٰ نہیں بلکہ ایک عبادت گاہ تعمیر کی تھی جسے وہ 'ہیکلِ سلیمانی' کہتے ہیں۔ اس عبادت گاہ میں یہودیوں کی ایک قربان گاہ تھی۔ اس قربان گاہ میں یہودی اپنی قربانیاں اللہ کے حضور پیش کرتے تھے۔ یہود کے مطابق تاریخ میں ہیکلِ سلیمانی دو دفعہ تباہ ہوا۔ سب سے پہلے بابل کے باشاہ بخت نصر کے دور میں اور بعد ازاں ۷۰ء میں روم کے بادشاہ 'ٹائیٹس' کے حملوں میں یہ ہیکل مکمل تباہ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اب مسجدِ اقصیٰ کو گرا کر اس کی جگہ ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرایا جائے گا۔ اس کے برعکس مسلمان کہتے ہیں کہ ان حملوں میں مسجدِ اقصیٰ تباہ ہوئی تھی جسے بعد میں تعمیر کرالیا گیا اور آج بھی مسجدِ اقصیٰ اسی جگہ موجود ہے جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے قبیلے بنی یہودہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ علیہ السلام کے انتقال کے بعد آپ کے قبیلے یہودہ نے حکومت پر قبضہ کر لیا تو باقی قبائل نے بغاوت کردی۔ اس طرح سرزمینِ فلسطین دو سلطنتوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک کا نام اس قبیلے کی نسبت سے 'یہودہ' (Judah) پڑ گیا جو جنوب میں واقع تھا اور دوسری سلطنت 'سماریہ' یا 'اسرائیل' (Israel) کے نام سے شمال کی طرف لبنان میں واقع تھی۔ آنے والے سالوں میں بنی یہودہ نے سلطنتِ اسرائیل پر قبضہ کر کے تمام فلسطین پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور یوں بنی اسرائیل کا نام 'یہودی' پڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے تواتر سے انبیاء مبعوث فرماتے رہے اور ان کے بادشاہ انبیاء کی ہدایت کے مطابق امورِ سلطنت چلاتے رہے۔ آہستہ آہستہ بنی اسرائیل میں گمراہی بڑھنا شروع ہوئی حتیٰ کہ دینی طبقوں میں بھی علمائے سو پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ لوگ ان گمراہ علماء کی باتوں میں آکر سچے انبیاء کی تکذیب کرنے لگے اور...... جیسا کہ قرآن میں ذکر ہوا...... نوبت انبیاء اور علمائے حق کو قتل کرنے اور اللہ کی کتاب میں تحریفات کرنے تک پہنچ گئی۔ اس حال میں اللہ تعالیٰ نے ایک نبی جن کا نام حضرت ارمیاہ علیہ السلام بتایا جاتا ہے، کو مبعوث فرمایا۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو اللہ کی وعید سنائی کہ اگر وہ یہ فساد ختم نہ کریں گے تو اللہ ان پر ایک ظالم بادشاہ مسلط کردے گا جو ان کے گھروں میں گھس جائے گا اور انھیں غلام بنا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی کی بات نہ مانی تو اللہ تعالیٰ نے بابل (موجودہ عراق) میں بسنے والے آشوریوں (Assyrians) کے بادشاہ 'بخت نصر' (Nebuchadnezzar II) کو ان پر مسلط کر دیا۔ بخت نصر نے لاکھوں اسرائیلیوں کو قتل کیا اور لاکھوں کو غلام بنا کر عراق لے گیا جبکہ ہیکلِ سلیمانی سمیت بیت المقدس کی

اینٹ سے اینٹ بجادی۔ سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیات بنی اسرائیل پر نازل ہونے والے جن دو فسادوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اکثر مفسرین اس واقعہ کو ان دونوں میں سے پہلا قرار دیتے ہیں[16]۔

چوتھا دور: بابل سے واپسی اور دوسری جلاوطنی (۵۳۹ ق م سے ۷۰ء)

بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ میں حضرت ارمیاء عَلَیہِ السَّلام کے زمانے سے لے کر حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کے زمانے تک کا دور انتہائی اہم ہے۔ اس دور کے اثرات آج کی جدید دنیا میں بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس دور میں ......جو چھٹی صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے...... بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ یہودی روایات کے مطابق بخت نصر نے ہیکلِ سلیمانی کو تباہ کر دیا اور بنی اسرائیل کو غلام بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہودی تاریخ میں اس دور کو ''اسیریٔ بابل'' (Babylonian Captivity) کا دور کہا جاتا ہے۔ بخت نصر کی غلامی میں کچھ قبیلے بابل اور موجودہ ایران میں آباد ہوئے اور کچھ مدینہ اور خیبر کی طرف بھاگ نکلے۔ مگر زیادہ تر عراق میں ہی رہے۔ اسیریٔ بابل کے اس زمانے میں بنی اسرائیل میں بہت سی گمراہیوں نے جنم لیا جنھوں نے آگے چل کر بنی اسرائیل کو مسلمان سے یہودی بنا دیا۔ یہودیوں کی تاریخ کے مطابق یروشلم کی اس تباہی سے تورات کے تمام نسخے ضائع ہو گئے تو اسی دور میں حضرت عزیر عَلَیہِ السَّلام نے گم شدہ تورات کو دوبارہ جمع کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور تمام تورات کو از سر نو مرتب کر دیا، جس کی وجہ سے بعض یہودیوں نے فرطِ عقیدت میں انھیں ''ابن اللہ''، یعنی اللہ کا بیٹا قرار دیا۔ دوسری بڑی دینی تبدیلی جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوئی، وہ اس دور میں علمائے سوء کی من گھڑت تشریحات پر مبنی کتاب 'تلمود' (Talmud) کی تدوین تھی۔ علمائے سوء نے تلمود کو زبانی علمِ وحی اور دین کا ماخذ قرار دے دیا۔ ان علماء کے مطابق یہ وہ علمِ وحی تھا جو اللہ نے بنی اسرائیل کے دس بزرگوں کو اس وقت عطا کیا جب وہ رویتِ باری تعالیٰ کے لیے حضرت موسیٰ عَلَیہِ السَّلام کے ساتھ

---

[16] قرآنِ مجید میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۴تا۷ میں ان دو فتنوں کا ذکر موجود ہے، تاہم نہ قرآنِ مجید میں ان دونوں فتنوں کی تفصیل موجود ہے اور نہ احادیثِ مبارکہ میں مذکور ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اقوال میں ان کی تعیین ملتی ہے، لیکن اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے 'جالوت' کے حملے کو پہلا فتنہ کہا ہے، بعض نے بابل کے بادشاہ 'سنحاریب' کا ذکر کیا ہے اور بعض نے، جن میں ابن اسحاق رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، 'بخت نصر' (عربی لفظ بُخْتُنَصَّرْ) کے حملے کو پہلا فتنہ گردانا ہے اور ابن اسحاق رحمہ اللہ کی روایت کو ہی صاحبِ کتاب نے بنیاد بنایا ہے۔ پھر بعض نے بخت نصر کے حملے کو دوسرا فتنہ بھی کہا ہے۔(تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیرِ طبری) حاصل یہ ہے کہ اس میں حتمی اور قطعی بات کہنا ناممکن ہے، البتہ مفسرین کی بیان کردہ روایات، دیگر اسرائیلیات اور مرتبہ تاریخِ عالم کا مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ پہلے فتنے سے مراد بخت نصر کا حملہ ہے۔(م ح)

کوہِ طور پر گئے تھے۔ یہ زبانی وحی کا علم تھا جو سینہ بہ سینہ ان بزرگوں کے خاندان میں منتقل ہو رہا تھا۔ اسیری بابل کے دور میں اس کا لکھا جانا اس لیے ضروری ہو گیا کہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ تلمود کو علمِ وحی ماننے اور اس کی تدوین کرنے والے علماء 'فریسی' (Pharisee) کہلائے اور یوں 'یہودیت' میں ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا جو 'فریسی' (Pharisees) کہلایا۔ اسی فرقے نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی۔[17]

اسیری بابل کے دوران ہی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں ایک نبی کو مبعوث فرمایا جنھیں یہودی حضرت دانیال علیہ السلام کے نام سے جانتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے آپ علیہ السلام سے التجا کی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بخت نصر کی اس غلامی سے نجات کی دعا فرمائیں اور اللہ سے التجاء کریں کہ بنی اسرائیل کو واپس ارضِ مقدس جانے کی اجازت مل جائے تاکہ وہ ہیکلِ سلیمانی تعمیر کر کے اللہ کی عبادت کر سکیں اور انھیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی طرح کا عروج حاصل ہو۔ یہودی روایات کے مطابق حضرت دانیال علیہ السلام نے ان کے لیے اللہ سے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں خواب میں بشارت دکھا دی۔ اس خواب کی تعبیر ان کے مطابق یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک بادشاہ کے ذریعے بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلوائے گا جو انھیں واپس ارضِ مقدس بھیج دے گا اور بعد ازاں ''مسیحِ موعود'' کے ہاتھوں انھیں عروج ملے گا۔ تاہم یہ واپسی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور 'مسیح اللہ' کی اطاعت سے مشروط تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فارس کے بادشاہ 'خسرو دوم' (Cyrus) نے بابل پر حملہ کر کے آشوریوں کی حکومت ختم کر دی اور بنی اسرائیل کو نہ صرف آزاد کیا بلکہ ارضِ مقدس واپس جانے کی اجازت بھی دے دی۔ مزید یہ کہ وہ تمام مقدس مال جو بخت نصر ہیکل سے لے کر آیا تھا، واپس کر دیا اور ہیکل کی تعمیر میں مالی امداد بھی فراہم کی۔ بعض محققین نے اسی بادشاہ کو قرآنِ مجید میں مذکور 'ذوالقرنین' کہا ہے[18]۔ اس طرح

---

[17] یہی وجہ ہے کہ عہد نامہ جدید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی فریسیوں کی برائی بیان کی گئی ہے۔ لیکن آج کے صلیبیوں نے...... جن میں اکثریت پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی ہے......ان فریسیوں کی بھی دو قسمیں اپنی طرف سے گھڑ دی ہیں؛ ایک اچھے اور دوسرے برے، تاکہ اس تقسیم سے یہود کو تحفظ فراہم کیا جا سکے۔ (م ح)

[18] قرآنِ مجید میں 'ذوالقرنین' کے ذکر میں محض اس کی نیکی اور اس کی مہمات کا تذکرہ ہے، تفصیل نہیں ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کی بابت تفصیل نہیں بیان کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں قطعی علم کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، محض گمان کی حد تک بات کی جا سکتی ہے۔ تاریخ اور اسرائیلیات کا علم رکھنے والے صحابہؓ و تابعین میں بھی بادشاہ ذوالقرنین کی تعیین میں اختلاف تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ عبداللہ بن ضحاک بن معد تھا، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کا نام اسکندر روس رومی تھا، ابن اسحاقؒ نے کہا کہ وہ مرزبان بن مردبۃ یونانی تھا، وھبؒ بن منبہ اور ابن ھشامؒ نے کہا کہ وہ اسکندر مقدونی تھا۔ بعد میں زیادہ تر لوگوں نے اسے اسکندر مقدونی (اسکندرِ اعظم) ہی سمجھا۔ (یہ بات قبول کرنا اس لیے مشکل ہے کہ اسکندر مقدونی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مشرک تھا، گو علامہ آلوسیؒ نے اپنی تفسیر میں اس

دعائے دانیال کی پہلی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوگئی۔ اب دوسری پیشین گوئی کا انتظار تھا، وہ تھی 'مسیح اللہ' کی آمد جس نے بنی اسرائیل کو حضرت سلیمان عَلَیہِ السَّلَام کے زمانے کا عروج دلانا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی طرف حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلَام کو نبی اور مسیح اللہ بنا کر بھیجا، مگر بنی اسرائیل نے ان کی تکذیب کی اور اس تکذیب میں فریسی علماء سب سے آگے تھے۔ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلَام کی ولادت اور ان کی نبوت کے واقعات قرآنِ مجید میں اللہ نے تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ یہاں تمام تفصیل کا موقع نہیں ہے مگر ہم اس کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلَام کی والدہ کا نام حضرت مریم علیہا السلام ہے۔ اور حضرت مریم کے والد کا نام قرآن میں عمران آیا ہے۔ عمران کی اہلیہ یعنی حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے اللہ تعالیٰ سے منت مانی کہ اگر ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اس کو اللہ کی راہ میں وقف کر دیں گی جو کہ اس دور کا دستور تھا۔ مگر ان کے ہاں مریم یعنی بیٹی پیدا ہوگئی۔ امِ مریم نے منت کے مطابق اپنی بیٹی حضرت مریم علیہا السلام کو راہبہ بنا نے کے لیے حضرت زکریا عَلَیہِ السَّلَام ......جو اس زمانے میں بنی اسرائیل کے نبی تھے...... کے سپرد کر دیا۔ ایک دفعہ جب حضرت زکریا عَلَیہِ السَّلَام حضرت مریم علیہا السلام کے حجرے میں تشریف لائے تو انھوں نے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم پھل دیکھے۔ آپ عَلَیہِ السَّلَام بہت حیران ہوئے اور دریافت فرمایا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ حضرت مریم علیہا السلام نے کہا کہ یہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ اس پر حضرت زکریا عَلَیہِ السَّلَام نے ......جو اس وقت تک بے اولاد تھے...... اللہ سے اولاد کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حضرت یحییٰ عَلَیہِ السَّلَام کی پیدائش کی خوشخبری دی۔ حضرت یحییٰ عَلَیہِ السَّلَام حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلَام کے خالہ زاد بھائی تھے۔

حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلَام کی ولادت حضرت یحییٰ عَلَیہِ السَّلَام سے کچھ عرصہ بعد ہوئی تھی۔ آپ عَلَیہِ السَّلَام کی ولادت اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ولادت کو قرآن میں حضرت آدم عَلَیہِ السَّلَام کی ولادت سے تشبیہ دی ہے[19]۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم عَلَیہِ السَّلَام کو مٹی سے پیدا کیا اور 'کن' کہا تو آپ کی تخلیق ہوگئی۔ حضرت

کا دفاع کرتے ہوئے اس بات کو رد کیا ہے۔) اب جدید تحقیق یہ سامنے آئی ہے کہ بادشاہ ذوالقرنین فارس و روم کا حاکم خسرو دوم یعنی Cyrus the Great تھا۔ (عربی زبان میں اسے 'کورش' یا 'کیرش' کہا گیا ہے جو اصلاً عبرانی زبان کا لفظ ہے۔) وہ نیکی میں بھی مشہور تھا اور اس نے روم وفارس کی دو عظیم سلطنتوں پر بھی حکومت کی۔ روایات میں آتا ہے کہ اس نے حضرت دانیال عَلَیہِ السَّلَام کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا اور انھی کے توسط سے بنی اسرائیل کو واپس فلسطین جانے کی اجازت دی تھی۔ یہ تحقیق مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر 'ترجمان القرآن' میں ذکر کی ہے، اور صاحبِ کتاب نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ (م ح)

[19] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق بھی کلمہ 'کن' سے ہوئی، اس لیے آپ علیہ السلام کو 'کلمۃ اللہ' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو 'روح اللہ' اور 'مسیح' بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور آپ نے پنگھوڑے ہی میں لوگوں سے کلام کیا۔ جب بڑے ہوئے تو اللہ نے آپ علیہ السلام کو مردوں کو زندہ کرنے، کوڑھی اور مادر زاد اندھے کو درست کرنے کا معجزہ عطا فرمایا۔ اللہ نے قرآن میں آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہہ کر یاد کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اپنے اپنے علاقوں میں اسلام کی دعوت کا آغاز کیا۔

جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں دعوت کا آغاز کیا، اس وقت بنی اسرائیل **پانچ قسم** کے فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں **پہلا فرقہ** ''فریسی فرقہ'' کہلاتا تھا۔ یہ فرقہ 'تلمود' کو علمِ وحی اور علماء کے اقوال کو انبیاء کے اقوال کے برابر حجت مانتا تھا۔ فریسی فرقے کا عقیدہ یہ تھا کہ بخت نصر کے حملے سے پہلے کے انبیاء کے اقوال تو حجت ہیں مگر اس کے بعد کے انبیاء کے اقوال حجت نہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ انبیاء کے ہوتے ہوئے بھی علماء کی تقلید ہر حال میں ضروری ہے اور اگر کوئی عالم تمہارے دائیں ہاتھ کو بایاں ہاتھ قرار دے دے تو اس کی بات کو مان لو اور اس سے بحث نہ کرو[20]۔ اس فرقے کے عروج کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ وقت کے حکمرانوں کے مخالف نہیں چلتے تھے۔ ان کے علماء عموماً حکمرانوں کے حق میں فتوے دیتے تھے۔ فریسی فرقے کے لوگ مسیح اللہ کے منتظر تھے مگر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو نبی اور مسیح کہا تو اس فرقے نے آپ علیہ السلام کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مسیحا داؤد علیہ السلام کی نسل سے ہوگا۔ یہی وہ فرقہ ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی اور آپ علیہ السلام کے قتل کی سازش بھی اسی فرقے کے علماء نے تیار کی تھی۔ اس مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی بنیاد 'تلمود' کی مخالفت اور فریسی علماء کے رد پر مبنی تھی۔

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ (ال عمران: 59)

''بلاشبہ اللہ تعالی کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال حضرت آدم علیہ السلام ہی کی طرح ہے، اس نے آپ کو مٹی سے پیدا کیا، پھر فرمایا 'کن' (یعنی ہو جا) تو (پیدائش) ہو گئی''۔

[20] یہ سب بنی اسرائیل کے وہ علمائے سو تھے جن کی پیروی میں بنی اسرائیل والوں نے انبیاء کی تکذیب کی اور انھیں قتل تک کیا۔ یہاں عام قاری امتِ محمدیہ کے علماء کی اتباع کو اس پر قیاس نہ کرے کیونکہ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی رحلت کے بعد علمائے حق ہی نے نبوی وراثت کو سنبھال رکھا ہے اور انھی کی محنتوں کی بدولت آج دین محفوظ ہے۔ اللہ تعالی کی کروڑ ہا رحمتیں ہوں ان پر۔ البتہ امتِ محمدیہ میں بھی جو بعض علمائے سو گمراہیاں پھیلا رہے ہیں، یقیناً وہ بنی اسرائیل کے انھی علمائے سو کی پیروی کر رہے ہیں، اعاذنا اللہ من ذلک! (م ح)

دوسرا بڑا فرقہ ''صدوقی'' (Sadducees) کہلاتا تھا۔ یہ ایک لادین قسم کا فرقہ تھا جو جزاء اور سزاء کو اس دنیا کے ساتھ مقید کرتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ آپ جو کچھ بھی نیک یا بد عمل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس دنیا میں ہی اجر دے دیتا ہے۔ یہ فرقہ تلمود کو علمِ وحی نہ مانتا تھا اور اسکی تقدیس بھی ان کے نزدیک لازم نہیں تھی۔ یہ فرقہ 'عقیدۂ مسیح' کو بھی نہیں مانتا تھا۔ ابتداء میں تلمود مخالفت کی وجہ سے یہ لوگ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کی دعوت کے قریب ہو گئے مگر بعد میں اپنے بعض عقائد کی وجہ سے مخالف ہو گئے۔۔ **تیسرا فرقہ** ''کاتبین'' کا تھا ان کا کام تورات اور تلمود کی کتابت تھا۔ یہ لوگ بنی اسرائیل میں بہت معزز سمجھے جاتے تھے جس کی وجہ سے وقت کے بادشاہ بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ بنی اسرائیل کا پڑھا لکھا طبقہ تھا۔ ان لوگوں نے بھی حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کا ساتھ نہ دیا۔ **چوتھا فرقہ** (Zealots) شدت پسندوں پر مشتمل تھا۔ یہ عقائد میں فریسیوں سے ملتے جلتے تھے مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حکومت صرف اللہ کا حق ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی بھی حکومت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ لوگ مسیحا کے انتظار میں ضرور تھے مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیحا کے انتظار میں بیٹھ نہیں رہنا چاہیے بلکہ اللہ کی حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ اسی فرقے نے ٦٦ء میں رومیوں کے خلاف تحریک شروع کی تھی، جس کے ردِ عمل میں رومیوں نے ٧٠ء میں یروشلم پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور یہودیوں کو وہاں سے ایسا نکالا کہ وہ بیسویں صدی سے پہلے وہاں واپس نہ جا سکے۔ اس فرقے نے حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کی مخالفت اس بنا پر کی کہ وہ اس فرقے کے مطابق رومی حکومت کے بارے میں نرم موقف رکھتے تھے۔ بنی اسرائیل کا **پانچواں فرقہ** ''ایسینی فرقہ'' (Essenes) کہلاتا تھا ۔ یہ لوگ صوفیوں کی طرح رہتے تھے۔ ان کا نظام بہت منظم تھا۔ یہ عبادت کے پابند، خدمتِ خلق کے لیے پیش پیش اور بہت زیادہ مہمان نواز تھے۔ ان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اس فرقے کے لوگوں نے سب سے زیادہ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کی دعوت قبول کی اور ان کا ساتھ دیا۔

جب حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام نے بنی اسرائیل میں تبلیغ کا آغاز کیا تو ان دنوں دنیا میں رومی مشرک قابض تھے۔ فلسطین بھی سلطنتِ روم کا باجگزار صوبہ بن چکا تھا جس کے بادشاہ رسماً یہودی تھے مگر عملاً حکومت رومیوں کی تھی۔ فریسی فرقے کے علمائے سوء کے اکسانے پر اور سیاسی افراتفری کے ڈر سے رومی حکومت حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کی جان کے درپے ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کو ان کے اٹھائے جانے کی خبر دے چکے تھے۔ آخر کار جب رومی ان کی قیام گاہ کے قریب پہنچے تو اللہ رب العزت نے حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کے ایک حواری (یعنی حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کے ساتھی) کو ان کا شبیہ بنا دیا جسے رومیوں نے پکڑ کر صلیب پر چڑھا دیا۔ ایک روایت کے

مطابق یہ وہ حواری تھا جو آخرت کے عوض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ قربانی دینے پر تیار تھا اور دوسری روایت کے مطابق یہ وہ تھا جس نے دنیا کے عوض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخبری کی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا اور ان کی جگہ رومیوں نے آپ کے شبیہ حواری کو صلیب پر چڑھا دیا۔ یہودیوں کا دعویٰ اس وقت اور اب بھی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (نعوذ باللہ) نبوت کے جھوٹے دعویدار اور جھوٹے مسیح تھے جنھیں قتل ہی کیا جانا چاہیے تھا۔

یہودیوں کی اس گھناؤنی سازش کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر دوسری دفعہ پھر ایک بادشاہ مسلط کیا۔ یہ روم کا فرمانروا ''ٹائیٹس'' تھا جس نے ۷۰ء میں یہودیوں کی روم مخالف تحریک کو دبانے کے لیے لشکر کشی کی اور دوبارہ یروشلم کی کوئی اینٹ اپنی جگہ سالم نہ رہی۔ اس حشر کے بعد صدیوں تک یہودی دوبارہ اٹھنے نہ پائے یہاں تک کہ بیسویں صدی میں جا کر دوبارہ انھیں سر اٹھانے کا موقع ملا۔ مفسرین کی رائے ہے کہ یہ ان دو فسادوں میں سے دوسرا فساد تھا جن کا ذکر سورہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیتوں میں ہوا ہے[21]۔ ۷۰ء میں رومیوں کے ہاتھوں فلسطین سے یہودیوں کے اخراج کے واقعے کے ساتھ بنی اسرائیل اور یہودیوں کی قدیم تاریخ کا اختتام اور جدید تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل گمراہ کیوں ہوئے؟

اس سے قبل کہ ہم بنی اسرائیل کی جدید تاریخ کی طرف جائیں، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بنی اسرائیل کی گمراہی کی اصل وجوہات کیا ہیں۔ علمائے دین کے مطابق بنی اسرائیل کی گمراہی کا آغاز انبیاء کی تعلیمات سے روگردانی اختیار کرنے اور غیر اللہ کی باتوں کو وحی کی رہنمائی پر مقدم رکھنے کی وجہ سے ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے معاشرے میں شرک و بدعت اور بہت سی اخلاقی بیماریوں نے جنم لے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان بیماریوں کو دور کرنے کے لیے بنی اسرائیل میں پے در پے انبیاء بھیجے۔ اگر ہم تاریخ میں ان انبیاء کی جدوجہد کا جائزہ لیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام انبیاء کی دعوت کے چار مرکزی نکتے تھے۔ ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدعہدی کی ممانعت، دوسرا علمائے سوء کی پیروی سے اجتناب، تیسرا بنی اسرائیل میں شرک و بدعت کی

---

[21] مفسرین میں سے علامہ ابولیث سمرقندیؒ، علامہ بغویؒ، علامہ ابن عادلؒ، علامہ آلوسیؒ اور ابن عاشورؒ نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی بنا کلبی کی روایت ہے، جیسا کہ علامہ سمرقندی نے اپنی تفسیر بحر العلوم میں ذکر کیا ہے۔ رومی فرمانروا 'ٹائیٹس' کے لیے عربی میں لفظ 'طیطوس' اور 'ططیوس' استعمال ہوا ہے۔

مخالفت اور چوتھا نکتہ بنی اسرائیل میں پھیلی ہوئی اخلاقی بیماریوں مثلاً جھوٹ، حسد، بغض، سود خوری، زنا وغیرہ کی روک تھام تھا۔

گمراہی کی پہلی وجہ: بنی اسرائیل کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدعہدی

بنی اسرائیل کی تاریخ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدعہدی کرنے سے بھری پڑی ہے۔ اللہ نے ان کو فرعون سے نجات دی اور تورات عطا فرمائی مگر انھوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اللہ نے ان کے لیے من و سلویٰ اتارا مگر انھوں نے مزید کھانوں کی خواہش کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو شہر پر قبضہ کرنے کا کہا اور انھیں استغفار کرتے ہوئے داخل ہونے کا حکم دیا مگر انھوں یہ کلمہ تبدیل کر دیا اور متکبر بن کر داخل ہوئے۔ جب اللہ نے انھیں جہاد کا حکم دیا اور فلسطین پر حملہ کرنے کا کہا تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہاں جابر قوم رہتی ہے اور ہم میں ان سے لڑنے کی ہمت نہیں۔ جب طالوت کو سپہ سالار مقرر کرنے کو کہا تو انھوں نے اس کو ناپسند کیا اور اللہ سے ثبوت مانگنا شروع کر دیا۔ جب اللہ نے انھیں ایک چلو پانی پینے کا کہا تو انھوں نے پیٹ بھر کر پانی پیا۔ حضرت سلیمان عَلَیۡہِ السَّلَام کے بعد جب بنی اسرائیل کے اندر بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے پے در پے انبیاء بھیجے جنھوں نے ان کی اصلاح کی کوشش کی لیکن بنی اسرائیل نے ان انبیاء کی باتوں کو ماننے کی بجائے علمائے سوء کی باتوں کو ماننا شروع کر دیا۔ اس کی پاداش میں چار سو سال قبل مسیح میں بخت نصر نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا۔ بنی اسرائیل نے اپنے انبیاء سے اللہ کی اطاعت کا دوبارہ عہد باندھا تو اللہ نے انھیں ذوالقرنین کے ذریعے غلامی سے نجات دلائی۔ مگر فلسطین واپس آنے کے بعد وہ پھر سے اللہ کی نافرمانی میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ عَلَیۡہِ السَّلَام کی تکذیب کی بلکہ انھیں قتل کرنے کی سازش بھی کی۔ اس کے بعد اللہ نے انھیں 'مغضوب' قرار دے دیا۔

گمراہی کی دوسری وجہ: بنی اسرائیل کا انبیاء علیہم السلام کی بجائے علمائے سوء کی پیروی کرنا

بنی اسرائیل کی دوسری بڑی گمراہی اپنے انبیاء کی بجائے خواہشات کے اسیر علمائے سوء کی اطاعت تھی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ سورۂ توبہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل علمائے سوء کی اطاعت میں اس قدر بڑھ گئے تھے کہ انھوں نے ان علماء کو 'رب' کی جگہ دے دی تھی اور ان کی ہر بات کو خواہ وہ وحی سے متصادم ہی کیوں نہ ہو، ٹھیک اور قابلِ اتباع قرار دے دیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان علمائے سوء کو انبیاء سے بڑا مقام کیسے دیا گیا؟ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں؛ **پہلی وجہ** دین کے ماخذ میں تبدیلی اور **دوسری وجہ** ان علماء کی جانب سے انبیاء کی کردار کشی تھی۔

بنی اسرائیل کے پاس 'تورات' کی شکل میں کتاب اللہ موجود تھی جو کہ ایک مکمل شریعت تھی۔ بنی اسرائیل کے دین کا دوسرا ماخذ ان کے انبیاء اور ان کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ صحائف اور کتب تھیں، جو وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ ان پر نازل فرماتے تھے جن میں زبور اور انجیل نمایاں کتب تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے دین کے کوئی اور ماخذ نہ تھے۔ بنی اسرائیل سے اللہ کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ ان کتب و صحائف کی تعلیمات پر عمل کریں۔ بخت نصر کی غلامی میں بنی اسرائیل تورات کی حفاظت نہ کر سکے۔ یہودی روایات کے مطابق بخت نصر نے تورات کے تمام نسخے جلا ڈالے اور جب بنی اسرائیل بابل میں غلامی کے دن گزار رہے تھے تو کتاب اللہ ان کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو چکی تھی۔ ایسے میں حضرت عزیر عَلَیْہِ السَّلَام نے تورات کو از سر نو مرتب کیا۔ ان کے اس کارنامے کی وجہ سے یہودیوں نے ان کو اللہ کا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔

اس صورتِ حال میں جب تورات بنی اسرائیل کی نظروں سے غائب تھی، دین کے ماخذ میں ایک اور تبدیلی نمودار ہونا شروع ہو گئی جس کی وجہ سے علمائے سوء کو موقع مل گیا اور انھوں نے لوگوں کو وحی کے دو ماخذوں کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ پہلا ماخذ تورات تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی عَلَیْہِ السَّلَام کو کوہِ طور پر عطا فرمائی تھی۔ جبکہ دین کے دوسرے ماخذ کے متعلق ان علماء نے بنی اسرائیل کے سامنے خود تراشیدہ ایک نئی کہانی پیش کی کہ جب حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کر کے آئے تو اس وقت بنی اسرائیل کے بڑے بزرگوں نے بھی اللہ کی رویت (دیدار) کی فرمائش کی۔ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام بنی اسرائیل کے بزرگوں...... جن کی کل تعداد دس تھی...... کو لے کر کوہِ طور کی طرف گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان دس بڑے بزرگوں کو بھی ہدایت کے لیے وحی کا علم عطا فرمایا۔ یہ علم لکھا ہوا نہیں تھا اور ان بزرگوں کے دلوں میں محفوظ تھا۔ یہ علم ان بزرگوں نے زبانی اپنی اولادوں کو سکھایا جو نسل در نسل چلا آ رہا ہے۔ بخت نصر کی غلامی کے زمانے میں اس علم کو ان علمائے سوء نے 'تلمود' کی شکل میں لکھ دیا تا کہ یہ ضائع نہ ہو جائے۔ اس طرح دین کا ماخذ ایک کی جگہ دو ہو گئے یعنی ایک تورات اور دوسرا تلمود۔ یہ بنی اسرائیل کی سب سے بڑی گمراہی تھی۔ 'تلمود' نہ ہی علمِ وحی تھا اور نہ ہی دینِ حق کا ماخذ بلکہ یہ تو ان علمائے سوء کے گھڑے ہوئے احکامات تھے جسے انھوں نے بنی اسرائیل کے سامنے ماخذ بنا کر پیش کیا۔

دوسری طرف ان علمائے سوء نے تلمود میں اور اس سے باہر انبیاء علیہم السلام کی کردار کشی شروع کر دی۔ اس کردار کشی کا مطلب یہ تھا کہ انبیاء کو ایک عام انسان کی طرح ثابت کیا جائے جو نعوذ باللہ غلطی اور گناہ بھی کر سکتا ہے اور اگر نبی گناہ اور غلطی کر سکتا ہے تو وحی میں بھی غلطی کر سکتا ہے۔ اس لیے عالم اور نبی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس کردار کو کم کرنے کے لیے انھوں نے حضرت نوح عَلَیْہِ السَّلَام کو نعوذ باللہ شراب نوشی کا مرتکب قرار دیا، حضرت لوط عَلَیْہِ السَّلَام کو نعوذ باللہ بدکاری کا مرتکب قرار دیا، حضرت یعقوب عَلَیْہِ السَّلَام کو اپنے خسر اور بھائی کو دھوکا دیتے ہوئے دکھایا گیا، حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام، حضرت داؤد عَلَیْہِ السَّلَام اور حضرت سلیمان عَلَیْہِ السَّلَام کے (نعوذ باللہ) عشقیہ قصے مشہور کیے گئے، یہاں تک کہ ان علمائے یہود کے مطابق نعوذ باللہ حضرت سلیمان عَلَیْہِ السَّلَام نے اپنی بیوی کی محبت میں بت پرستی شروع کر دی تھی۔ یہ سب کچھ جھوٹ اور خرافات پر مشتمل تھا اور اس کا مقصد تورات اور انبیاء کے کردار کو کم کر کے علمائے سوء کے کردار کو زیادہ کرنا تھا۔

پس علمائے سوء کی یہ سازشیں کامیاب ہوئیں، رفتہ رفتہ تلمود نے کتاب اللہ سے زیادہ اہمیت اختیار کرنا شروع کر دی اور انبیاء کی جگہ علمائے سوء نے لے لی۔ اگر ہم خود یہود کی کتابوں اور ان کے صحائف کا مطالعہ کریں تو ہم بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ بخت نصر کے حملے سے ذرا پہلے اور اس کے بعد کے زمانے میں تمام انبیائے بنی اسرائیل کی دعوت اِنھی علمائے سوء کی تعلیمات کے خلاف تھی۔ ان کتابوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل اور علمائے سوء کے درمیان ایک مسلسل جنگ تھی۔ حضرت زکریا عَلَیْہِ السَّلَام، حضرت یحییٰ عَلَیْہِ السَّلَام اور حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے زمانے میں یہ جنگ اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جب علمائے سوء نے نہ صرف ان انبیاء کی تکذیب کی بلکہ انھیں شہید کرنے کی سازشیں کیں۔ علمائے سوء کی قیادت میں بنی اسرائیل نے یہ تمام جرائم کیے جن کا ذکر قرآنِ مجید نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے مثلاً حق کو چھپانا، حق کو باطل سے ملانا، انبیاء کا ناحق قتل، کتاب اللہ میں تحریفات وغیرہ۔ یہ ایسے جرائم تھے جنھوں نے دینِ حق کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا۔ علمائے حق کے اٹھتے جانے یا کمزور پڑ جانے، علمائے سوء کے قیادت پر فائز ہو جانے، اللہ کی کتابوں اور انبیاء کی تعلیمات سے رشتہ توڑ لینے اور تلمود کی خود ساختہ تعلیمات کی پیروی عام ہو جانے کی وجہ سے بنی اسرائیل دینِ حق سے ہٹ کر ایک نئے دین کی راہ پر گامزن ہو گئے جسے آج ''یہودیت'' کہا جاتا ہے۔

گمراہی کی تیسری وجہ: بنی اسرائیل میں شرک اور بدعت

بنی اسرائیل کی گمراہی کی تیسری وجہ ان کے اندر شرک و بدعت کا عام ہو جانا تھا۔ بنی اسرائیل میں شرک و بدعت کے پھیلنے کی بنیادی وجہ علمائے حق کی جگہ علمائے سوء کی اطاعت کرنا تھا۔ اس سے معاشرے میں ایسے

رسم ورواج پیدا ہونا شروع ہو گئے جن کا نہ تو اللہ نے اور نہ ہی انبیائے بنی اسرائیل نے حکم دیا تھا۔ ان رسوم ورواج نے آہستہ آہستہ بنی اسرائیل کو دین سے دور کر دیا۔ دوسری قسم کا شرک وہ تھا جو وہ اللہ کی ذات اور صفات میں کرنے لگے تھے، مثال کے طور پر انھوں نے حضرت عزیر عَلَیْہِ السَّلَام کو اللہ کا بیٹا کہنا شروع کر دیا جس میں کوئی سچ نہ تھا۔ اور ان میں سب سے خطرناک قسم کا شرک وہ تھا جو انھوں نے فلسطین کی قدیم مقامی قوموں سے لیا۔ جب بنی اسرائیل نے فلسطین فتح کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہاں پر بسنے والی قوموں کو ختم کرنے کا حکم دیا تھا مگر بنی اسرائیل نے انھیں ختم نہ کیا، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان قوموں کے ساتھ بنی اسرائیل کے روابط بڑھنا شروع ہو گئے اور انھوں نے ان قوموں سے مشرکانہ باتیں سیکھنا شروع کر دیں۔ فلسطین میں رہنے والی قدیم قومیں مشرک تھیں۔ ان کے سب سے بڑے خدا کا نام 'ایل' اور اس کی بیوی کا نام 'عشیرہ' تھا۔ ان دونوں سے ستر دوسرے خدا پیدا ہوئے جو مختلف کام کرتے تھے۔ کوئی رازق تھا، کوئی خالق تھا، کوئی وباء اور قحط لاتا تھا، نعوذ باللہ! ان خداؤں میں سب سے زیادہ طاقتور 'بعل' (Baal) دیوتا تھا اور اس کی بیوی 'عستارات' (Ashtoreth) تھی۔ بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ بنی اسرائیل بعل پرستی اور عستارات پرستی میں مکمل طور پر ڈوبے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے حضرت الیاس عَلَیْہِ السَّلَام کو بھیجا۔ ان کی تعلیمات اس بعل پرستی کے خلاف تھیں[22]۔ شرک اور کفر کی ایک اور قسم جو بنی اسرائیل میں سرایت کر گئی تھی، وہ جادو اور سحر کا سیکھنا اور اس کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا تھا۔ یہ مرض اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس کا ذکر قرآنِ مجید میں سورۂ بقرہ میں بھی آیا ہے۔ اس جادو سے وہ میاں بیوی میں تفرقہ ڈالتے تھے۔[23]

---

[22] قرآنِ مجید میں سورۂ صافات میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے:

﴿وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ـ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَا تَتَّقُونَ ـ أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ﴾ (الصافات: 123_125)

''اور بلاشبہ حضرت الیاس عَلَیْہِ السَّلَام رسولوں میں سے تھے، جب آپؑ نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ تم بعل کو پکارتے ہو اور بہترین پیدا کرنے والے (اللہ) کو چھوڑ دیتے ہو؟''

اس آیت کی تفسیر مین مفسرین کرامؒ نے لکھا ہے کہ بعل ایک بت تھا جس کی بنی اسرائیل نے پرستش شروع کر دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت الیاس عَلَیْہِ السَّلَام کو مبعوث فرمایا۔ دیکھیے تفسیرِ طبری وغیرہ۔

[23] سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۲ کی طرف اشارہ ہے۔

قدیم یہودی تاریخ سے اخذ ہونے والے یہودی عقائد

علمائے سوء جب بنی اسرائیل کے سامنے دین کا ماخذ تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو انھوں نے بنی اسرائیل میں دین کے بارے میں خود تراشیدہ عقائد پھیلانا شروع کر دیے۔ انھوں نے یہودیوں کی نئی نسلوں کو یہ بتانا شروع کر دیا کہ یہودی اللہ کی چہیتی قوم ہیں اور وہ باقی بنی نوع انسان سے بہت بلند اور افضل ہیں۔ اس لیے دنیا پر حکمرانی کا حق صرف یہود کو حاصل ہے۔ علمائے سوء نے اپنی نئی نسلوں کو یہ بھی بتایا کہ سرزمینِ فلسطین اللہ نے بنی اسرائیل کو دے دی ہے۔ اس سرزمین پر صرف اور صرف انھی کا حق ہے۔ یہ عیسائی اور مسلمان ہی ظالم ہیں جنھوں نے ان سے ان کی سرزمین چھین لی ہے۔ اس سرزمین کو حاصل کرنا عین ثواب کا کام ہے۔ یہودیوں کے علمائے سوء نے اپنی نئی نسل کو یہ بھی تعلیم دی کہ ان کی اصل عبادت گاہ 'ہیکلِ سلیمانی' تھی۔ اس ہیکل پر مسلمانوں نے مسجدِ اقصیٰ بنالی جسے گرا کر دوبارہ ہیکلِ سلیمانی کو تعمیر کرنا یہودی ایمان کا حصہ ہے۔ علمائے سوء نے اپنی کتابوں سے اپنے انبیاء کی بشارتیں نکال نکال کر اپنی نئی نسل کو یہ باور کرادیا کہ یہودیوں کو بیت المقدس واپس ملے گا، ہیکلِ سلیمانی دوبارہ تعمیر ہوگا اور انھیں حضرت سلیمان عَلَیہِ السّلام والی عالمگیر حکومت ملے گی۔ اسی لیے یہودیوں کی نئی نسل ان عقائد پر ایمان لا کر ان مقاصد کے حصول کے لیے اپنی زندگی وقف کرتی ہے۔ یوں انبیائے بنی اسرائیل کا لایا ہوا دینِ حق، بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے اتاری ہوئی کتابیں (تورات، زبور اور انجیل) اور حضرت موسیٰ عَلَیہِ السّلام کی شریعت؛ سب کچھ پیچھے رہ گیا۔ اب جو کچھ ان کے پاس رہ گیا؛ وہ بنی اسرائیلی خون کی بنیاد پر سرزمینِ فلسطین پر جھوٹا دعویٰ، جھوٹے مسیحا کا دعویٰ، جھوٹے ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کا دعویٰ اور حضرت سلیمان عَلَیہِ السّلام والی عالمگیر حکومت کا تصور تھا۔ **یہی آج کی یہودیت اور یہی ان کا دین ہے، جس کا انبیاء کی تعلیمات اور اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔**

اب ہم یہودیت کے درج ذیل جھوٹے عقائد کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کرتے ہیں:

- اللہ کی چہیتی قوم (احباء اللہ)
- غیر یہودی کے بارے میں گوئم کا عقیدہ
- دعائے دانیال اور مقصدِ عظمیٰ
- عقیدۂ ارضِ موعودہ
- ایلیاء کا عقیدہ
- عقیدۂ مسیح

- ہیکلِ سلیمانی

اللہ کی چہیتی قوم (احباء اللہ)

اپنی اس قدیم تاریخ سے یہودیوں نے جو پہلا عقیدہ اخذ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوعِ انسان میں سے نسلِ اسرائیل کو خاص اپنے لیے بلا شرط وقید چنا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل کچھ بھی کرلیں، وہ اللہ کی محبوب ترین اور چہیتی قوم ہی رہے گی۔ اس دنیا کو اللہ نے صرف اور صرف یہودیوں کے لیے پیدا کیا ہے کیونکہ وہ انبیاء کی اولاد میں سے ہیں۔ اس کے ثبوت کے طور پر وہ اللہ کے احسانات کو پیش کرتے ہیں کہ انھیں فرعون سے نجات دلوائی، ان کے لیے اللہ نے صحرائے سیناء میں من و سلویٰ اتارا، ان کے لیے صحراء میں پانی کا انتظام کیا اور بارہ چشمے جاری کیے، پھر انھیں فلسطین کا پورا ملک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دے دیا تاکہ وہ اس میں رہ سکیں اور جب بھی یہودیوں کو کوئی مشکل پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک مسیحا بھیج کر ان کی یہ مشکل حل کردی۔ ان مسیحاؤں میں حضرت موسیٰ عَلَیہِ السَّلام، حضرت طالوت، حضرت داؤد عَلَیہِ السَّلام، بادشاہ ذوالقرنین اور آخری مسیحا ...... جسے وہ مسیحِ داؤد کہتے ہیں...... شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہودیوں کے اس غلط عقیدے کا ذکر کئی جگہ پر کیا ہے اور اس کو غلط قرار دیا ہے[24]۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بنی اسرائیل کو اپنی نعمتیں یاد کروا کر یہ بھی یاد کرایا ہے کہ اللہ کے یہ احسانات بنی اسرائیل کے ان مسلمانوں کے لیے تھے جو انبیاء کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے تھے اور جب ان سے غلطی ہو جاتی تو وہ اپنے گناہوں سے استغفار کرکے پھر سے اللہ کی فرمانبرداری میں لگ جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ احسانات گنوانے کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کے کفرانِ نعمت کرنے، جہاد نہ کرنے، انبیاء کی نافرمانی اور علمائے سوء کی پیروی کرنے، انبیاء کو قتل کرنے، کتاب اللہ میں تحریفات کرنے اور حق کو چھپانے کا مجرم قرار دیا ہے۔

---

[24] اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتے ہیں:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ۖ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ﴾ (المائدۃ: 18)

''اور یہودی اور نصرانی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) کہہ دیجیے کہ (اگر ایسا ہی ہے تو) بھلا وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی بدولت کیوں عذاب دیتا ہے؟ (یقیناً ایسا نہیں) بلکہ تم تو اس کے پیدا کردہ ایک بشر ہو۔ وہ تو جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، عذاب دیتا ہے۔ اور زمین و آسمان کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، (سب) کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے، اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔

علمائے حق نے اللہ کے ان احسانات اور نعمتوں کو بنی اسرائیل کے مسلمانوں اور انبیاء کے پیروکاروں کے لیے قرار دیا، نہ کہ ان کافر یہودیوں کے لیے جنھوں نے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کی اور جن میں آج کل کے سب یہودی بھی شامل ہیں۔ مگر گذشتہ دو سو سال سے یہودی اپنے اسی عقیدے کی تبلیغ عیسائیوں کے درمیان کر رہے ہیں اور انھوں نے عیسائیوں کی عام اکثریت کو اس بات کا قائل کر لیا ہے کہ یہودی اللہ کے منتخب لوگ ہیں اور فلسطین پر انھی کا حق ہے۔

یہودیوں کا غیر یہودیوں کے بارے میں عقیدہ (گوئیم کا عقیدہ)

اللہ تعالیٰ کے منتخب اور چہیتے ہونے کے عقیدہ کی وجہ سے یہودیوں کا یہ عمومی عقیدہ ہے کہ پوری انسانیت دو قسموں میں تقسیم ہے؛ ایک یہودی اور دوسری قسم کے انسان غیر یہودی ہیں۔ غیر یہودی کے لیے ان کی کتابوں میں ایک خاص لفظ ''گوئیم'' (Goyim) استعمال کیا گیا ہے۔ گوئیم عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا عمومی مطلب کم تر انسان ہے مگر یہ غلام یا کبھی جانور کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ یہودیوں کے نزدیک وہ خود تمام انسانوں سے افضل ہیں اور باقی تمام انسانوں کو وہ گوئیم کا لقب دیتے ہیں اور اپنے سے کمتر جانتے ہیں۔ اس عقیدے کے مطابق باقی انسان دراصل بنی اسرائیل کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، لہٰذا یہودیوں کے نزدیک ان کے ساتھ زیادتی کرنا روا ہے، خاص طور پر ان سے بھاری مقدار میں سود وصول کرنا، حالانکہ اس سود کا آپس میں لین دین خود ان کی اپنی کتاب تلمود کے مطابق حرام ہے۔ اسی طرح گوئیم کی جان، مال اور عزت سب کچھ یہود کے لیے مباح ہے۔

عقیدۂ ارضِ موعودہ

اپنے آپ کو اللہ کی چہیتی قوم اور باقی انسانیت کو گوئیم قرار دینے کے بعد تیسرا اہم عقیدہ جو یہودی رکھتے ہیں، وہ 'عقیدۂ ارضِ موعودہ' ہے۔ اس سے مراد وہ زمین ہے جس کا بنی اسرائیل سے وعدہ کیا گیا تھا یعنی فلسطین۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ فلسطین کی سرزمین 'مقدس سرزمین' ہے، خاص طور پر 'یروشلم' اور یہ سرزمین اللہ تعالیٰ نے تاقیامت یہودیوں کو عطا کر دی ہے۔ اس لیے اس پر صرف ان کا حق ہے۔ عیسائی اور مسلمان ......جو ان کے مطابق گوئیم ہیں...... نے فلسطین پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے آج کے یہودی 'عظیم تر اسرائیل' (Greater Israel) کی ریاست کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

اس ریاستِ اسرائیل کی حدود کیا ہوں گی؟ اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہم ایک طائرانہ نظر دوبارہ بنی اسرائیل کی تاریخ پر دوڑاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے جدامجد حضرت یعقوب عَلَیْہِ السَّلَام کا اصلی وطن فلسطین کا علاقہ کنعان تھا۔ بعد میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ اپنے بیٹے حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام کے دورِ حکومت میں مصر آباد ہو گئے تھے۔ پھر حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے دور میں مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں بھٹکتے رہے یہاں تک کہ ان کی وفات کے بعد حضرت یوشع عَلَیْہِ السَّلَام کے زمانے میں فلسطین میں داخل ہو سکے۔ پھر بخت نصر کی جلاوطنی میں وہ عراق کے علاوہ ایران، شام اور جزیرۂ عرب میں بکھر گئے۔ ایسے ہی ٹائٹس کے زمانے میں، اس کے بعد عیسائی اور اسلامی دور میں اور ایک بار پھر قرونِ وسطیٰ میں انھیں مختلف علاقوں سے جلاوطن کیا جاتا رہا۔ آج یہودی ان تمام علاقوں کو 'عظیم ریاستِ اسرائیل' کا حصہ قرار دیتے ہیں جہاں وہ بستے رہے ہیں۔ ان کا نعرہ ہے کہ نیل سے فرات تک اور خیبر سے کنعان تک ان کا علاقہ ہے۔ اگر آپ آج کے اسرائیل کے جھنڈے کو سمجھ لیں تو ان کے 'ارضِ موعودہ' کے عقیدے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس جھنڈے میں اوپر اور نیچے کے کناروں پر دو نیلی دھاریاں اور ایک چھ کونوں والا ستارہ ہے۔ دو نیلی دھاریوں سے مراد دریائے فرات اور دریائے نیل کے درمیان کی سرزمین ہے جو عظیم تر اسرائیل کی حدود ہیں۔ چھ کونوں والے ستارے سے مراد یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ حضرت داؤد عَلَیْہِ السَّلَام کی سلطنت کا نشان تھا اور ان کے جھنڈے پر نصب تھا۔ اسے وہ اپنی زبان میں 'داؤدی ستارہ' (David Star) کہتے ہیں۔ اب اس سے مراد یہ ہے کہ اس عظیم تر اسرائیل پر حضرت داؤد عَلَیْہِ السَّلَام کا خاندان حکومت کرے گا۔

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے ساتھ کیے گئے فلسطین کے وعدے کو تو یہودِ بنی اسرائیل خود اپنی نالائقی، بداخلاقی اور بدعقیدگی کی وجہ سے بہت دیر بعد حاصل کر سکے اور حاصل کرنے کے بعد اس کی حفاظت بھی نہ کر پائے۔ مگر زمانے کے امتداد اور ان کی من گھرٹ تاویلات کے بل بوتے پر اب وہ اس نئے 'عقیدۂ ارضِ موعودہ' کو سچا مانتے ہیں اور پوری تندہی اور کمال چالبازی سے اس کے لیے کوشاں ہیں۔

عقیدۂ ایلیاہ

یہودیوں کے یہاں 'ارضِ موعودہ' کی طرف واپسی کا سفر 'ایلیاہ' (Aliyah) کے نام سے مشہور ہے۔ واپسی کے اس سفر کو وہ بہت پیچیدہ فلسفے میں بیان کرتے ہیں۔ اس سفر کا ایک مرحلہ دنیا میں پھیلاؤ کا ہے اور دوسرا مرحلہ دنیا کو نگلنے کا ہے، یعنی پوری دنیا پر کنٹرول حاصل کرنا۔ یہودیوں کی قدیم کتب میں اس پورے

سفر کا مفروضی نقشہ ملتا ہے جس میں ایک اژدھے نے ان تمام علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اور اس کا سر خلافتِ عثمانیہ کی طرف ہے۔

یہی عقیدہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی راج کی مدد سے فلسطین کی طرف جس قدر یہودی نقل مکانی ہوئی ہے، اسے یہود 'ایلیاہ' ہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مسیحاء کا عقیدہ

مسیحاء کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالی کسی خاص زمانے میں کسی خاص مقصد سے اپنے خاص بندے کو مبعوث فرماتے ہیں اور وہ اللہ کے حکم سے انسانوں کی مدد کے لیے وہ کام سرانجام دیتا ہے جس کے لیے اللہ نے اسے مبعوث فرمایا۔ اہلِ یہود نے اپنی کتب میں کئی مسیحاؤں کا ذکر کیا ہے جو گزر چکے ہیں، اب ان کے مطابق ایک مسیحاء نے آنا ہے جو انھیں دنیا میں حضرت سلیمان عَلَیہِ السّلام کی حکومت و سلطنت دلائے گا۔ اہلِ یہود کا یہ مسیحاء دراصل 'دجال' ہے جسے حقیقی مسیح حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السّلام قتل کریں گے۔ یہود نے حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السّلام کو مسیح ماننے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ وہ آلِ داؤد سے نہ تھے اور یہود کے علماء کہتے تھے کہ مسیح آلِ داؤد سے ہوگا۔ یہ بات بھی انھوں نے خود سے گھڑ لی تھی حالانکہ انبیائے کرام علیہم السلام نے ایسی کوئی بات نہ کہی تھی۔

نصاری حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السّلام کو مسیح اللہ مانتے ہیں اور ان کی دوبارہ دنیا میں تشریف آوری کو بھی مانتے ہیں، مگر وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السّلام کی بعثتِ ثانیہ صرف عیسائیوں میں ہوگی، مسلمانوں یا یہود میں نہیں ہوگی۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السّلام واپس آکر نیک عیسائیوں کو بادلوں میں لے جائیں گے اور دنیا میں خیر اور شر کی ایک عظیم جنگ ہوگی جسے وہ 'ہرمجدون' کی جنگ کہتے ہیں۔ اس جنگ میں خیر کی فتح ہوگی اور حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السّلام دنیا پر امن سے حکومت کریں گے۔

مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السّلام قتل نہیں کیے گئے مگر اس دنیا سے اللہ کے حکم سے اٹھا لیے گئے تھے۔ وہ مسلمانوں میں امام مہدی کے آخری دور میں تشریف لائیں گے، دجال کو قتل کریں گے اور تمام ادیانِ باطلہ کو ختم کر کے دینِ حق کو کامل غلبہ و ظہور عطا فرمائیں گے۔

اس وقت یہود اپنے اسی مسیح الدجال کے انتظار میں ہیں اور اس کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

عقیدۂ ہیکلِ سلیمانی

یہودیوں کے عقیدے کے مطابق ہیکلِ سلیمانی جو حضرت سلیمان عَلَیْہِ السَّلَام نے بنایا تھا، وہ تاریخ میں دو دفعہ تباہ ہوا ہے۔ پہلی دفعہ بخت نصر کے ہاتھوں ہوا جس کے بعد ذوالقرنین نے اس کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ دوسری دفعہ ۷۰ء میں رومی بادشاہ ٹائیٹس کے ہاتھوں تباہ ہوا اور اس وقت سے اب تک دوبارہ تعمیر نہیں ہوا۔ یہ اب یہودیوں پر فرض ہے کہ وہ ہیکلِ سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کرائیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس ہیکل کی دوبارہ تعمیر ان کا مسیحِ داؤد ہی کرے گا لیکن اس کے لیے زمین ہموار کرنا یہودیوں کی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جس جگہ پر وہ ہیکل تعمیر کرانا چاہتے ہیں، اس جگہ پر مسجدِ اقصیٰ موجود ہے۔ اس لیے ہیکل کی تعمیر کے لیے مسجدِ اقصیٰ کا انہدام لازم ہے۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ نہ صرف درپردہ سازشیں اور زیرِ زمین سرنگیں کھود رہے ہیں بلکہ برملا اس کا اعلان بھی کر چکے ہیں اور اقوامِ عالم کے سامنے اپنے مطالبے کو پیش بھی کر چکے ہیں۔

مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان عَلَیْہِ السَّلَام نے ہیکل نہیں تعمیر کرایا تھا بلکہ مسجدِ اقصیٰ ہی کی توسیع کی تھی۔ یہ مسجد مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے۔ ہیکلِ سلیمانی ایک جھوٹی کہانی ہے جو یہودی مسجدِ اقصیٰ کے انہدام کے لیے گھڑ رہے ہیں۔

عقیدۂ تابوتِ سکینہ

''تابوتِ سکینہ'' ایک لکڑی کا صندوق ہے جس میں......ایک روایت کے مطابق......وہ تورات موجود ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کو کوہِ طور پر اپنے ساتھ براہِ راست کلام کے دوران عطا فرمائی تھی۔ اس کے علاوہ اس تابوت میں حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کا عصاء اور من و سلویٰ بھی ہے۔ یہ تابوت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتیں یاد کرانے کے لیے محفوظ رکھا اور بنی اسرائیل اس کو اپنے لیے باعثِ برکت اور باعثِ عروج سمجھتے ہیں۔ یہ تابوت ان سے چھن گیا تھا۔ پھر حضرت طالوت کی فوج کو نشانی کے طور پر واپس ملا مگر بخت نصر کے زمانے میں دوبارہ کھو گیا۔ حضرت عزیر عَلَیْہِ السَّلَام کے زمانے میں واپس ملا اور پھر چھن گیا۔ یہودیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے مسیحِ داؤد یعنی دجال کے زمانے میں یہ تابوت ان کو واپس مل جائے گا اور یہ ان کے دائمی عروج کا باعث ہو گا۔

دعائے دانیال علیہ السلام اور مقصدِ عظمیٰ

یہودیوں کی کتابوں میں انبیاء کے صحائف کا ایک مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی سب سے آخری کتاب 'کتابِ دانیال' کے طور پر مشہور ہے۔ بنی اسرائیل کی روایت میں حضرت دانیال علیہ السلام بخت نصر کی غلامی میں بنی اسرائیل میں مبعوث ہونے والے آخری نبی تھے۔ بنی اسرائیل کے ہاں حضرت دانیال علیہ السلام کی شہرت دو وجہ سے ہے؛ ایک یہ کہ وہ خوابوں کی تعبیر کے ماہر تھے اور اس سلسلے میں ان کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی سی ہے، دوسری وجہ شہرت یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آخری زمانے میں ہونے والے واقعات کا تفصیلی علم دیا تھا۔ ان واقعات کی غلط تشریحات نے بنی اسرائیل کی گمراہی میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں حضرت دانیال علیہ السلام کے متعلق ایک عجیب واقعہ درج کیا ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جب ایران کا ایک شہر 'تستر' فتح کیا تو انھیں ایک شخص نے اطلاع دی کہ اس شہر میں ایک بزرگ کی لاش ہے جسے لوگ حضرت دانیال علیہ السلام کی لاشِ مبارک قرار دیتے ہیں، اس کے ساتھ ایک سونے اور چاندی کا خزانہ بھی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس لاش کی زیارت کی۔ وہاں ایک خزانہ، ایک انگوٹھی اور ایک لکھا ہوا صحیفہ موجود تھا۔ یہ اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجی گئی تو انھوں نے لاش کو دفن کرنے، خزانہ غریبوں میں تقسیم کرنے اور انگوٹھی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو دینے کا حکم دیا۔ اس صحیفے کا ترجمہ حضرت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ نے کیا جو اسرائیلی روایات کے ماہر تھے۔ اس صحیفے میں امتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں اور عروج کی تفصیلات درج تھیں۔

یہودیوں کے یہاں یہ مشہور ہے کہ جب بنی اسرائیل بخت نصر کی قید میں تھے تو اللہ نے حضرت دانیال علیہ السلام کو نبی مبعوث فرمایا۔ بنی اسرائیل کے بزرگوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ رب تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ بنی اسرائیل کو اس غلامی سے نجات دلائے اور واپس فلسطین بھیج دے، ان کی عبادت گاہ ہیکلِ سلیمانی بنانے کی اجازت دے دے اور انھیں حضرت سلیمان علیہ السلام والا عروج دنیا میں عطا کر دے۔ یہودی روایات میں ہے کہ حضرت دانیال علیہ السلام نے اللہ سے دعا فرمائی اور انھیں خواب کے ذریعے بشارت دی گئی کہ ان کی دعا قبول کر لی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ ایک بادشاہ بھیجیں گے جو انھیں نہ صرف غلامی سے نجات دلائے گا بلکہ ہیکلِ سلیمانی بنانے میں بھی مدد دے گا۔ پھر انھیں دنیا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح کا عروج 'مسیح اللہ' یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد سے ملے گا۔ اس طرح حضرت دانیال علیہ السلام کی اس بشارت کو آج کے یہودی اپنا 'مقصدِ

عظمیٰ' سمجھتے ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کا مقصدِ عظمیٰ درج ذیل تین نکات پر مشتمل ہے:

۱۔ یہودیوں کو بیت المقدس جانے کی اجازت مل جائے،

۲۔ ہیکلِ سلیمانی دوبارہ تعمیر ہو جائے،

۳۔ حضرت سلیمان عَلَیہِ السَّلام کے دور والی عظمت انھیں واپس لوٹادی جائے جو کہ ایک عالمگیر حکومت کی شکل میں ہے۔

قتلِ عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کی سازش اور یہودیت اور عیسائیت کا آغاز

قتلِ عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کی سازش کے بعد سے دنیا میں دو نئے ادیان یعنی ایک یہودیت اور دوسری عیسائیت پیدا ہو گئی تھی۔ یہودیت دینِ حق سے ہٹ کر تلمود کی تشریحات اور علماء سوء کی راہنمائی میں چلنے والا ایک نیا دین بن گیا جس کا اس دین سے کوئی تعلق نہ تھا جو حضرت موسیٰ عَلَیہِ السَّلام لے کر آئے تھے۔ اب یہودی دعائے دانیال عَلَیہِ السَّلام کی بنا پر ایک مسیحاء کا انتظار کر رہے ہیں جو ان کے مطابق آلِ داؤد سے ہو گا اور جس کی قیادت میں وہ ارضِ موعودہ پر قبضہ کریں گے، ہیکلِ سلیمانی واپس لیں گے اور دنیا میں عالمگیر حکومت کریں گے۔ دوسری طرف 'عیسائیت' بھی وہ دین نہ تھا جسے حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام لے کر آئے تھے۔ اس میں تو تحریف ہو گئی اور عیسائیت 'پولس' (Saint Paul) کی گمراہ تشریحات پر مبنی دین میں تبدیل ہو گیا۔

یہود کی جدید تاریخ

یہودیوں کی جدید تاریخ انتہائی پیچیدہ اور پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ایک ہی وقت میں کئی ادوار اور علیحدہ علیحدہ تاریخیں ہیں۔ جب یہودیوں کو رومیوں نے یروشلم سے نکال دیا تھا تو وہ وہاں سے نکل کر شام، عراق، جزیرۂ عرب، یمن، فارس اور انطاکیہ میں پھیل گئے۔ یہ علاقے بھی زیادہ تر رومیوں کے قبضے میں ہی تھے۔ ہر علاقے میں انھیں نئے حکمرانوں اور حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان سب کی تاریخیں جدا جدا ہیں۔ مگر چوتھی صدی عیسوی میں ان رومی بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ 'قسطنطین' (Constantine) نے عیسائیت قبول کر لی تو شام میں یہودیوں کے لیے حالات مختلف ہو گئے۔ دوسری طرف ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کے ظہور کے بعد جزیرۂ عرب اور یمن میں یہودیوں کو نئے حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بعد میں انھیں عرب سے بھی نکال دیا گیا۔ اسلام کے عروج سے جب عیسائیت سمٹ کر مشرقی یورپ میں رہ گئی اور وہاں پاپائی

نظام قائم ہوا تو وہاں پر موجود یہودیوں کو نئے حالات درپیش آئے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں قوقاف کی 'خیصار' قوم (Khazars) کو...... جس نے یہودیت قبول کرلی تھی...... تاتاریوں کے حملے کے بعد روس اور مشرقی یورپ کی طرف بھاگنا پڑا جہاں سے یہودیوں کی یورپ میں ایک نئی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح پندرہویں صدی عیسوی میں جب اندلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کو بھی اندلس سے نکلنا پڑا۔ اب کی دفعہ وہ اٹلی اور 'سلطنتِ عثمانیہ' کے علاقے کی طرف چلے گئے۔ اور بالآخر انقلابِ فرانس کے بعد یہودیت ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ الغرض یہودیوں کی اس تاریخ میں اتنے مرحلے ہیں کہ انھیں اس کتاب میں علیحدہ علیحدہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ہم جغرافیہ کی بنیاد پر یہود کی جدید تاریخ کو پانچ بڑے ادوار میں تقسیم کرتے ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

- یہودی، مشرک رومی سلطنت میں
- یہودی، عیسائی رومی سلطنت میں
- یہودی، اسلامی سلطنت میں
- یہودی، یورپ میں
- انقلابِ فرانس سے ریاستِ اسرائیل کے قیام تک

یہودی، مشرک رومی سلطنت میں

۷۰ء میں جب رومیوں نے یہودیوں کو 'یروشلم' سے نکال دیا تو وہ شام، عراق، ایران، مدینہ اور ترکی کے علاقوں میں پھیل گئے۔ یہ ان کے لیے بہت تکلیف دہ دور تھا۔ ان کے خوابوں کی سرزمین ان سے چھینی جاچکی تھی۔ رومیوں کا سلوک بھی ان کے ساتھ انتہائی تحکمانہ تھا۔ شام میں یہودیوں کو دو طرح کی صورت حال سے مقابلہ تھا، ایک طرف مشرک رومی تھے تو دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا دینِ حق تھا۔ یہودیوں ہی کی سازش سے دینِ حق میں 'پولس' جیسے مفکر شامل ہوگئے۔ اب عیسائیت بھی دینِ حق اور یہودیت کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس دور میں بھی ان کے کئی قتل عام ہوئے۔ اللہ کے غضب نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور یہ پوری دنیا میں ذلت کی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن یہاں بھی ان کے علمائے سوء نے ان کی جان نہیں چھوڑی بلکہ ان کو یہ باور کراتے رہے کہ وہ اللہ کے غضب کی وجہ سے 'یروشلم' سے نہیں نکالے گئے بلکہ رومیوں نے ان پر ظلم کیا ہے، وہ ایک مظلوم قوم ہیں اور فلسطین کی زمین اللہ نے انھی کے لیے لکھ دی ہے اور انھیں واپس جانا ہے۔ یہی وہ سوچ و فکر ہے جسے لے کر یہودی اب تک زندگی گزار رہے ہیں۔

یہودی، عیسائی رومی سلطنت میں

ایک طرف یہودی دنیا بھر میں دربدری اور جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے جبکہ دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دینِ حق کے خلاف ان کی سازشیں جاری تھیں۔ اب انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں بھی اپنا سازشی ٹولہ شامل کر دیا۔ انھی میں سے ایک یہودی عالم نے ......جو سینٹ پال کے نام سے مشہور ہوا...... دھوکے کے طور پر دینِ حق قبول کیا اور آغاز میں حواریوں کے ساتھ مل کر دینِ حق کی تبلیغ شروع کی۔ جب ان حواریوں اور لوگوں کا سینٹ پال پر اعتماد قائم ہو گیا تو اس نے دینِ حق میں تحریفات کرنا شروع کر دیں۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اور ان کے انسانیت کے لیے مصلوب ہونے کا عقیدہ ایجاد کیا۔ رفتہ رفتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا دینِ حق ان شرکیہ عقائد کی دھند میں چھپ گیا۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ باب میں پیش کریں گے ان شاء اللہ۔

یہودیوں کی جدید تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل اس وقت آیا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین سو سال بعد ایک رومی فرمانروا ''قسطنطین'' نے عیسائیت قبول کر لی۔ قسطنطین کے عیسائیت قبول کرتے ہی یہودیوں کے لیے تو تصویر ہی الٹ گئی۔ اب اس عیسائی دنیا میں یہودیوں پر ظلم و ستم ڈھایا جانے لگا کیونکہ عیسائیت کے مطابق یہودیوں نے ہی (نعوذ باللہ) خدا کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بغض و عداوت رکھی اور انھیں رومیوں کے ساتھ مل کر سازش کے تحت سولی پر چڑھایا تھا۔ عیسائی روم میں یہودیوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا اور جو عیسائی نہ بنتا، اسے قتل کر دیا جاتا۔ یہ یہودیوں کی تاریخ میں ایک بدترین دور تھا۔

یہودی، اسلامی سلطنت میں

یہودیوں پر عیسائیوں کا یہ جبر جاری تھا کہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں عرب سے اسلام کا سورج طلوع ہو گیا۔ پھر جب اللہ کے نبی ﷺ مدینہ ہجرت کر کے گئے تو یہاں پر یہود کے قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ موجود تھے۔ انھوں نے دینِ حق کو پہچان لیا مگر اس کا انکار کر دیا۔ دوسری طرف عہدِ نبوی ﷺ میں یہودِ مدینہ کو ان کی غداری اور بد عہدی کے نتیجے میں مدینہ اور گرد و نواح سے نکال دیا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں فرمانِ نبوی ﷺ کے مطابق انہیں پورے جزیرۂ عرب سے ہی نکال دیا گیا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت المقدس فتح ہوا تو اس وقت فلسطین کی مقدس سرزمین کا نام 'ایلیاء' پڑ چکا تھا اور اس کا حکمران عیسائی رومی تھا۔ بیت المقدس کے عیسائی رہنماؤں نے خلافتِ اسلامیہ کے ماتحت بطور ذمی رہنے کو قبول کیا اور جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے شہر کی کلید وصول کرنے بیت المقدس گئے تو ان کے ساتھ

معاہدہ کیا جس میں یہ شق بھی رکھی گئی کہ بیت المقدس میں عیسائیوں کے ہمراہ یہودیوں کو رہنے کی ہر گز اجازت نہ ہو گی۔[25]

مسلمانوں کے ہاتھوں فلسطین کی فتح یہودیوں کے لیے ایک اور اہم مسئلہ تھا۔ یہودیوں کے سامنے عیسائیوں کے بعد اب ایک اور طاقتور دین اس سر زمینِ فلسطین کا دعویدار بن کر آ چکا تھا۔ عیسائی پہلے ہی اس زمین پر اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس طرح عیسائیوں اور مسلمانوں میں جنگوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا جو تاریخ میں ''صلیبی جنگیں'' کہلایا۔ ان جنگوں میں یہودی شامل نہ ہو سکتے تھے کیونکہ ان کی تعداد اس قدر کم تھی کہ وہ ان دو بڑی طاقتوں کا مقابلہ ہی نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے انھیں سازشوں سے ہی کام لینا تھا اور یہی ان کی جدید تاریخ کا خاصہ ہے۔

اسلام کے خلاف یہودیوں نے بڑی بڑی سازشیں تیار کیں جن میں نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کے قتل کی سازشیں بھی شامل تھیں، لیکن ان کی سب سے کامیاب سازش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوئی۔ یمن کے ایک یہودی عبداللہ بن سباء نے اسلام قبول کر لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف منظم مہم شروع کر دی۔ وہ آپ کے عمال پر تنقید کرتا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں بولتا، انھیں خلافت کا حق دار اور نبی ﷺ کا وصی قرار دیتا۔ اس کی یہ مہم کامیاب رہی اور وہ مسلمانوں کے ایک گروہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بدگمان کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہی خطرناک مہم آخر کار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنی۔ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ اسلامی تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جس نے امت میں شیعہ اور رافضی فتنے کا ایسا دروازہ کھول دیا جو شاید آخری زمانے تک جاری رہے۔ یہاں اس فتنے کی تفصیلات میں جانا ہمارے لیے ممکن نہیں اور اس کے اجمالی ذکر سے ہمارا مقصود یہودی سازشوں کو بے نقاب کرنا تھا۔ یہودی عبداللہ بن سباء کا کردار سینٹ پال کے کردار سے بہت مشابہ ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دینِ حق میں تحریفات کر کے اس دین کو 'عیسائیت' میں تبدیل کر دیا۔ البتہ یہ اللہ کے نازل کردہ آخری پیغام کی قوت و امتیاز ہے کہ فریسیوں نے تورات کی تعلیمات کو مسخ کر کے رکھ دیا، سینٹ پال نے عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا پورا حلیہ ہی تبدیل کر دیا، لیکن عبداللہ بن سباء اور اس کے رافضی چیلوں کی بد عقیدگی سے اس امت کو محفوظ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے

---

[25] امام طبری رحمہ اللہ نے معاہدے کی جو عبارت نقل کی ہے، اس میں درج بالا شق کے لیے یہ الفاظ ذکر کیے ہوئے:

''ولا يسكن بإيلياء معهم أحد من اليهود''۔

علمائے حق اٹھائے جنہوں نے غیر معمولی جہد کرکے اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد اور رافضیوں کی گمراہیوں کو ایک دوسرے سے بالکل واضح طور پر جدا کردیا تاکہ یہ دین قیامت تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہے۔

اسلامی خلافت کے بعد کے ادوار میں یہودی عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں 'بطورِ ذمی' امن وامان سے رہائش پذیر رہے۔ اس فرصت اور مسلمانوں کی علمی اور فکری ترقی سے استفادہ کرتے ہوئے درپردہ وہ اپنے عروج کے لیے تیاریاں کرتے رہے۔ خاص طور پر اندلس (ہسپانیہ) کے مسلم دور کو یہودی اپنے 'سنہری دور' (Golden Age) سے یاد کرتے ہیں۔

یہودی، یورپ میں

آٹھویں صدی عیسوی میں قوقاف کی 'خیصار' قوم کے ایک بادشاہ نے اپنی پوری قوم کے ساتھ یہودیت قبول کرلی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کے علمائے سوء نے اس قوم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ثابت کر کے ان کی یہودیت کو قبول کرلیا، ورنہ یہودی اپنے دین کی تبلیغ نہیں کرتے، وہ صرف اپنے خون کی بنیاد پر کسی کو یہودی مانتے ہیں۔ تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے حملے نے خیصار قوم کو قوقاف سے نکلنے پر مجبور کردیا اور یہ لوگ مشرقی یورپ خصوصاً پولینڈ میں پھیل گئے۔ ان یہودیوں کو 'اشکنازی' یہودی (Ashkenazic Jews) کہا جاتا ہے۔ وہ یہودی جو مسلمان علاقوں 'ترکی' اور 'شمالی افریقہ' میں رہے، انھیں آج کل 'سفارڈی' یہودی (Sephardic Jews) کہا جاتا ہے۔ آج کے اسرائیل میں اسّی فیصد اشکنازی یہودی ہیں جبکہ بیس فیصد سفارڈی یہودی ہیں اور یہی آج کی اصل یہودی آبادی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے اسرائیل میں اسّی فیصد بنی اسرائیل کی نسل سے تعلق رکھنے والے یہودی نہیں ہیں بلکہ خیصاری نسل سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

یورپ میں یہودیوں کی زندگی ایک غلام سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ رومن کیتھولک کلیساء ان کو قتلِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ یہودیوں کو منحوس قرار دے کر ان کو عیسائیوں کے علاقوں میں رہنے سے منع کردیا گیا تھا۔ اس لیے ان کو شہروں سے باہر علیحدہ کالونیوں میں رہنے کی اجازت تھی۔ یہ علیحدہ کالونیاں یورپ کی تاریخ میں 'یہودیوں کے باڑے' (Jewish Ghettos) کے نام سے مشہور ہوئیں۔ دوسری طرف ان کے لیے گورنمنٹ کے کسی محکمہ میں کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے یورپ میں یہودیوں کے لیے ایک ہی پیشہ اپنانا ممکن تھا اور وہ تجارت اور صرافہ کا کام تھا۔ تجارت یورپ کے جاگیردار معاشرے میں ایک تیسرے درجے کا کام تھا۔

یورپ میں یہودیوں کا قتلِ عام بھی ایک عام سی بات تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ صلیبی جنگوں کے دور میں صلیبیوں نے کئی دفعہ ان کا قتلِ عام کیا۔ یہودیوں کے قتلِ عام کی دوسری اہم وجہ ان کا سود در سود پر مبنی معاشی نظام تھا جس میں وہ معاشرے کو جکڑ لیتے تھے اور آخر کار معاشرے ان کے خلاف بغاوت کرتے اور ان کا قتلِ عام ہوتا۔ تاریخ میں تذلیلِ یہود کی ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں؛ ۱۲۰۹ء میں انھیں انگلستان سے قتلِ عام کے بعد نکالا گیا، اسی طرح فرانس سے پہلے ۱۳۰۶ء میں اور پھر ۱۳۹۴ء میں، بیلجیم سے ۱۳۷۰ء میں، چیکو سلواکیہ سے ۱۳۸۰ء میں، ہالینڈ سے ۱۴۴۴ء میں، روس سے ۱۵۱۰ء میں، اٹلی سے ۱۵۴۰ء میں اور جرمنی سے ۱۵۵۱ء میں جلا وطن کیے گئے۔ اندلس پر جب عیسائیوں نے قبضہ کر لیا تو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کو بھی جلا وطن کیا گیا اور ان کا قتلِ عام کیا گیا۔ جلا وطنی اور قتلِ عام کا یہ سلسلہ پورے یورپ میں وقتاً فوقتاً جاری رہا۔

یہودیت اور مارٹن لوتھر کی تحریک

یورپ میں یہودیوں کی تاریخ میں سب سے اہم موڑ جرمن پادری 'مارٹن لوتھر' (Martin Luther) کی تحریکِ اصلاح (Reformation) کی کامیابی ہے۔ مارٹن لوتھر کی یہ تحریک کلیساء کے نظام اور پادریوں کی اصلاح کے لیے شروع کی گئی تھی۔ مگر اس تحریک کی ایک خاص بات یہ تھی کہ مارٹن لوتھر نے رومن کیتھولک عقائد کے برعکس تورات، زبور اور انبیاء سے منسوب عہد نامہ عتیق (Old Testament) میں موجود صحائف کو عیسائیت کے لیے دینی ماخذ قرار دیا۔ ایسی ہی چند وجوہات کی بنا پر ماٹن لوتھر کی اس تحریک کو بہت سے مؤرخین نے یہودیوں کی سازش قرار دیا ہے۔ بعض مؤرخین کے خیال میں مارٹن لوتھر خود یہودی تھا اور بعد میں عیسائی ہوا۔ بعض کے خیال میں اس کی ماں یہودی تھی، واللہ اعلم۔ مگر یہ حقیقت ضرور ہے کہ اس کی اس تحریک کے نتیجے میں عیسائیت میں ایک ایسا نیا فرقہ پیدا ہو گیا جو یہودیوں کو دین میں اپنا بڑا بھائی قرار دیتا تھا اور نہ صرف 'عہد نامہ عتیق' کو اپنے لیے دین کا ماخذ سمجھتا تھا بلکہ یہودیوں کے عقائد (الارض الموعودہ، ہیکلِ سلیمانی، دعائے دانیال) پر بھی یقین رکھتا اور ان کو یہودیوں کا حق سمجھتا تھا۔ اس فرقے کو آج 'پروٹیسٹنٹ فرقہ' (Protestant) کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہودیوں کو عیسائیوں میں اپنا بہت ہی اچھا دوست اور ساتھی مل گیا۔

برطانوی بادشاہت اور پروٹیسٹنٹ عیسائیت

۱۵۳۲ء میں برطانیہ کے بادشاہ 'ہنری ہشتم' (Henry VIII) نے اپنے تخت کے وارث کے لیے دوسری شادی کرلی۔ کلیسائے روم نے اس شادی کو کالعدم قرار دے دیا اور بادشاہ کی اولاد 'الزبتھ اول' (Elizabeth I) کو بادشاہت کی امیدواری کی دوڑ سے خارج کردیا۔ الزبتھ اول کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ پروٹیسٹنٹ مذہب قبول کرلے جو اس کو بادشاہت کا جائز حق دار سمجھتا تھا۔ چنانچہ الزبتھ اول نے ایسا ہی کیا اور پھر اپنی بہن 'میری اول' (Queen Mary I) کا تختہ الٹ کر خود برطانیہ کی ملکہ بن گئی۔ اس طرح برطانیہ میں پروٹیسٹنٹ مذہب کا اثر ورسوخ بڑھ گیا۔ الزبتھ اول کے بعد 'جیمز اول' (James I) اور 'جیمز دوم' (James II) کے ادوار میں رومن کیتھولک مذہب اور پروٹیسٹنٹ مذہب کے درمیان ایک کشمکش شروع ہوگئی۔ ۱۶۸۸ء میں بہت سے بحرانوں کے بعد برطانیہ میں 'چرچ آف انگلینڈ' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کو ۱۶۸۸ء کا 'عظیم انقلاب' (English Revolution) کہتے ہیں۔ چرچ آف انگلینڈ کے مطابق وہ ایک ایسا رومن کیتھولک کلیساء ہے جس نے پروٹیسٹنٹ اصلاحات کو اپنالیا ہے۔ چرچ آف انگلینڈ جو کچھ بھی ہو مگر ۱۶۸۸ء کا یہ انقلاب یہودیوں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا اور سترھویں صدی میں انگلستان یہودیوں کا ایک مرکز بن گیا۔ یہ اس فرقے اور یہودیوں کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ اس کا تفصیلی ذکر ہم آگے مغرب کی تاریخ میں کریں گے ان شاءاللہ۔

یورپ کی تیس سالہ جنگ اور پروٹیسٹنٹ فرقے کا عروج

۱۶۱۸ء میں یورپ کے ممالک میں تیس سالہ جنگ ہوئی جس میں فرانس، جرمنی، آسٹریا، اٹلی اور سپین کے بادشاہ، شہزادے اور نواب ایک دوسرے کے ساتھ اپنے اپنے مفادات کے تحت نبرد آزما تھے۔ اس جنگ کی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ رومن کیتھولک مذہب اور پروٹیسٹنٹ مذہب کا اختلاف بھی تھا۔ ۱۶۴۸ء میں اس جنگ کا خاتمہ ایک معاہدے کے تحت ہوا جس کو 'معاہدۂ ویسٹ فیلیا' (Peace of Westphalia treaty) کہتے ہیں۔ اس معاہدے کے تحت ہر ایک کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرلے۔ اس طرح برطانیہ کے ساتھ ساتھ باقی یورپ میں بھی پروٹیسٹنٹ مذہب کو ایک علیحدہ فرقے کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔ پروٹیسٹنٹ فرقہ جہاں جہاں اپنی جگہ بنا رہا تھا، وہاں وہاں یہودیوں کے لیے حالات میں تبدیلی آرہی تھی کیونکہ پروٹیسٹنٹ فرقہ ان کو مذہب میں اپنا بڑا بھائی مانتا تھا۔

یہودیت اور امریکہ کی دریافت

۱۴۹۲ء میں سپین کے مہم جو 'کولمبس' (Christopher Columbus) نے امریکہ دریافت کیا۔ امریکہ کی دریافت سے یورپ کے تمام ممالک اس ملک میں اپنا اپنا تسلط قائم کرنے کی دوڑ میں لگ گئے۔ ان میں سپین، برطانیہ اور فرانس شامل تھے۔ امریکہ کی دریافت یہودیوں اور ان کے حامی نئے عیسائی فرقے کے لیے بہت خوش بخت ثابت ہوئی۔ ۱۷۲۷ء میں ان دونوں نے رومن کیتھولک کلیساء کے مظالم سے تنگ آکر بہت بڑے پیمانے پر امریکہ ہجرت کی۔ امریکہ میں رومن کیتھولک کا زیادہ زور نہ تھا۔ اس لیے بہت کم عرصے میں یہ دونوں طبقے امریکہ کی سیاست پر غالب آ گئے اور آج تک غالب ہیں۔

انقلابِ فرانس سے جدید ریاستِ اسرائیل کے قیام تک

روشن خیالی اور انقلابِ فرانس

جہاں ایک طرف پروٹیسٹنٹ تحریک یورپ کی مذہبی وسیاسی حالت پر اثر انداز ہو رہی تھی، وہیں دوسری طرف کلیسائے روم کے مظالم سے تنگ اور مذہب سے بے زار لادین عیسائیوں نے سترھویں صدی عیسوی میں کلیساء کے خلاف 'حقوقِ انسانی' کے نام پر ایک تحریک شروع کر دی، جسے 'روشن خیالی کی تحریک' (Enlightenment Movement) کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے فلسفیوں نے عقل کی بنیاد پر عیسائی مذہب کو مسترد کر دیا۔ ۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو 'انقلابِ فرانس' (French Revolution) برپا ہوا جس کے بعد کلیساء اور بادشاہتوں کے اختیارات کو ختم کر کے جمہوریت کو نافذ کر دیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ پورے یورپ میں جمہوری انقلابات برپا ہونا شروع ہو گئے۔ انقلابِ فرانس کے برپا ہونے سے کسی اور کا فائدہ ہوا ہو یا نہ ہو، یہود کی تو لاٹری نکل آئی کیونکہ یورپ کے جس ملک میں بھی کلیساء کی حکومت ختم ہوئی، اس ملک نے سب سے پہلے یہودیوں پر عائد پابندیاں ختم کر دیں۔ مؤرخین 'روشن خیالی' کی تحریک میں بھی یہودیوں کا ہاتھ ہونے کے شواہد پیش کرتے ہیں۔ بہر حال جو بھی ہو، انقلابِ فرانس کے بعد یہودیوں کے گرد کلیساء کا باڑہ ٹوٹ گیا اور اس باڑے کے ٹوٹنے کے بعد یہودیوں نے ریاستِ اسرائیل کے قیام تک کبھی واپس مڑ کر نہیں دیکھا۔

انیسویں صدی کا سورج یورپ میں یہودیوں کے عروج کے ساتھ طلوع ہوا۔ یہودی جنھیں یورپ میں تیسرے درجے کا شہری تصور کیا جاتا تھا، انقلابِ فرانس کے فوراً بعد جمہوری ریاستوں کے پارلیمانوں نے انھیں مساوی حقوق دینے کی قرار دادیں منظور کیں۔ اس طرح یہودی عیسائیوں کے دیس میں اول درجے کے شہری

بن گئے۔ یہ ریاستِ اسرائیل کی جانب پہلا قدم تھا، جس کے بعد کئی مراحل طے ہوئے۔ تاریخِ جدید کی حیران کن بات یہ ہے کہ جہاں انقلابِ فرانس مذہب بیزاری کے نتیجے میں برپا ہوا اور اس کے زیرِ اثر پوری دنیا کی تنظیمِ نو لادینیت پر کی گئی اور مذہب کو شجرِ ممنوع قرار دیا گیا، وہیں اِنھی حکومتوں اور عالمی طاقتوں کی سرپرستی میں ایک ایسی ریاست وجود میں آتی ہے جو خالصتاً مذہب اور نسل کی بنیاد پر تشکیل دی گئی۔ یہ بذاتِ خود ایک ثبوت ہے کہ **جدید دنیا کا نظام یہودیوں کی ایجاد ہے** جسے انھوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے وضع کیا ہے۔ یہاں ہم آگے طے ہونے والے مراحل کے نمایاں واقعات ذکر کریں گے جن کا جوڑ ہمیں آگے چل کر تاریخِ یورپ اور دشمن کے منصوبے میں یہودی عنصر کے بیان میں ملے گا۔

یورپ میں ریاستِ اسرائیل کے بیج (۱۸۰۰ء تا ۱۹۰۰ء)

اٹھارویں صدی عیسوی میں یہودیوں کو یورپ میں پروٹیسٹنٹ عیسائیوں، 'روشن خیال' لادین عیسائیوں اور امریکہ و برطانیہ کی حکومتوں کی شکل میں ایسے مخلص دوست میسر آ چکے تھے جو انھیں دعائے دانیال کی منزل کی طرف سفر کرنے میں مدد دے سکتے تھے۔ دوسری طرف انقلابِ فرانس کے بعد یورپ کے اقتصادی نظام میں بڑی تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ اب آزاد معیشت کے نام پر بینکوں اور کرنسیوں کا نظام تبدیل ہو رہا تھا۔ یہودی اس میدان کے شاہسوار تھے کیونکہ وہ صدیوں سے یورپ میں صرافہ اور بینکاری کے کاروباروں پر چھائے ہوئے تھے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں انھوں نے اسی کاروبار کی وجہ سے یورپ کے بینکوں کی تجارت پر مکمل قبضہ کر لیا اور سارے یورپ کی حکومتوں کو اپنے قرضوں تلے دبا دیا۔ یہی چیز اس صدی کے دوسرے نصف میں ان کی اصل طاقت بنی اور اسی طاقت نے یورپ کی حکومتوں کو مجبور کیا کہ وہ یہودیوں کے علیحدہ وطن کے لیے ان کی حمایت کریں، گو آدھے سے زیادہ کام پروٹیسٹنٹ فرقہ کر چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں تین عناصر نے مل کر ریاستِ اسرائیل کے قیام میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک 'روتھ چائلڈ' خاندان (House of Rothschild) کا قیام، دوسرا صہیونی تحریک کا آغاز اور تیسرا سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے گریٹ گیم کا آغاز۔ یہاں ہم ان تینوں عناصر کو مختصراً بیان کرتے ہیں۔

روتھ چائلڈ خاندان

قیامِ اسرائیل کی کوششوں میں روتھ چائلڈ خاندان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ روتھ چائلڈ کا مطلب 'سرخ ڈھال' ہے۔ یہ خاندان آج تک دنیا کے بڑے بینکوں کا مالک ہے اور عالمی تجارت کے ایک بڑے حصے پر ان کی اجارہ داری قائم ہے۔ ان کے مورث 'میئر ایمشل' (Mayer Amschel) (۱۷۴۳ء تا ۱۸۱۲ء) کی تربیت یہودی عالم کے طور پر کی گئی مگر خود اس نے اپنے لیے بینک کا کاروبار پسند کیا۔ 'میئر ایمشل' اپنے مذہب کا اس حد تک وفادار تھا کہ اس نے زندگی بھر دستاویزات پر عیسوی کی بجائے یہودی تاریخ درج کی۔ اسے بینکاری میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، یہاں تک کہ پورے یورپ میں اس کے بینک کی شاخیں پھیل گئیں۔

اس کی اولاد نے اپنے والد کے کاروبار کو اتنی ترقی دی کہ انیسویں صدی میں اس خاندان کا شمار یورپ کے امیر ترین اور بااثر خاندانوں میں ہونے لگا۔ اس صدی کا شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہو جس میں اس خاندان کا براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہ ہو۔ اس خاندان نے یورپ کے بادشاہوں تک کو قرضوں میں جکڑا۔ برطانیہ اور فرانس کے درمیان ہونے والی مشہور 'واٹر لو جنگ' (Waterloo Battle) میں روتھ چائلڈ خاندان نے برطانوی حکومت کو بھاری قرضہ دیا تھا۔ برطانیہ اور فرانس کے وسیع ریلوے نظام میں اس خاندان کا ۲۵ فیصد حصہ تھا۔ نہ صرف یورپ بلکہ اس خاندان نے سلطنتِ عثمانیہ کو بھی ریلوے لائن بچھانے کے لیے قرضہ فراہم کیا۔ اس زمانے کے چھپنے والے تقریباً تمام اخبارات اسی خاندان کی ملکیت تھے۔ اسی خاندان نے حکومتِ برطانیہ کو 'نہر سویز' (Suez Canal) کے حصص خریدنے کے لیے بھاری قرضہ فراہم کیا۔ اس مرحلے میں اس خاندان نے پورے یورپ اور عثمانیوں کو اپنے قرضے تلے دبایا۔ جدید دنیا میں قرضوں پر سیاست کی بنیاد اسی یہودی خاندان نے رکھی۔ روتھ چائلڈ خاندان نے فلسطین میں یہودیوں کے لیے زمینیں خریدنے کے لیے نہ صرف رقم فراہم کی بلکہ یہودیوں کو ان کے عقیدۂ ایلیاہ کے مطابق ارضِ مقدس کی طرف ہجرت کرنے اور وہاں نئی زندگی شروع کرنے کے لیے سرمایہ بھی فراہم کیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے ریاستِ اسرائیل کے قیام کے لیے جو خط لکھا، وہ روتھ چائلڈ خاندان کے نام ہی تھا۔ اس خط کو تاریخ میں 'اعلانِ بالفور' (Balfour Declaration) کہتے ہیں۔

صیہونی تحریک کا قیام

۱۸۸۰ء میں 'صہیونی تحریک' (Zionism) دنیا کے سامنے آئی۔ 'صہیون' ارضِ فلسطین میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ 'صہیونیت' سے مراد وہ یہودی اور غیر یہودی افراد اور تنظیمیں ہیں جو ریاستِ اسرائیل یعنی 'ارض موعودہ' کے حصول کے لیے عملی جد وجہد کر رہے ہیں۔ اس تحریک کی بنیاد سوئیزرلینڈ کے 'تھیوڈور ہرزل' (Theodor Herzl) نامی یہودی نے رکھی تھی۔ ہرزل نے ۱۸۹۶ء میں 'یہودی ریاست' (Der Judenstaat) کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے لیے ایک عملی نقشہ پیش کیا۔ اس کتاب میں اس نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اگلے پچاس سالوں میں یہودی ریاست معرضِ وجود میں آجائے گی اور ایسا ہی ہوا۔

یروشلم میں یہودیوں کی خفیہ آباد کاری (ایلیاہ کا عقیدہ)

۱۸۸۲ء میں صہیونی تحریک کے 'جوزف فیان برگ' اور روتھ چائلڈ خاندان کے سربراہ 'ایڈمنڈ ڈی روتھ چائلڈ' (Edmond de Rothschild) نے یہودیوں کو خفیہ طریقے سے فلسطین میں آباد کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کام کے لیے درپیش سرمایہ روتھ چائلڈ نے فراہم کیا اور خود فلسطین کے کئی خفیہ سفر کیے۔ روتھ چائلڈ کے ایجنٹوں نے خوابِ خرگوش میں سوئے مسلمانوں سے زمینیں خریدنا شروع کردیں اور جب انھیں ہوش آیا اور مزاحمت شروع کی تو اس وقت تک فلسطین برطانیہ کے قبضہ میں جاچکا تھا اور ریاستِ اسرائیل کا قیام منظور ہو چکا تھا۔

اعلانِ بالفور؛ ریاستِ اسرائیل کے قیام کا اعلان (عقیدہ ارض موعودہ)

۱۹۱۷ء میں پہلی جنگِ عظیم کے موقعہ پر روتھ چائلڈ خاندان کے سربراہ 'ایڈمنڈ' نے ...... جو اس وقت برطانیہ کے بیت الامراء کا رکن بھی تھا...... برطانوی وزیر خارجہ 'بالفور' کو ایک خط لکھا۔ ہم اس خط کا متن ذیل میں دے رہے ہیں:

''عزیز مسٹر بالفور!

جمعہ کے دن میں ایک عرض کرنا بھول گیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو وزیر اعظم کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہیے۔ گزشتہ کئی ہفتوں سے سرکاری اور نیم سرکاری جرمن اخبارات کافی بیانات شائع کر رہے ہیں۔ ان میں کہا جا رہا ہے کہ امن مذاکرات میں مرکزی قوتوں کو یہ شرط عائد کرنی چاہیے کہ جرمنی کی تحویل میں فلسطینی

علاقہ کو 'یہودی بستی' قرار دیا جائے۔ میں نہایت اہم سمجھتا ہوں کہ برطانوی اعلان کو کسی ایسی ہی تحریک کا ذریعہ بننا چاہیے۔ اگر آپ نے اپنے وعدے کے مطابق میری ملاقات کا انتظام کر دیا ہے تو از راہِ کرم مسٹر 'وائیزمین' (برطانوی وزیر اعظم) کو مطلع کر دیں۔

آپ کا مخلص روتھ چائلڈ''

اس خط کا جواب جو بالفور نے دیا، وہ تاریخ میں 'اعلانِ بالفور' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہی اعلان بالفور دراصل برطانیہ کی جانب سے 'عظیم تر اسرائیل' کی منظوری تھی۔ ہم اس خط کا متن بھی یہاں پیش کرتے ہیں۔

''دفتر خارجہ

۲ نومبر ۱۹۱۷ء

عزیز لارڈ روتھ چائلڈ

آپ کو مطلع کرتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ہز میجسٹی (شاہِ برطانیہ) کی حکومت نے یہودی صہیونی خواہشات کے ساتھ ہمدردی کا درج ذیل اعلان ارسال کیا ہے اور کابینہ نے اس کی توثیق کر دی ہے۔

ہز میجسٹی کی حکومت یہودی عوام کے قومی وطن کے قیام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے اور اپنی تمام تر کوشش اس مقصد کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے صرف کرے گی۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ لی جائے کہ کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جائے گا جو فلسطین میں موجود یہودی برادری کے شہری اور مذہبی حقوق کے لیے نقصان دہ ہو یا کسی دوسرے ملک میں یہودیوں کے حقوق اور سیاسی حیثیت کو متاثر کرے۔

میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ یہ اعلان 'صہیونی فیڈریشن' کے علم میں لے آئیں۔

آپ کا مخلص آرتھر جے بالفور۔

گریٹ گیم یا خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ

گریٹ گیم کی تفصیل تو ان شاء اللہ ہم آئندہ آنے والے ابواب میں ذکر کریں گے، یہاں مختصر ساذکر کر رہے ہیں۔ ریاستِ اسرائیل کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خلافتِ عثمانیہ تھی کیونکہ فلسطین ان کے قبضے میں تھا۔ خلیفۂ ثانی امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فلسطین کو فتح کرتے ہوئے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا، اس میں یہ شرط موجود تھی کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اسی بنا پر جب یہودیوں کے خفیہ وفد نے عثمانی خلافت کے آخری طاقتور سلطان 'عبدالحمید' سے بھاری رشوت کے عوض یہ درخواست کی کہ وہ انھیں فلسطین میں آباد ہونے دیں تو انھوں نے تمام تحائف واپس کرتے ہوئے سختی سے انکار

کیا۔ اس وقت یہودیوں کو یہ یقین ہو گیا کہ سلطنتِ عثمانیہ کو توڑے بغیر وہ اپنا خواب پورا نہ کر سکیں گے۔ سلطنتِ عثمانیہ زوال پذیر تو پہلے سے ہی تھی، ایک طرف سے برطانیہ اور فرانس اور دوسری طرف سے روس مسلسل اسے کمزور کر رہے تھے۔ انھوں نے مختلف سازشوں کے ذریعے پہلے اسے یورپ میں کمزور کیا۔ ان میں آرمینہ، بوسنیا، بلقان کی سازشیں شامل ہیں۔ پھر شام اور لبنان میں بھی یہ تینوں طاقتیں عیسائی مسلم فسادات کروا کر اور حقوقِ انسانی کے نعرے لگا کر کانفرنسوں میں ان عیسائیوں کی آزادی کی بات کرتی رہیں۔ یہ پچاس سال کی سازشیں اور جنگیں تھیں جس کے نتیجے میں یورپ میں عثمانی اقتدار بہت کمزور ہو گیا۔ پھر بلقان کی جنگ اور اس کے بعد 'جنگ عظیم اول' میں سازشوں اور خفیہ معاہدات کے ذریعے مسلمانوں کی مرکزیت کو ختم کر دیا گیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ نے عربوں کو قومی اور نسلی عصبیت کی بنیاد پر کھڑا کر کے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا اور عرب کو عالمِ اسلام پر دوبارہ حکمرانی کے خواب دکھائے۔ موجودہ اردن کے بادشاہ عبداللہ بن حسین کے والد کا پردادا حسین بن علی سلطنتِ عثمانیہ کے تحت حجاز کا حاکم تھا، جسے شریفِ مکہ کہا جاتا تھا۔ انگریز نے اس سے اور بعد میں اس کے بیٹوں شاہ فیصل اور شاہ عبداللہ سے اس شرط پر شام اور عراق کی حکومت دلانے کا وعدہ کیا کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کریں۔ اس کے عوض انھیں ماہانہ ۲۵ ہزار پاؤنڈ سونے کی شکل میں گرانٹ رشوت کے طور پہ دی جاتی تھی۔ عرب کو خلافتِ عثمانیہ کے خلاف ابھارنے کا کام برطانیہ کی خفیہ ایجنسی کے کرنل لارنس نے کیا جو ''لارنس آف عریبیہ'' (Lawrence Of Arabia) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس طرح عرب اور سلطنتِ عثمانیہ کے درمیان جنگ ہوئی جس سے فلسطین کا علاقہ برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں 'مصطفی کمال اتاترک' نے خلافتِ عثمانیہ ختم کرنے کا اعلان کیا اور جمہوری قومی حکومت قائم کر دی۔

فلسطین برطانیہ کے انتداب میں

پہلی جنگ عظیم کے بعد قائم ہونے والی ''لیگ آف نیشنز'' (League Of Nations) نے برطانوی حکومت کو یہ اختیار دیا کہ وہ فلسطین کا انتظام سنبھالنے کے لیے اسے انتداب میں لے۔ 'لیگ آف نیشنز' کو دوسری جنگِ عظیم کے بعد ختم کر کے 'اقوامِ متحدہ' بنائی گئی اور فلسطین کو اقوامِ متحدہ کے تحت اسی طرح برطانوی انتداب میں رکھا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ نے 'اقوامِ متحدہ پارٹیشن پلان' پیش کیا جس کے تحت ۵۵ فیصد علاقے یہودیوں کو اور ۴۵ فیصد علاقہ عرب کو دینا منظور ہوا جبکہ یروشلم (بیت المقدس) کو بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔ اس پلان کو ''ڈیوڈ بن گوریون'' (Ben-Gurion) نے فوراً قبول کر لیا جبکہ عرب لیگ نے مسترد

کر دیا۔ مئی ۱۹۴۸ء میں انتداب کی میعاد ختم ہوتے ہی اقوامِ متحدہ کے پلان کے مطابق برطانیہ نے اپنا زیرِ انتداب علاقہ اسرائیل کے حوالے کر دیا اور بن گوریون نے ریاستِ اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اگلے دن مصر، شام، عراق، لبنان اور مقامی عربوں نے جنگ کی جو ۱۳ ماہ تک جاری رہی۔ یہ پہلی عرب اسرائیل جنگ تھی، جو بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہو گئی۔

۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے مصر کی جانب سے حملے کے خوف کا بہانا بناتے ہوئے جنگ چھیڑ دی۔ یہ ۶ روزہ جنگ تھی جس کے نتیجے میں اسرائیل نے موجودہ مصر کے علاقے صحرائے سیناء، موجودہ فلسطین کے علاقے غزہ، موجودہ شام کے علاقے گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۷۳ء میں مصر اور شام نے مل کر حملہ کیا جس کے نتیجے میں صحرائے سیناء اور گولان پہاڑی کا کچھ حصہ واپس لے لیا۔

۱۹۷۸ء میں 'کیمپ ڈیوڈ' کا معاہدہ (Camp David Accords) ہوا جو اسرائیل کے وزیرِاعظم 'بیگن' (Menachem Begin) اور مصر کے صدر 'انور السادات' (Anwar al-Sadat) کے درمیان امریکی صدر 'جمی کارٹر' (Jimmy Carter) کے کہنے پر ہوا جس کے تحت اسرائیل صحرائے سیناء دوبارہ مصر کو دینے پر راضی ہوا اور فلسطین کی مغربی پٹی اور غزہ سے دستبردار ہونے کا اعلان کیا۔ اس معاہدے کے بدلے مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔

جون ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے لبنان پر حملہ کر دیا تاکہ جنوبی طرف سے حملے روکے جا سکیں۔ اگست ۱۹۸۳ء میں وہاں سے نکل کر اسے ایک امتیاتی علاقہ قرار دے دیا۔

نومبر ۱۹۸۸ء کو آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

اگست ۱۹۹۳ء کے 'اوسلو معاہدے' (Oslo Accords) میں آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کو تسلیم کیا گیا مگر یہ ریاست آزاد نہ وجداگانہ حیثیت سے ابھی تک وجود میں نہیں آئی۔

تاریخِ یہود کا تجزیہ

یہود کی اس مختصر تاریخ کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہودیوں کی تاریخ کے دو حصے ہیں؛ ایک قدیم تاریخ اور دوسری جدید تاریخ۔ یہودیوں کی قدیم تاریخ صرف یہودیوں کی ہی تاریخ نہیں ہے بلکہ یہ بنی اسرائیل کے مسلمانوں اور ان کے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ بھی ہے۔ یہ تاریخ بنی اسرائیل کے گمراہ لوگوں اور ان کی گمراہی کی وجوہات بتانے والی تاریخ بھی ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل مسلمان

سے یہودی کیسے بنے؟ بنی اسرائیل کی گمراہی کی وجوہات شرک، بدعت، علمائے سوء کی اندھی پیروی اور اخلاقی خرابیاں ہیں۔ ان علمائے سوء نے دین حق کے ماخذ میں ہی تبدیلی اور تحریفات کر دیں جس کو بنی اسرائیل کی اکثریت نے مان لیا۔ جب کسی دین کے ماخذ پر سوالیہ نشان لگ جائے اور لوگ اس کو مان لیں تو وہ دین دین ہی نہیں رہتا، بلکہ انسان علمائے سوء کی خواہشات کے مطابق چلنا شروع کر دیتا ہے اور انھیں رب کی جگہ دے دیتا ہے۔ یہی کچھ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا، یہاں تک کہ آخری دور میں ان کے علمائے سوء نے......جو فریسی علماء کہلاتے تھے......نہ صرف انبیاء کی کھل کر مخالفت شروع کر دی بلکہ انھیں قتل کروانا بھی شروع کر دیا۔ انھی وجوہات کی بنا پر بنی اسرائیل اللہ کی مغضوب قوم بن گئی اور اللہ نے انھیں فلسطین سے نکال دیا۔

مگر جدید تاریخ میں ان کے علماء نے اس پوری تاریخ کو نئے اور دوسرے رنگ کے ساتھ پیش کرنا شروع کر دیا۔ وہ اسی طرح اللہ کی چہیتی قوم کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرتے رہے۔ انھوں نے یہودیوں کو یہ باور کروانا شروع کر دیا کہ فلسطین کی زمین اللہ نے ان کو عطاء کر دی ہے اور یہ باور کرایا کہ دعائے دانیال کے تحت مسیحا کی پیشین گوئی ابھی پوری نہیں ہوئی، وہ ابھی آئے گا، ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرے گا اور پوری دنیا پر بلا شرکت غیر حکومت کرے گا۔ یہ عقائد ہی جدید دنیا میں یہودیوں کی زندگی کا مقصدِ عظمیٰ بن گئے۔ جدید دنیا میں یہودی جہاں بھی رہے، چاہے مسلم دنیا میں یا عیسائی یورپ میں، وہ ایک قوم کی حیثیت سے اسی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے یہودیوں کی جدید تاریخ اپنے خود ساختہ مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کا تسلسل ہے۔

یہود کا مقصدِ عظمیٰ اور ان کو در پیش عملی مشکلات

گو یہودی اپنی قدیم تاریخ کو واپس لانا چاہتے تھے کیونکہ وہ اسی کے ساتھ وابستہ تھے، لیکن فلسطین سے نکلنے کے بعد وہ دربدر پھرتے رہے۔ ایک طرف رومیوں کے عیسائیت قبول کرنے کی وجہ سے عیسائی دنیا ان کے لیے تنگ ہو گئی تھی تو دوسری طرف اسلام کے ظہور سے ان کے مسائل میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اب ان کے ایک کی جگہ دو دشمن ہو گئے تھے۔ اس طرح اپنی جدید تاریخ میں یہودیوں کی عملی مشکلات بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ ہم ان مشکلات کو درج ذیل تین عنوانات کے تحت ذکر کرتے ہیں:

- یہودیوں کی قلتِ تعداد
- مسلمان اور عیسائی، یہودیوں کے مضبوط دشمن
- یہودیوں کے خلاف مضبوط معاشرتی نظام

یہودیوں کی قلتِ تعداد

یہود کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کی تعداد دنیا میں بہت کم ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کا نسلی دین ہے۔ یہودی وہی ہو سکتا ہے جو بنی اسرائیل کی نسل میں سے ہو۔ اس کے علاوہ چاہے کوئی شخص ان کے عقائد کو سچا مانے یا انھیں اپنائے، یہودی نہیں بن سکتا۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے چنیدہ لوگ (chosen people) کہتے ہیں جسے قرآن ﴿نَحۡنُ أَبۡنَـٰٓؤُاْ اللّٰهِ وَأَحِبَّـٰٓؤُهُ﴾ (مائدہ: ۱۸) کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔ اس بنا پر یہودی اپنے دین کی طرف دعوت دینے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ یہ یہودیوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور اپنی اس کمزوری سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ انھیں اچھی طرح علم ہے کہ وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کا مقابلہ اپنی افرادی قوت کے زور پر نہیں کر سکتے اور انھیں اپنا مقصدِ عظمیٰ حاصل کرنے کے لیے جو افرادی قوت درکار ہے، وہ ان کے پاس موجود نہیں ہے۔

مسلمان اور عیسائی، یہودیوں کے مضبوط دشمن

بیت المقدس سے نکلنے کے بعد جدید تاریخ میں یہودیوں کی دوسری بڑی مشکل ان کے دو بڑے دشمن تھے۔ ایک روایتی رومن کیتھولک عیسائی اور دوسرے مسلمان۔ یہودیوں کے خلاف پہلی رکاوٹ یہ تھی کہ عیسائی انھیں (نعوذ باللہ) قتلِ عیسیٰ عَلَیۡہِ السَّلَام کا مجرم ٹھہراتے تھے اور کسی بھی صورت معاف کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس لیے انقلابِ فرانس تک یورپ میں یہودیوں کی یہ حالت تھی کہ نہ تو انھیں کسی سرکاری محکمہ میں نوکری کی اجازت تھی اور نہ ہی وہ عیسائی آبادیوں میں رہ سکتے تھے۔ یہودیوں کی اس حالت کو مؤرخین نے رومی کلیساء کے بنائے ہوئے ''باڑے میں بند'' ہونے سے تشبیہ دی ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے یہودیوں کو سب سے پہلے عیسائیوں کے بنائے ہوئے اس باڑے سے نکلنا ضروری تھا۔ یہودیوں کے لئے دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ یہودیوں کی طرح عیسائی بھی فلسطین پر اپنا حق سمجھتے تھے۔

مسلمانوں کی طرف سے انھیں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ قرآن کی ہدایت کی روشنی میں مسلمان یہودیوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اور انھیں اپنے ماتحت ذمی کی حیثیت دیتے تھے۔ دوسری طرف یہودی جانتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے فلسطین کی کیا حیثیت ہے؟ مسلمان مسجدِ اقصیٰ کو شعار اللہ اور قبلہ اول مانتے ہیں اور انبیاء کی سرزمین کے یہود سے بڑھ کر حق دار ہیں۔ مسلمانوں کے لیے صرف یہ مسئلہ نہیں کہ وہ کسی ایسے خطۂ ارض سے دست بردار نہیں ہو سکتے جہاں کسی زمانے میں کچھ مدت کے لیے ان کا اقتدار رہا ہو اور وہ خطہ 'دار الاسلام' کہلایا گیا ہو، بلکہ جس ہیکل کو یہودی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، وہ مسلمانوں کے قبلۂ اول مسجدِ اقصیٰ

کے انہدام سے ہی ممکن ہے۔ اس کے انہدام کے ردِ عمل سے یہودی اب بھی خائف ہیں۔ لہٰذا عیسائی اور مسلمانوں کی دشمنی کے علاوہ تیسری مشکل یہ ٹھہری کہ سرزمینِ فلسطین کے دعویدار صرف وہ اکیلے نہیں، بلکہ عیسائی اور مسلمان بھی اپنے آپ کو ارضِ فلسطین کا حق دار سمجھتے ہیں۔ عیسائی فلسطین کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش قرار دیتے ہیں اور مسلمان مسجدِ اقصیٰ کے قبلہ اول ہونے اور فلسطین بطورِ انبیاء کی سرزمین اور دار الاسلام رہنے کی وجہ سے اسے اپنا سمجھتے ہیں۔ یہود کے لیے یہ دونوں اتنے مضبوط دشمن تھے کہ یہودی اکیلے ان دونوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

یہودیوں کے خلاف مضبوط سیاسی و معاشرتی نظام

یہودیوں کے سامنے تیسری قسم کی مشکل وہ نظام تھا جو عیسائی اور مسلمان دنیا میں چل رہا تھا۔ یہ نظام چاہے یورپی عیسائی دنیا میں ہو یا مسلمان دنیا میں، دونوں ہی جگہ اس بنیاد پر قائم تھا کہ حاکمیتِ اعلیٰ اللہ کی ہے اور زمین پر وہ اللہ کے نمائندے ہیں۔ یورپ کی پاپائی حکومتوں کا بھی یہی دعویٰ تھا اور مسلمانوں کی خلافت بھی اسی اصول پر قائم تھی۔ یہ عقیدہ اپنی جگہ اتنا مقبول تھا کہ دونوں امتوں کی عوام اس عقیدے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں سیاسی عقیدوں کی موجودگی میں وہ اپنی عالمی سلطنت قائم نہیں کر سکتے تھے کہ جس کا مرکز ارضِ موعودہ فلسطین ہو اور جس میں ان کے بقول وہ ہیکل بنا کر اپنے رب کی عبادت کریں گے۔ اس پاپائی نظام اور خلافتِ اسلامیہ کے معاشرتی نظام کی فطری ترتیب یہودیوں کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔

بنیادی طور پر دنیا میں دو قسم کے معاشرے آباد تھے؛ ایک زمین کی بنیاد پر زرعی معاشرہ اور دوسرا خون کی بنیاد پر قبائلی معاشرہ تھا۔ یہ معاشرے...... جس میں خاندان مرد کی قیادت میں قائم تھا اور جس میں قبیلے اور قبیلوں سے قومیں بنتی تھیں...... انتہائی مضبوط معاشرے تھے جو اپنے مفادات کی خود حفاظت کر سکتے تھے۔ یہ معاشرتی ترتیب یہودیوں کے لیے انتہائی خطرناک تھی کیونکہ یہ اتنی مضبوط تھی کہ کوئی ایک قبیلہ بھی اٹھ کر یہودیوں کو شکست دے سکتا تھا یا ان کے منصوبوں کے سامنے رکاوٹ پیدا کر سکتا تھا۔ پھر معاشرے کی ان اصل قوتوں کو قابو کیے بغیر یہودی کبھی عالمگیر حکومت قائم نہیں کر سکتے تھے۔

یہودیوں کا ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ وہ تاجر پیشہ تھے اور جہاں بھی جاتے وہاں سود در سود کا نظام قائم کر دیتے۔ یہ نظام کچھ عرصہ تو چلتا تھا مگر جب اس سودی نظام کی وجہ سے یہودی معاشروں کا خون تک چوسنا شروع کر دیتے تو یہی معاشرے ان کے خلاف کھڑے ہو جاتے، ان کا قتلِ عام کرتے، ان کے مال پر قبضہ کرتے اور بچ جانے

والوں کو جلاوطن کر دیتے۔ اس طرح تاریخ میں کئی دفعہ ہوا۔ یہودیوں کا بنایا ہوا سود در سود کا نظام تاریخ میں کئی دفعہ جڑ سے ختم کر دیا گیا۔

مقصدِ عظمیٰ حاصل کرنے کے لیے یہودیوں کی حکمتِ عملی

یہودیوں کی کتب اور ان کے خلاف کام کرنے والی تحریکات کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہودی اپنی مشکلات سے بخوبی واقف تھے۔ انھیں اپنی قلتِ تعداد کا بھی اچھی طرح علم تھا اور اپنے دشمنوں کی مضبوطی کا بھی صحیح اندازہ تھا۔ اس لیے انھیں عیسائی دنیا اور مسلمان دنیا میں اپنے ہم نواء بنانے تھے جو انھیں اپنے تینوں مقاصد کو حاصل کرنے میں مدد دیتے۔ پھر انھیں اپنے ان ہمنواؤں کی مدد سے رومن کیتھولک عیسائیوں کے بنائے ہوئے باڑے سے نکلنا تھا کیونکہ اس باڑے سے نکلے بغیر وہ کبھی بھی یورپ میں اپنا مقام حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ پھر اپنے ان ہم نواؤں کے ساتھ مل کر ان طاقتوں کو ہٹانا تھا جو ان کی اور ارضِ مقدس فلسطین کی راہ میں حائل تھیں اور فلسطین پر قبضہ کرنا تھا۔ پھر پوری دنیا کو غلام بنا کر اپنی عالمگیر حکومت قائم کرنی تھی۔ عالمگیر حکومت قائم کرنے کے لیے انھیں معاشرتی قوتوں کو توڑنا اور انہیں کمزور کرنا تھا۔ عالمی معیشت پر قبضہ کرنا اور پوری دنیا کو کنٹرول کرنا تھا۔ اس ساری بات کا مطلب یہ تھا کہ قدیم چلنے والا تمام نظام یہودیوں کے کام کا نہیں، انھیں پوری دنیا کی تنظیمِ نو کرنی ہے۔ یہی وہ تنظیمِ نو ہے جسے آج 'نیو ورلڈ آرڈر' یا 'دنیا کی نئی ترتیب' کہتے ہیں۔

یہودی کیا چاہتے تھے؟ اور کیا چاہتے ہیں؟ گو صہیونیت پر لکھی جانے والی ہر کتاب میں کچھ نہ کچھ ذکر ضرور ملتا ہے مگر سب سے جامع تفصیل ۱۹۰۵ء کی اس دستاویز سے حاصل ہوتی ہے جو روس کے ایک پادری کو ملی تھی اور جو آج ''صہیونی بڑوں کے ضابطے'' (Protocols of the Elders of Zion) کے نام سے مشہور ہے۔ اس دستاویز میں یہودیوں کے بڑوں نے اپنی پچھلی ایک سو سالہ کارکردگی پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے مستقبل کے منصوبوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ دستاویز بیان کرتی ہے کہ کیسے یہودیوں نے یورپ میں 'روشن خیالی' کے نام پر فکری ارتداد پھیلایا، یورپ کا قدیم نظام توڑا اور مستقبل میں وہ کس طرح معیشت کے ذریعے پوری دنیا پر اپنا نظام مسلط کریں گے۔ اگر ہم اس دستاویز کا باریک بینی سے مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ یورپ میں برپا لادینیت کی تحریک کو یہودیوں نے کس مہارت کے ساتھ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور انقلابِ فرانس کے بعد دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں میں کیسے کردار ادا کیا۔ ان باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہودی اور صہیونی تنظیموں نے یورپ اور امتِ مسلمہ میں مندرجہ ذیل قوتوں کو

ہدف بنایا:

ا۔ پہلی قوت مسلمان اور عیسائی عوام میں موجود یہ تصور تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی اصل حاکمِ اعلیٰ ہیں۔ یورپ میں یہ عقیدہ تھا کہ کلیساء اللہ کی حکومت ہے، پاپائے روم دنیا میں اللہ کا نمائندہ ہے اور بادشاہ پاپائے روم کا نمائندہ ہے۔ بادشاہ کا کام یہ ہے کہ وہ پاپائے روم کے احکامات کے مطابق......جو عیسائیوں کے بقول نعوذ باللہ اللہ کی طرف سے ہیں......لوگوں پر حکومت کرے جبکہ بادشاہ اور اس کے عوام کی زندگی کا مقصد اللہ کی رضاء کو حاصل کرنا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے حاکم 'خلیفہء مسلمین' کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کا نائب ہے اور اس کا کام اللہ کے احکامات کو نافذ کرنا اور لوگوں کو شریعت کے مطابق چلانا ہے[26]۔ حاکمیتِ اعلیٰ کے اس عقیدے کی موجودگی میں یہودی اپنے مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس عقیدے کو 'روشن خیالی' کی لادین تحریک کے ذریعے ختم کیا گیا۔

۲۔ دوسری قوت نسل اور قبیلہ کی تھی۔ پوری دنیا میں قبائلی نظام قائم تھا جو یورپ میں جاگیردارانہ نظام کی صورت میں موجود تھا۔ یہ نظام اصل میں قبائلی قوت کے ساتھ چلتا تھا، قبائلی قوت خاندان کے بل بوتے پر چلتی تھی اور خاندانی نظام کی قیادت مردوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نظام میں داخلی معاملات چلانے کے لیے قوتِ نافذہ کے اختیارات موجود تھے۔ یہ نظام جب تک قائم تھا، یہودیوں کے منصوبے کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ اس لیے اس نظام کو 'سرمایہ دارانہ جمہوریت' کے ذریعے 'آزادی' (Freedom) اور 'مساوات' (Equality) کے نعروں کی مدد سے توڑا گیا۔

---

[26] یہاں یہود کی راہ میں حائل تصورِ 'حاکمیتِ الٰہیہ' کا ذکر کرنا مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات و تعلیمات کے عین مطابق مسلمانوں میں خلافتِ اسلامیہ کی صورت میں موجود ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کے یہاں بھی یہ نظریہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اور وہ بھی یہود کی عالمگیر حکومت کے راستے کی رکاوٹ ہے لیکن یہ واضح رہے کہ عیسائیوں کا نظریہ ایک تحریف شدہ نظریہ ہے جس میں ایک مخصوص طبقے (یعنی پادریوں) کو عملاً الٰہی تعلیمات سے بالا بلکہ خود قانون ساز اور حلال حرام متعین کرنے والا سمجھا جاتا ہے اور یقیناً یہ ایک باطل نظریہ ہے۔ گویا عیسائیت عملاً دین کے لبادے میں انسانوں کو انسانوں کا غلام بناتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں حکمران، علماء اور عوام سب یکساں طور پہ اسی شریعت کے تابع ہوتے ہیں جو نبی ﷺ لے کر آئے اور انہیں خود بھی اس پر عمل کرنا ہوتا ہے اور عوام کو بھی اسی کے مطابق (نہ کہ اپنی خواہشات کے مطابق) چلانا ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خلافت سنبھالنے پر فرمانا ہے کہ اگر میں سیدھا چلوں (یعنی شریعت کے مطابق چلوں) تو میری مدد کرنا اور اگر میں ٹیڑھا ہوں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ سو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ درج بالا عبارت میں عیسائیوں کے نظریے کو اسلام کے نظریے کے مساوی ہرگز قرار نہیں دیا جا رہا بلکہ یہاں یہود کی راہ میں حائل ایک مشکل کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ (م ح)

۳۔ تیسری قوت 'زر کی قوت' تھی۔ یورپ میں یہودی عرصہ دراز سے وہاں کی معیشت پر حاوی تھے۔ عالمی معیشت پر قبضہ کرنے کے لیے انھیں سرمائے اور تجارت کا ایسا نظام چاہیے تھا جس میں تمام علاقوں کی معیشت عالمی سطح پر ایک دوسرے سے منسلک ہو[27]۔ یہ نظام صرف اس صورت میں بن سکتا تھا، جب سونے کو کرنسی (ثمن) کے طور پر ختم کر کے اس کی جگہ کاغذی کرنسی کو رائج کیا جائے اور کرنسی کی قدر کے تعین کا اختیار بینکوں کو دے دیا جائے اور بینک بھی وہ جو یہودیوں کے ہاتھ میں ہوں۔ سونے کو کرنسی کی قدر سے ہٹانے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہودی بینکوں کو لامحدود کرنسی خود چھاپنے کا اختیار مل جائے گا۔ اس طرح قدیم معاشی نظام ختم ہو جائے گا اور نئے معاشی نظام کے تحت علاقوں کی معیشت ایک دوسرے پر منحصر (Inter-dependant) ہو جائے گی۔ اس لامحدود کرنسی سے یہود دنیا کی پیداوار اور تجارت پر غالب آ جائیں گے اور دنیا پر حکومت وہ کرتا ہے جس کے ہاتھ میں خوراک کی پیداوار ہو۔ کرنسی لامحدود ہونے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اب 'یہودی بینک' فرد، کمپنیوں اور ملکوں کو سودی قرضہ فراہم کر کے ان کو اپنا غلام بنائیں گے۔ یوں کرنسی کا یہ اختیار تجارت پر قبضے میں بھی مدد دے گا اور ایک عسکری آلہ کا کام بھی دے گا۔ دوسری طرف یہودی اس لامحدود کرنسی سے تمام سونے کے ذخائر خرید لیں گے۔ چنانچہ کرنسی کی قدر کو کنڑول کرنے کا اختیار حاصل کرنے، سونے کے ذخائر کو جمع کرنے اور ملکوں کی معیشت کو عالمی سطح تک آپس میں منسلک کرنے سے دنیا کی معیشت ان کے قبضے میں آ جائے گی۔ اس معیشت کو وہ جب چاہیں تجارت کے لیے اور جب چاہیں عسکری آلے کے طور پر استعمال کریں۔ نیو ورلڈ آرڈر کا معاشی نظام اور جنگِ عظیم دوم کے بعد قائم ہونے والا معاشی نظام ...... جسے 'جدید منڈی کی معیشت' (Market Economy) کہتے ہیں...... دونوں اس پورے یہودی نظام کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس نظام کے بارے میں ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

---

[27] اسے Economic Integration کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقامی اور ملکی معیشت کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کیا جائے، یہاں تک کہ عالمی سطح تک معیشت کا ایک نظام قائم ہو اور اس کے نتیجے میں 'عالمی سرمایہ' (Global Capital) پیدا ہو۔ بظاہر اس نظام میں تمام ملکوں کو معیشت کے باب میں ایک خوش کن معاشی ترقی نظر آتی ہے، لیکن اس کے نتیجے میں عالمی سطح پر بیٹھے یہودی سرمایہ دار کمپنیاں اور افراد عالمی سرمایے کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں جس کے خطرناک اثرات کی طرف اوپر کی سطور میں اشارہ کر دیا گیا ہے۔ (م ح)

یہودیوں کے خفیہ منصوبے

ریاستِ اسرائیل کے قیام کے لیے کوشاں یہودیوں کی مشکلات اور ان کے اختیار کردہ منصوبوں پر بہت سے پردے ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم اسلامی دنیا اور یورپ کی تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کے شواہد صراحت کے ساتھ مل جاتے ہیں کہ بہت سے تاریخ دانوں، یورپ کے سیاست دانوں اور عیسائی دنیا کے بااثر طبقے نے بارہا اپنی حکومتوں کے سامنے یہودیوں کی ان خفیہ سرگرمیوں کی نشان دہی کی جو وہ عیسائی دنیا کے خلاف کر رہے تھے۔ یورپ کی مختلف عیسائی حکومتوں نے ان پارٹیوں اور خفیہ تنظیموں کے خلاف کارروائیاں بھی کیں۔ اسی قسم کی ایک کاروائی کا ذکر چودھویں صدی عیسوی میں فرانس کے مشہور عیسائی بادشاہ 'فلپ دی فیئر' (Philip IV, The Fair) کی تاریخ میں ملتا ہے۔ بادشاہ فلپ نے پیرس میں اچانک ہی 'نائیٹز ٹیمپلر' (Knights Templar) کے مرکز پر پولیس کریک ڈاؤن کیا اور وہاں پر موجود تمام نائٹ سپاہیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان سپاہیوں کا اس انداز میں گرفتار کیا جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ 'نائیٹز ٹمپلر'، صلیبی جنگوں کے ہیرو تھے اور ان کی خاص مذہبی اہمیت تھی۔ گرفتار شدہ نائیٹ سپاہیوں پر مذہبی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ ان پر ایک الزام یہ تھا کہ انھوں نے صلیب کی بے حرمتی کی ہے اور دوسرا یہ تھا کہ یہ شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ 'نائیٹز ٹمپلر' یہودی تھے جو جھوٹے صلیبی بن کر فلسطین پر حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ گئے تھے اور وہاں انھوں نے بے جگری سے لڑتے ہوئے بہت سے فوجی کارنامے بھی انجام دیے تھے، لیکن ان کا اصل مقصد عیسائیت کا عروج نہیں بلکہ یہودیوں کے لیے ریاستِ اسرائیل کی راہ ہموار کرنا تھا۔

'نائٹز ٹمپلر' کا دوسرا سراغ اسی دور میں سکاٹ لینڈ میں ملا جب فرانس کے بادشاہ فلپ کے عتاب سے بچ کر نکلنے والے نائٹ سپاہیوں نے بادشاہ 'بروس' (Robert Bruce) کے ہاں پناہ لی۔ سکاٹ لینڈ کا بادشاہ بروس ان دنوں انگلستان کے بادشاہ 'ایڈورڈ اول' (Edward I) کے ساتھ جنگ کر رہا تھا۔ اس نے اس شرط پر ان نائٹ سپاہیوں کو پناہ دی کہ وہ اس جنگ میں اس کی مالی مدد کریں گے، جس پر نائٹ تیار ہو گئے۔ بعد ازاں بادشاہ بروس نے یہ جنگ جیت لی اور سکاٹ لینڈ انگلستان سے آزاد ہو گیا۔ نائٹز ٹمپلر سکاٹ لینڈ میں اپنی تنظیم کو آگے بڑھاتے رہے۔ یہودی خفیہ کارروائیوں کا ایک اور ریکارڈ اٹھارویں صدی عیسوی میں ملتا ہے جب 'فری میسن' (Free Mason) نام کی ایک تحریک سامنے آئی۔ اس لفظ کا مطلب ہے 'آزاد معمار'۔ فری میسن کی تحریک کی بنیاد یہودیت ہی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکلِ سلیمانی کو تعمیر کرنے کے لیے حضرت

سلیمان علیہ السلام کو ایک ایسے معمار کی ضرورت تھی جو لوہے کو بغیر آواز کے کاٹ سکے۔ 'آبیف آہیرم' نامی ایک شخص 'ماسٹر میسن' یعنی بڑا معمار تھا جس کے پاس جیو میٹری کا علم تھا اور جو لوہے کو بغیر آواز کے کاٹ سکتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے آبیف آہیرم کو ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کے لیے ماسٹر میسن یعنی بڑا معمار مقرر کیا تھا۔ ہیکل کی تعمیر کے بعد ایک سازش کے تحت اس ماسٹر میسن کو قتل کر دیا گیا۔ اس ماسٹر میسن کے پاس ہیکل کا خفیہ ہندساتی نقشہ ہے۔ اس لیے یہ ماسٹر میسن دوبارہ آئے گا اور اس کی نگرانی میں ہیکل دوبارہ تعمیر ہو گا۔ اب فری میسنز کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس میسن کی آمد کے لیے حالات کو سازگار بنائیں، یعنی اپنی سازشوں سے ایسے حالات پیدا کریں جس سے دنیا پر براہِ راست اور بلاواسطہ ان کا قبضہ قائم ہو جائے۔ فری میسنز تحریک کے تحت بہت ساری خفیہ و نیم خفیہ تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ نیم خفیہ سے مراد ایسی تنظیمیں ہیں جن کا بظاہر مقصد تو کچھ اور ہے مگر جوں جوں انسان ان تنظیموں میں آگے بڑھتا جاتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل ان کے مقاصد وہی ہیں جو فری میسنز نے مقرر کیے ہیں۔ ان میں سے دو مشہور تنظیمیں 'لائنز' (International Association of Lions Clubs) اور 'روٹری کلب' (Rotary International) ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں امریکہ اور یورپ میں بہت سی کتابیں اور بہت سی بااثر شخصیات سامنے آئیں جنھوں نے یہودیوں کی خفیہ سازشوں کو بے نقاب کیا۔ ان میں امریکہ کا صدر 'ابراہم لنکن' (Abraham Lincoln)، امریکہ کی مشہور زمانہ 'فورڈ موٹر کمپنی' (Ford Motor Company) کا مالک 'ہنری فورڈ' (Henry Ford) اور جرمنی کا حکمران 'ہٹلر' (Adolf Hitler) شامل ہیں۔ انھوں نے یورپ پر یہودیوں کے اثر اور عالمی معیشت پر ان کے قبضے پر گہری تشویش کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کتاب...... جو دنیا کے سامنے یہود کی سازشوں اور منصوبوں کو آشکارا کرتی ہے...... وہ 'پروٹوکولز' یعنی 'کبارِ صہیون کے مواثیق اور ضابطے' ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ یہودیوں کی اسی قسم کی مشکلات اور منصوبوں کی تفصیلات 'جان لارنس' (John Lawrence Reynolds) کی مشہورِ زمانہ کتاب ''خفیہ تنظیمیں'' (Secret Societies) اور 'والٹر لیکر' (Walter Laqueur) کی کتاب ''تاریخِ صہیونیت'' (A History of Zionism) میں بھی نہایت واضح انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

یہودیوں کی ان چالبازیوں اور منصوبوں کے بارے میں گزشتہ ایک صدی میں مسلمان اور عیسائی مورخین نے بہت سے نظریات... ثبوت اور دلائل کے ساتھ... رقم کیے ہیں۔ ان نظریات کی بنیاد یہ ہے کہ یہودی فلسطین کی جلاوطنی کے بعد سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس جدوجہد میں تمام ہی اقسام کے یہودی شریک رہے؛ وہ راسخ العقیدہ یہودی بھی جو مسیحا کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ مسیحا کی آمد پر یہودیوں کے مسائل حل ہو جائیں گے، اور وہ بھی جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں مسیحا کی آمد کا انتظار نہیں کرنا بلکہ اس کے آنے کی راہ ہموار کرنے کی جدوجہد جاری رکھنی ہے۔ پھر وہ یہودی جو مسیحا کی آمد کی راہ ہموار کر رہے ہیں، ان میں بھی دو گروہ پائے جاتے ہیں؛ ایک راسخ العقیدہ یہودی جو تلمود کے احکامات پر عمل کر کے اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں جبکہ دوسرا گروہ 'صہیونی یہودیوں' پر مشتمل ہے۔

یہ دونوں گروہ بنی اسرائیل کے دو قدیم فرقوں ہی کا تسلسل ہیں جن میں سے ایک فرقہ مکمل طور پر 'بعل' دیوتا اور 'عستارات' دیوی کی پرستش میں مبتلا تھا اور دوسرا فرقہ 'فریسی' علماء کا تھا جو حضرت داؤد عَلَیْہِ السَّلَام کی نسل سے مسیحاء کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ ان دونوں فرقوں کے لیے حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام ناقابل قبول تھے، کیونکہ ایک نظریہ کے مطابق بنی اسرائیل کا مشرک گروہ جو بعل دیوتا کی پرستش کرتا تھا، اس نے جان بوجھ کر حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے مقابلے میں شیطانی قوتوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں دو قوتوں یعنی خیر کی قوت 'خدا' اور شر کی قوت 'شیطان' کا وجود ہے اور انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ان دونوں میں سے جس کا چاہے ساتھ دے۔ درحقیقت وہ جس مسیحا کے انتظار میں ہیں، وہ شیطان کی طرف سے آنے والا 'دجال' ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو خفیہ تنظیمیں قائم کر کے یہودیوں کے لیے فلسطین کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

بنی اسرائیل کا دوسرا فرقہ ......جو فریسی علمائے سوء کی بدولت بگاڑ کا شکار ہوا...... نبی آخر الزمان اور مسیحا کا انتظار کر رہا تھا مگر حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کو جھٹلانے کے بعد مکمل طور پر گمراہ ہو گیا۔ اس فرقے کے پاس انبیاء کی روایتوں کے ذریعے آخری زمانے کی روایتیں پہنچ چکی تھیں اور انھیں معلوم تھا کہ ایک مسیح نے آنا ہے جو دنیا میں ایک طاقتور حکومت قائم کرے گا۔ اب چونکہ یہ یہودی خود بگڑے ہوئے تھے اور انھیں راست بازی سے نفرت تھی لہٰذا انھوں نے 'مسیح اللہ' سے دشمنی مول لی اور اب وہ مسیح الدجال کو ہی مسیح آخر الزمان قرار دے رہے ہیں۔ یہ گروہ مسیحا کی آمد کے لیے راہ ہموار کرنے کے بارے میں مشرک یہودیوں کے ساتھ متفق بھی ہے اور ان کے ساتھ بھرپور تعاون بھی کرتا ہے۔

پس یہ دونوں گروہ چاہے مشرک ہوں یا بگڑے ہوئے یہودی، اب 'صہیونی تحریک' سے وابستہ ہیں اور ان کے پیشِ نظر وہی تین مقاصد ہیں جو پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ البتہ صہیونیت ان مقاصد کی تکمیل کے لیے بہت ساری خفیہ تنظیموں کا سہارا لیتی ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ ان تمام قوی حقائق کے باوجود ان کے گرد چھائے ہوئے پُر اسراریت کے پردوں کے سبب یہاں انھی پر تکیہ نہیں کیا جا رہا بلکہ وہ چالبازیاں اور منصوبے بھی ذکر کیے جا رہے ہیں جو ہر ایک پر عیاں ہیں اور جن کے شواہد و دلائل اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔

یہودیوں کی اعلانیہ سازشیں

یہود کی تاریخِ جدید پر ایک نظر ڈالی جائے تو گزشتہ دو ہزار سال میں ان کی دینِ حق سے دشمنی، اس کے خلاف سازشیں، لوگوں کو گمراہ کرنے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کے تذکرے تاریخ کے صفحات میں آج بھی محفوظ ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دینِ حق میں تحریفات کرنے میں سینٹ پال کا کردار، شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی سازش تیار کرنے والا یہودی عبداللہ بن سباء، یورپ میں مارٹن لوتھر کی پروٹیسٹنٹ تحریک سے یہودیوں کے تعلق، یورپ میں کلیساء کے خلاف روشن خیالی کی تحریک برپا کرنے میں یہودی فلسفیوں کا کردار، انقلابِ فرانس برپا کرنے میں یہودیوں کا کردار، جدید بینکوں، کرنسی اور جدید معیشت پر قبضے میں یہودی خاندانوں کی سازشیں، یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام کے قیام میں یہودیوں کی کاوش، روس کے اشتراکی انقلاب میں یہودیوں کا کردار، خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے میں یہودیوں کا ہاتھ اور آج امریکہ کے ہر شعبے میں یہودیوں کا تسلط ایسے کھلے شواہد ہیں کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہودیوں کی سازشیں خفیہ ہوں یا اعلانیہ، ان کا مدعا و مقصد ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ دورِ جدید میں یہودی اپنی قدیم تاریخ کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ آج کے 'نیو ورلڈ آرڈر' کا نظام بھی دراصل یہودیوں کی قدیم تاریخ کو پھر سے واپس لانے کا نام ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر یہودیوں اور ان کے ہم نواؤں کی تخلیق ہے۔ اولڈ ورلڈ آرڈر ہو یا نیو ورلڈ آرڈر امتِ مسلمہ کے دشمن ایک ہی ہیں۔ (ہم ان تمام سازشوں پر آئندہ ابواب میں بھی روشنی ڈالیں گے ان شاء اللہ۔)

تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہودیوں نے یورپ میں کلیساء کے خلاف پیدا ہونے والے ردِ عمل کو اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے بہترین طریقے سے استعمال کیا۔ تاہم اس سے قبل کہ ہم اس بات کی تفصیل میں جائیں کہ یہودیوں نے اس سے کیسے فائدہ اٹھایا، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یورپ میں عیسائیت کیسے عروج پر آئی؟ عیسائیت نے یورپ میں کیا نظام قائم کیا؟ اس نظام میں کیا خرابی تھی؟ اس خرابی کے خلاف یورپ میں کیا رد

عمل پیدا ہوا؟ کلیساء کے خلاف رد عمل نے یورپ میں کیا فکری تبدیلیاں پیدا کیں؟ ان فکری تبدیلیوں سے یہودیوں نے کیسے فائدہ اٹھایا؟ یہودیوں نے عیسایوں کا قائم کردہ باڑہ کیسے توڑا؟ یورپ میں حقوقِ انسانی کی جنگ کیسے شروع ہوئی اور یہودیوں نے اس سے کیونکر فائدہ اٹھایا؟ صلیبی صہیونی اتحاد کیسے بنا؟ یہودیوں نے یورپ کے معاشرتی نظام کو کیسے توڑا؟ یہودیوں نے عالمی معیشت پر قبضہ کیسے کیا؟ آج یہودی عالمی معیشت کو ایک 'حربی آلے' کے طور پر کیسے استعمال کر رہے ہیں؟ اقوامِ متحدہ کے تحت یہودیوں کی عالمی حکومت کیسے بنی اور اس کا منصوبہ کیا ہے؟ ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے ہم آئندہ ابواب کی طرف بڑھتے ہیں۔

باب دوم

اولڈ ورلڈ آرڈر اور تاریخِ مغرب

جب بھی ہمارے سامنے یورپ، امریکہ یا مغرب کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں تو فوراً ہمارے ذہن میں عیسائیت کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے، پھر 'صلیبی جنگوں' کا تصور ابھرتا ہے جس میں گھوڑے پر سوار صلیبی نائٹ (سپاہی) ارضِ مقدس کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آج سے دو سو سال پہلے تو شاید یہ تصور بالکل صحیح ہو مگر دورِ جدید میں یہ تصور انتہائی نامکمل ہے۔ ان دو سو سالوں میں یورپ اور امریکہ میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں۔ اس غلط تصور کی وجہ سے مسلم دنیا میں مغرب کو سمجھنے میں کمزوری رہ گئی ہے اور اسی کمزوری کا اثر امتِ مسلمہ کا درد رکھنے والے طبقے کی حکمتِ عملی میں نظر آتا ہے۔ پس ہماری کوشش ہے کہ مغرب کا ایک مکمل تصور مسلمانوں کے سامنے پیش کریں تاکہ آج کے دردِ دل رکھنے والے مسلمان اور مجاہدینِ اسلام اسے سمجھ کر اپنی حکمتِ عملی بنا سکیں۔

دورِ جدید میں مغرب کی اصطلاح کا اطلاق وسیع جغرافیائی اور نظریاتی حدود پر ہوتا ہے۔ جغرافیائی طور پر مغرب کا اطلاق آج ان اقوام پر ہوتا ہے جو ایک طرف یورپ، برِاعظم شمالی امریکہ اور کینیڈا میں بستی ہیں اور دوسری طرف آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں رہتی ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے مغرب دو محرف شدہ قدیم آسمانی ادیان یہودیت وعیسائیت اور جدید لادینیت کے شرکیہ افکار کا مجموعہ ہے۔ ان جدید مغربی افکار میں سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism)، جمہوریت (Democracy) اور اشتراکیت (Communism) کے علاوہ بہت سے دیگر نظریات بھی شامل ہیں مگر ان تمام نظریات کا منبع 'لادینیت' یا 'سیکولرزم' (Secularism) ہے۔

آج کے جدید مغرب کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں شام وفلسطین کے بازنطینی رومیوں کی شکست سے ہوا جب عیسائیت کا مشرقی حصہ ختم ہوگیا اور وہ سمٹ کر مغرب میں قسطنطنیہ اور روم تک محدود ہوگئی۔ مغرب میں عیسائیت کا عروج آٹھویں صدی عیسوی میں فرانس میں

'شارلیمن' (Charlemagne) بادشاہ کی رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق تاج پوشی سے ہوا۔ یہ یورپ میں رومن کیتھولک مذہب کے عروج کا آغاز تھا۔ یورپ میں رومی کلیساء اور بادشاہ کی ایسی جوڑی بنی کہ اس نے قرونِ وسطیٰ میں پورے یورپ پر اپنا تسلط جمالیا۔ آنے والے وقت میں بادشاہ اور کلیساء کی اس جوڑی کی بدعنوانیوں کے خلاف یورپ کے مختلف ممالک میں ردِ عمل پیدا ہوا اور ان کی اصلاح کے لیے بہت سی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان تحریکوں میں دینی اصلاحی تحریکیں بھی تھیں اور لادین تحریکیں بھی اور انھوں نے یورپ میں بڑی فکری تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان فکری تبدیلیوں کا عصر حاضر کے جہاد کی فکری بنیادوں سے گہرا تعلق ہے۔ ہم اس باب میں مغرب کی جدید تاریخ پر ہی تفصیل سے گفتگو کریں گے جبکہ مغرب کی قدیم تاریخ اس مقام پر ہمارا اساسی موضوع نہیں۔

مغرب کی جدید تاریخ رومن کیتھولک عیسائیت کے عروج سے شروع ہو کر لادینیت کے فتنے کی ابتداء سے ہوتے ہوئے انقلابِ فرانس تک پہنچتی ہے۔ یہ تقریباً ایک ہزار سال کی تاریخ ہے۔ اس دوران یورپ میں لادینیت کا فتنہ شروع ہوا اور کلیساء اور لادینیت میں جنگ کا آغاز ہو گیا۔ یہ جنگ تقریباً پانچ سو سال تک جاری رہی۔ اسی عرصے میں عیسائیت میں 'پروٹیسٹنٹ' نام کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا جس نے رومن کیتھولک کی حکومت کو مزید کمزور کر دیا۔ 'نئی دنیا' یعنی امریکہ کی دریافت کے بعد پروٹیسٹنٹ وہاں جاکر آباد ہو گئے اور امریکہ کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے لگے۔ دوسری طرف یورپ میں لادینیت کی تحریکیں مضبوط ہونے لگیں اور ۱۷۸۹ء میں انقلابِ فرانس کے نتیجے میں کلیساء کی ایک ہزار سالہ حکومت ختم ہو گئی اور یوں یورپ میں 'جمہوریت' نافذ ہو گئی۔

مغرب کی تاریخ میں سب سے اہم موڑ برطانیہ کے ہندوستان پر قبضے سے آیا۔ برطانیہ کو اس فتح کی بدولت ہندوستان سے اتنا خام مال ملا جس نے دنیا میں پہلے 'صنعتی انقلاب' (Industrial Revolution) کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۳۰ء میں پہلے 'صنعتی انقلاب' کے بعد یورپ میں دوسرا 'صنعتی انقلاب' آیا جس نے مغرب کو عسکری قوت کے ساتھ اب ایک معاشی قوت بھی بنا دیا۔ دوسری طرف اسے ہندوستان سے بے پناہ افرادی قوت ملی جسے اس نے عسکری قوت میں تبدیل کر کے پہلے تو پورے ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کیا اور پھر اسی قوت سے اس نے یمن، مصر اور مالٹا پر قبضہ کر کے یورپ سے ہندوستان تک کے بحری راستوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد برطانیہ نے پہلی جنگِ عظیم میں اسی فوج کی مدد سے سلطنتِ عثمانیہ کو شکست دے کر نہ صرف

فلسطین پر قبضہ کیا اور ریاستِ اسرائیل کے قیام کے لیے یہودیوں کی مدد کی بلکہ مسلمانوں کے تمام تیل پر قبضہ کر لیا اور امتِ مسلمہ کے ٹکڑے کر دیے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپ میں دنیا کی قیادت کی صلاحیت نہ رہی۔ اب مغرب کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں تھی۔ امریکہ اپنے کردار میں برطانیہ ہی کا جدید تسلسل ثابت ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ نے 'نیو ورلڈ آرڈر' کے اقتصادی نظام کا اعلان کیا جسے 'منڈی کی معیشت' کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اشتراکی روس آیا جسے جہادِ افغانستان میں مجاہدین کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ روس کے زوال کے بعد امریکہ اب دنیا میں اکیلی طاقت بن کر سامنے آیا۔ دریں اثناء امتِ مسلمہ کے مجاہدین نے امریکہ کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔ اب مغرب اور مجاہدین آمنے سامنے تھے اور یہ معرکہ اب تک جاری ہے۔ یورپ میں کلیساء کے عروج سے 'نیو ورلڈ آرڈر' کے اعلان تک مغرب کی تاریخ کے کئی ادوار اور کئی حصے ہیں۔ مغرب کی اس تاریخ کا آغاز عیسائیت کی تاریخ سے ہوتا ہے، اس لیے ہم یہاں مغرب کی تاریخ کا آغاز عیسائیت سے کریں گے۔

عیسائیت کی تاریخ

عیسائیت کی ابتداء یورپ سے نہیں ہوئی بلکہ یہ دین فلسطین اور شام میں پروان چڑھا جو اس زمانے میں رومیوں کے زیر تسلط تھے۔ عیسائیت وہ دینِ حق نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اور جس کی تبلیغ ان کے حواریوں نے کی بلکہ یہ انسانوں کا بنایا ہوا دین ہے۔ اس دین کا ارتقاء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ ہی عرصے بعد شروع ہو گیا تھا۔ عیسائیت در حقیقت ایک یہودی عالم 'پولس' (Saint Paul) کے ذہن کی اختراع ہے۔ 'پولس' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں تو ان کا سب سے بڑا دشمن تھا مگر ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد بظاہر مسلمان ہو کر حواریوں کے ساتھ مل کر تبلیغ کرنے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے دینِ حق میں تحریفات اور اپنی طرف سے اضافے کرنا شروع کر دیے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا لوگ اس کی بتائی ہوئی تحریفات کو مانتے گئے اور دینِ حق لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہو گیا۔ چوتھی صدی عیسوی میں رومی بادشاہ 'قسطنطین' (Constantine I) نے عیسائیت قبول کر لی اور یوں دینِ حق لوگوں کی نظروں سے بالکل ہی اوجھل ہو گیا۔

عیسائیوں کی تاریخ کو مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

- پہلا دور: دورِ ابتلاء (۱ء۔۳۰۶ء)
- دوسرا دور: عیسائیت کے عروج کا آغاز (۳۰۶ء۔۵۹۰ء)

- تیسرا دور: یورپ میں عیسائیت کا عروج (جو جدید یورپی مؤرخین کی نظر میں یورپ کا ''تاریک زمانہ'' ہے) (۵۹۰ء۔ ۸۱۴ء)
- چوتھا دور: یورپ میں عیسائیت کے زوال کا سفر (جسے جدید یورپی مؤرخین ''قرون وسطیٰ'' کہتے ہیں) (۸۱۴ء۔ ۱۴۵۳ء)
- پانچواں دور: عیسائیت کا زوال (جو جدید یورپی مؤرخین کی نظر میں ''نشاۃِ ثانیہ'' کا دور ہے) (۱۴۵۳ء۔ ۱۷۸۹ء)

عیسائیوں کو قرآنِ مجید نے 'نصاریٰ' کے نام سے پکارا ہے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے دو روایات منقول ہیں؛ ایک یہ کہ اس نام کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرف ہے جب انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے استفسار کے جواب میں کہا تھا: ﴿نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ''ہم اللہ کے انصار (مددگار) ہیں''، اور دوسری یہ کہ اس کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش کی طرف ہے جو 'ناصرہ' کے نام سے مشہور تھی۔ برِ صغیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے انھیں 'عیسائی' کہا جاتا ہے یا ان کے لقب 'مسیح' کی نسبت سے 'مسیحی' کہا جاتا ہے۔ جو دین حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے وہ تورات کی تعلیمات سے علیحدہ دین نہ تھا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دینِ حق کے احیاء اور بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا گیا تھا۔ اس حقیقت کا علم ان کے حواریوں کو بھی تھا، لہٰذا انھوں نے کبھی بھی بنی اسرائیل کے باہر تبلیغ کی کوشش نہیں کی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا 'تورات' ہی کو اپنے لیے شریعت کے طور پر منتخب کرنا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے اور پھر سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے بصراحت ان کے بارے میں کہا ہے: ﴿وَرَسُولًا اِلٰى بَنِيْ اِسْرَآئِيلَ﴾ یعنی ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل ہی کی طرف ایک پیغمبر ہیں''۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، ان کے حواری اور ان پر ایمان لانے والے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ بعد میں جا کے دینِ حق میں تحریف واقع ہوئی جس کے نتیجے میں توحید پرست قوم 'تثلیث پرست' ہو گئی۔ پھر نہ صرف یہ ہوا بلکہ اپنی دعوت کو عالمی بنانے کے ساتھ ساتھ تورات کی بنیادی شریعت میں بھی بہت سی تبدیلیاں لائی گئیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس تحریف میں نمایاں کردار بھی ایک یہودی عالم کا تھا۔

اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ عیسائیت درحقیقت یہودیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ان دونوں ادیان کی یکسانیت کی وجہ سے قرآنِ مجید میں بھی ان کے لیے ''اہل کتاب'' کی مشترکہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور بے شمار مواقع پر دونوں گروہوں کو ایک ساتھ اسی اصطلاح سے مخاطب کیا گیا ہے۔ تاہم چونکہ بعد میں

عیسائیت نے ایک جداگانہ تشخص اختیار کر لیا تھا، اس لیے انھیں علیحدہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ان دونوں مذاہب کے درمیان تمام اختلافات کے باوجود تاریخی اور فکری ربط موجود ہے۔

عیسائی تاریخ کے ادوار میں سے ہم پہلے دو ادوار کا یہاں ذکر کریں گے جبکہ باقی تین ادوار یورپ کی تاریخ میں بیان کیے جائیں گے کیونکہ رومی سلطنت کے خاتمے کے بعد عیسائی تاریخ کے اہم واقعات فلسطین اور مشرقی یورپ سے منتقل ہو کر یورپ کے دل میں رونما ہوتے ہیں۔ دوسری طرف مؤرخین ان واقعات کے یورپ میں رونما ہونے کے باعث انھیں محض عیسائی تاریخ ہی کا نہیں، یورپی تاریخ کا حصہ بھی گردانتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ انھی آخری ادوار میں یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے تیسرے دشمن یعنی جدید مشرکین کو عروج ملا۔ اس لیے یورپ اور امریکہ کی تاریخ روایتی عیسائیت کی تاریخ سے علیحدہ بیان کرنا مناسب ہے۔

عیسائیت کا پہلا دور: دورِ ابتلاء (۱ء۔ ۳۰۶ء)

عیسائیت کی تاریخ کے پہلے دور کو 'دورِ ابتلاء' کے نام سے جانا جاتا ہے کیونکہ عیسائیت کے مؤرخین کے مطابق اس دور میں عیسائیوں پر مشرک رومیوں نے بہت سے مظالم ڈھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ رومیوں نے جو مظالم ڈھائے وہ بنیادی طور پر دینِ حق پر عمل کرنے والے مسلمانوں پر ڈھائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ''اصحاب الاخدود'' اور ''اصحاب الکہف'' کے واقعات اسی دور میں رونما ہوئے تھے اور وہ لوگ دینِ حق پر کاربند اہلِ ایمان تھے۔ چنانچہ صحیح بات یہ ہے کہ دورِ ابتلاء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دینِ حق اور سینٹ پال کی تحریف شدہ باتیں اکٹھی چل رہی تھیں اور اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ مسلمانوں اور ان تحریف شدہ عقائد رکھنے والوں کے درمیان شدید اختلافات تھے جو بعض دفعہ لڑائی کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا، لیکن بنی اسرائیل نے اپنے علمائے سوء کی پیروی میں نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا بلکہ ان کی جان کے درپے ہو گئے۔ انھوں نے رومیوں کے ساتھ مل کر آپ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو محفوظ رکھا اور اس دنیا سے آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ قتلِ عیسیٰ علیہ السلام کی سازش بنی نوع انسان کی تاریخ کے بڑے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔ اس کے بعد پوری دنیا کے انسان عیسائیت اور یہودیت کے نام سے دو نئے ادیان میں تقسیم ہو گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد آپ کے حواریوں نے بنی اسرائیل میں آپ کی تعلیمات کی تبلیغ جاری رکھی۔ مگر ایسے میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا دینِ توحید

دینِ تثلیث میں تبدیل ہو گیا۔ 'ساؤل' (Saul) نامی ایک یہودی عالم... جو کہ یہودیوں کے سخت گیر فرقے فریسیوں سے ہونے کے سبب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں آپ کی تعلیمات کی شدید مخالفت کرتا تھا، اور آپ علیہ السلام کو اور آپ کے ساتھیوں کو اذیت پہنچاتا تھا... اچانک حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے۔ اس کے بقول جب وہ یروشلم میں یہودی عالموں کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد دمشق کے سفر پر روانہ ہوا تو آسمان میں اسے نور نظر آیا۔ اس نور نے آواز دی اے ساؤل! تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ اسے معلوم ہوا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام ہیں۔ ساؤل کی اس کہانی پر حواریوں نے اعتبار نہ کیا ماسوائے ایک کے جو باقی حواریوں کو ساؤل کے اخلاص کا یقین دلاتا رہا اور جس نے خود ساؤل کے ساتھ مل کر تبلیغ شروع کی۔ ساؤل نے اپنا نام تبدیل کر کے 'پولس' رکھا اور وہ تاریخ میں 'سینٹ پال' یا 'پولس' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی تبلیغ سے بنی اسرائیل کے ارد گرد رہائش پذیر بہت سے مشرک لوگ عیسائی ہو گئے، مگر جس دین کی وہ تبلیغ کر رہا تھا اس میں رفتہ رفتہ نئے عقائد اور احکامات کی آمیزش کرتا رہا۔ ان میں سے سب سے خطرناک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا عقیدہ تھا جو بعد میں 'عقیدۂ تثلیث' (Trinity) کی شکل اختیار کر گیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ، ابن اللہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اور روح القدس یہ تینوں خدا ایک خدا ہیں۔ (نعوذ باللہ)

اس کے علاوہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قانونِ شریعت یعنی تورات کے بیشتر احکامات کو بھی عیسائیوں کے لیے منسوخ کر دیا، حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نئے احکامات دے کر نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ جو احکامات یہودیوں نے مسخ کر دیے تھے انہیں صحیح شکل میں دوبارہ زندہ کرنے کا حکم تھا۔ عقائد اور احکامات میں تبدیلی اور تخفیف کی وجہ سے بہت سے غیر یہودی مشرکوں میں اس دین کی مقبولیت بڑھ گئی۔ اس تحریف کی بنا پر پولس اور حواریوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے اور جس حواری نے اس کا ساتھ دیا تھا، وہ بھی علیحدہ ہو گئے۔

گویا اس وقت دینِ حق پر عمل کرنے والے مسلمان دو قسم کی کشمکش سے گزر رہے تھے؛ ایک طرف ان عقائد کا مقابلہ تھا جو سینٹ پال نے دینِ حق میں شامل کرنا شروع کر دیے تھے اور دوسری طرف وہ مظالم تھے جو مشرک رومی مسلمانوں پر ڈھا رہے تھے۔ اسی دور میں 'اصحاب الاخدود' کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر قرآنِ مجید کی سورۂ بروج میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان آیات کی تشریح میں اِس پورے واقعے کو بیان فرمایا ہے، جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ یمن میں ایک مشرک بادشاہ حکومت کرتا تھا، وہ اپنے آپ کو لوگوں کا رب کہلواتا تھا۔ اس بادشاہ کے پاس ایک جادوگر تھا۔ جب یہ جادوگر بوڑھا ہو گیا تو بادشاہ نے اسے اپنا علم کسی ہونہار شاگرد کو

سکھانے کا حکم دیا۔ جادو گر نے کہا کہ اگر اسے ایک ہونہار لڑکا دے دیا جائے تو وہ اپنا سارا جادو اسے سکھا سکتا ہے۔ بادشاہ نے جادو گر کے لیے ایک ہونہار لڑکے کا انتظام کر دیا۔ یہ لڑکا جادو سیکھنے کے لیے جادو گر کے پاس جس راستے سے جاتا تھا، اس راستے میں اللہ کے ایک نیک بندے کی خانقاہ آتی تھی۔ یہ اللہ کا بندہ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کا سچا پیروکار تھا۔ اس لڑکے نے اس راہب کے پاس جانا شروع کر دیا اور ایمان لے آیا۔ بادشاہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے اس لڑکے کو قتل کرانے کا حکم دیا۔ بادشاہ کے سپاہیوں نے اس لڑکے کو قتل کرنے کی بہت کوشش کی مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ لڑکا کسی بھی طریقے سے قتل نہ ہوا۔ آخر کار اس لڑکے نے خود کہا کہ اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ میں تمھیں بتاتا ہوں۔ لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ تم ساری بستی کے لوگوں کو اکٹھا کرو اور یہ کہتے ہوئے مجھ پر تیر چلاؤ کہ ''اس غلام کے رب کے نام سے'' تو میں قتل ہو جاؤں گا۔ جب تمام لوگوں کے سامنے ایسا کیا گیا تو وہ لڑکا شہید ہو گیا۔ اس لڑکے کی شہادت دیکھ کر ساری بستی مسلمان ہو گئی۔ اس بات پر بادشاہ بہت سٹپٹایا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو ایک میدان میں بڑے بڑے گڑھے کھودنے کا حکم دیا اور ان گڑھوں میں آگ روشن کروائی۔ پھر ایک ایک شخص کو لایا جاتا اور اس سے دینِ حق سے پھرنے کا مطالبہ کیا جاتا۔ جو شخص دینِ حق سے پھر جاتا اسے چھوڑ دیا جاتا اور جو نہ پھرتا اسے آگ میں ڈال دیا جاتا۔ علماء اور مفسرین کا بیان ہے کہ اس دن بہت کم لوگ دینِ حق سے پھرے اور ہزاروں مسلمانوں کو آگ میں ڈالا گیا۔

اسی طرح اس دور کا دوسرا واقعہ 'اصحاب الکہف' کا ہے۔ جمہور علماء کی رائے میں یہ واقعہ رومی سلطنت کے علاقے اردن میں پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس واقعے کو مسلمانوں کی ہدایت کے لیے تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ ان نوجوانوں کی صحیح تعداد صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ یہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کے لائے ہوئے دینِ حق پر چلنے والے چند نوجوان تھے۔ بعض مؤرخین کے نزدیک یہ بادشاہ کے درباری تھے۔ ان کے اسلام کا مشرک بادشاہ کو جب علم ہوا تو اس نے انھیں ایک دن کی مہلت دی کہ اس دین کو چھوڑ دیں۔ یہ چند نوجوان اپنے ایمان کو بچانے کے لیے شہر سے بھاگ کر ایک پہاڑ کی غار میں چھپ گئے۔ ان کے ساتھ ان کا کتا بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کی مدد فرمائی اور ان پر نیند طاری کر دی۔ یہ کئی سو سال تک اسی غار میں سوتے رہے۔ جب بیدار ہوئے تو اس زمانے میں رومی عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ لوگوں نے ان کو پہچان لیا کیونکہ انھوں نے فرار ہونے والوں کی کہانیاں اپنے بڑوں سے سن رکھی تھیں۔ یہ غار میں واپس آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت طاری فرما دی۔

یہ تو وہ واقعات ہیں جن کی خبر اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں مسلمانوں کو دی ہے۔ اس کے علاوہ عیسائی مؤرخین نے بھی تاریخ میں عیسائیوں پر رومی بادشاہوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ ان بادشاہوں میں خاص طور پر 'نیرو' (Nero) اور 'ڈایوکلیٹن' (Diocletian) وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرا دور: عیسائیت کے عروج کا آغاز (۳۰۶ء۔۵۹۰ء)

عیسائیت کے عروج کا آغاز ۳۰۶ء میں رومی بادشاہ 'قسطنطین اول' کے تخت پر بیٹھنے سے ہوتا ہے۔ قسطنطین کی ماں کا نام 'ہیلینا' (Helena) تھا۔ عیسائی مؤرخین کے مطابق ہیلینا نے ۲۵۰ء سے ۳۰۰ء کے درمیان عیسائیت قبول کی تھی۔ ہیلینا کی ابتدائی زندگی کے بارے میں تاریخ میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں، مگر عیسائیوں کے تقریباً تمام ہی بڑے فرقے اس کو برگزیدہ (Saint) ہونے کا درجہ دیتے ہیں اور اس کے نام کا دن مناتے ہیں۔ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ بادشاہ قسطنطین اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا اور اس کی ہر بات مانتا تھا۔ رومی بادشاہ قسطنطین نے اپنی ماں کے زیرِ اثر عیسائیت قبول کر لی تھی، تاہم ۳۲۱ء میں بادشاہ نے اس کا سرکاری طور پر اعلان کیا۔ بادشاہ بننے کے فوراً بعد ہی اس نے نہ صرف عیسائیوں پر مظالم بند کرنے کا حکم دیا بلکہ تمام عیسائی قیدیوں کو بھی چھوڑ دیا اور ان کی جائیدادیں جو اس سے پہلے کے بادشاہوں نے ضبط کر لی تھیں، وہ بھی واپس کر دیں۔ اس جگہ ہم ایک حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں کو اس دور میں مؤرخین نے 'عیسائی' لکھا ہے، ان میں دینِ حق پر چلنے والے مسلمان بھی شامل تھے۔ عیسائی مؤرخین اس حقیقت کو واضح نہیں کرتے اور ان دونوں گروہوں کے لیے عیسائیت کی اصطلاح ہی استعمال کرتے ہیں۔

مسلمان مؤرخین اور علماء نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ بادشاہ قسطنطین کے دور تک ایک گروہ دینِ حق پر چلنے والے مسلمانوں کا تھا اور دوسرا گروہ بدعتی مسلمانوں (عیسائیوں) کا تھا۔ اس بات کا اندازہ اس دور کے عام مؤرخین کی تحریروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کیونکہ وہ عیسائیت میں عقائد کی بنیاد پر تفرقے کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتا تھا اور دوسرا گروہ انھیں اللہ کا نبی مانتا تھا۔ ان گروہوں کے درمیان شدید اختلافات موجود تھے اور کبھی کبھی ان کے درمیان خون خرابہ بھی ہوتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ۳۲۵ء میں بادشاہ قسطنطین کی طرف سے نیقیاء کے مقام پر بلائی گئی وہ مشہور کانفرنس ہے جسے عیسائیت کی بنیاد کہا جاتا ہے۔

'نیقیا کی کانفرنس' ۳۲۵ء؛ عقیدۂ تثلیث کی جیت

'نیقیا کانفرنس' (Council of Nicaea) کی زیادہ تر تفصیلات بھی اس وقت کے ان عیسائی موٴرخین کی فراہم کردہ ہیں جو خود بھی عقیدۂ تثلیث پر یقین رکھتے تھے۔ سن ۳۲۵ء میں بادشاہ قسطنطین نے عیسائیت میں اختلاف کو ختم کرنے کے لیے اپنی مملکت کے مشرقی اور مغربی حصوں میں تقریباً ایک ہزار پادریوں اور علماء کو دعوت نامے بھیجے جن میں انھیں اپنے ساتھ دو دو شاگردوں کو بھی لانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ مگر ان ایک ہزار دعوت ناموں میں سے ۲۵۰ سے ۳۱۸ افراد نے شرکت کی۔ ان شرکت کرنے والوں میں شام، فلسطین اور ترکی سے تعلق رکھنے والے مندوب زیادہ تھے، یعنی ملک کے مشرقی حصے سے زیادہ لوگ شریک ہوئے جبکہ ملک کے مغربی حصے کی نمائندگی کم تھی۔

اس کانفرنس کا ایجنڈا عقیدۂ تثلیث اور اس کے مخالف گروہ میں اتفاقِ رائے پیدا کرنا تھا۔ اس کانفرنس میں کئی ماہ کے بحث و مباحثے کے بعد ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں عقیدۂ تثلیث کو عیسائیت کا حصہ منظور کر لیا گیا اور پوری دنیا میں موجود صرف چار قسم کی انجیل پر اتفاق کر کے باقی تمام قسم کی انجیلوں کو غلط اور باطل قرار دے دیا گیا۔ ان غلط قرار دی جانے والی انجیلوں میں وہ کتاب اللہ بھی شامل تھی جو اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اس قرارداد پر تین کے علاوہ تمام علماء نے دستخط کر دیے۔ پہلی صدی عیسوی میں سینٹ پال کے شروع کیے گئے شرکیہ عقائد اب ایک سرکاری دین بن چکے تھے۔ نیقیا کانفرنس کی یہ قرارداد آج کے تمام عیسائی فرقوں کے بنیادی عقائد ہیں۔ گو بعد میں ۳۸۱ء اور ۴۳۱ء میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں کچھ لفظی تبدیلیاں اور اضافے کیے گئے مگر بنیادی عقائد وہی رہے۔

نیقیا کانفرنس کی قرارداد وہ دین نہ تھا جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اور نہ ہی اس کانفرنس میں جو اناجیل منظور ہوئیں وہ اللہ کی نازل کردہ تھیں۔ یہ تو سینٹ پال کے تحریف شدہ عقائد تھے اور یہ اناجیل علمائے سوء کی خود لکھی ہوئی کتابیں تھیں جو اب ایک نئے تحریف شدہ دین کا حصہ تھیں۔ اب عیسائیت درباری دین بن چکا تھا اور نیقیا کانفرنس کے عقائد اس کے لئے مشعلِ راہ تھے۔ اب جو بھی ان عقائد اور ان اناجیل پر تنقید کرتا یا ان کی مخالفت کرتا، وہ حکومتی عتاب کا شکار ہو جاتا۔ اس طرح اہلِ ایمان پر ظلم و جبر کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک جاری رہا۔ دینِ حق لوگوں کی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا اور صرف پولس کے عقائد پر مبنی دین باقی رہ گیا۔ بہر حال دینِ عیسائیت رومی باشاہوں کے دربار میں پلنے اور بڑھنے لگا۔

اسی لیے یہ اپنی پیدائش کے ساتھ ہی دینِ مداہنت ٹھہرا۔[28] ابتداء ہی سے عیسائیت کے دو بڑے مرکز تھے؛ ایک مشرق میں جو ترکی کے شہر 'قسطنطنیہ' (Constantinople) (آج کے استنبول) میں واقع تھا اور دوسرا یورپ میں اٹلی کے شہر 'روم' (Rome) میں واقع تھا۔

فتنۂ الحاد کا رد

یونان ابتداء ہی سے شرک اور لادین فلسفے کا مرکز رہا۔ تقریباً تین سو سال قبل مسیح میں وہاں سے 'ارسطو' (Aristotle) اور 'افلاطون' (Plato) کے فلسفوں نے جنم لیا اور یورپ کے بہت سے حصوں کو متاثر کیا۔ یونانی فلسفے کی بنیاد اللہ کا انکار اور علمِ وحی کے مقابلے میں انسانی عقل کو مقدم ثابت کرنا تھا۔ یونان کا لادین فلسفہ دراصل مذہب کے خلاف ایک ردِ عمل تھا۔ عیسائیت کو ابتداء ہی سے اس فلسفے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جب پانچویں صدی عیسوی میں یہ فتنہ رومی حکومت کے علاقے میں بہت زیادہ پھیل گیا تو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے عیسائیت کی تاریخ کا سب سے مشہور پادری 'سینٹ آگسٹین' (Saint Augustine) (۳۵۴ء۔ ۴۳۰ء) میدان میں نکلا۔ اس نے عقل پرستی کے اس فتنے کو مناظروں اور حکومتی سختی سے دبا دیا۔ بعض عیسائی مؤرخین کے مطابق یہ سینٹ آگسٹین ہی تھا جس نے اس لادینیت کے خلاف پہلی دفعہ سیکولر اور الحاد کی اصطلاحات استعمال کیں۔ بہرحال اس فتنہ کا خاتمہ کر دیا گیا۔ پانچویں صدی عیسوی سے لے کر تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی تک تقریباً نو سو سال تک 'عیسائی یورپ' میں الحاد کے فتنے کو سر اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ تاہم چودھویں صدی عیسوی کے بعد کلیساء کی بدعنوانیوں کا فائدہ اٹھا کر الحاد پورے یورپ میں پھیل گیا اور اس نے انقلابِ فرانس میں کلیساء کو شکست دی، جس کا ذکر ہم آگے تفصیل سے کریں گے ان شاء اللہ۔

---

[28] مسلم ممالک میں موجود مرعوبیت زدہ سیکولر طبقہ اسلام کو عیسائیت کی تاریخ کی روشنی میں دیکھتا اور دِکھاتا ہے۔ مثلاً وہ یہ جھوٹا دعویٰ کرتا ہے کہ عیسائیت کی پاپائیت اور اسلام میں علماء و مدارس کا کردار ایک سا ہے، حالانکہ یہ قیاس متعدد وجوہات سے بالکل غلط اور احمقانہ ہے۔ ان میں سے ایک اہم وجہ یہ ہے کہ عیسائیت ہمیشہ سرکاری درباری مذہب رہا ہے، عیسائی پادری حکمرانوں کے مظالم میں شریک اور حصہ دار رہے ہیں اور حکمرانوں کے غلط کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اپنی اساسی تعلیمات تک کو بدل ڈالا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ہمارے نامور علماء کا عمومی کردار ہمیشہ حکمرانوں کی مخالفت اور درباروں سے دوری کا رہا ہے اور جب بھی علماء کو قرآن اور سلطان میں سے ایک کو چننا پڑا ہے تو انہوں نے قرآن کا ساتھ دیا۔ پھر اس آخری امت کا اجتماعی شعور بھی ہمیشہ اتنا بیدار رہا ہے کہ اس نے حکمرانوں کے آلۂ کار علمائے سوء کو کبھی احترام نہیں دیا بلکہ جیل میں فوت ہونے والے ابو حنیفہؒ، گدھے پر پھرائے جانے والے مالک بن انسؒ، کوڑے کھانے والے احمد بن حنبلؒ، مرتدین کے خلاف جہاد کرنے والے ابن تیمیہؒ کو اپنا امام کہا ہے، رفع الله قدرهم في العليين! (م ح)

سلطنتِ روم کی تقسیم

۴۷۶ء میں مغربی یورپ میں سلطنتِ روم (Roman Empire) زوال پذیر ہو گئی۔ یورپ میں اس کے زوال کے اسباب داخلی تھے۔ مؤرخین بد عنوانی اور خانہ جنگی کو یورپی روم کے زوال کے بنیادی اسباب گردانتے ہیں۔ مغربی یورپ میں رومی حکومت کے زوال کے بعد اب اقتدار مشرقی حصے کے ہاتھ میں آ گیا جسے 'بازنطینی رومی حکومت' (Byzantine Empire) کہتے ہیں۔ یہی وہ حکومت ہے جس کا مقابلہ اسلام کے عروج کے زمانے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہوا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں 'سینٹ بینیڈکٹ' (Saint Benedict of Nursia) نے عیسائیت میں 'رہبانیت' کا ایک نظام شروع کیا جو آج تک عیسائیت میں جاری ہے۔ اس نظام میں عیسائی مرد یا عورت رضائے الٰہی کے حصول اور عبادت کی غرض سے اپنے آپ کو کلیساء کے حوالے کر دیتا تھا۔ وہ شادی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اور جائز خواہش پوری کر سکتا تھا۔ اس نظام نے کلیساء کے اندر بد عنوانی کے نئے راستے کھول دیے جو بعد میں کلیساء کے زوال کا باعث بنے۔

عیسائیت کے آخری ادوار ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ ہم اِس دور تک جنم لینے والے عیسائیت کے بنیادی عقائد پر نظر ڈالیں تاکہ آگے چل کر تاریخی مباحث میں بنیادی عیسائیت کا تصور ذہن میں ثبت رہے۔

عیسائیت کے عقائد

سینٹ پال کی اختراع کردہ عیسائیت چھٹی صدی عیسوی تک درج ذیل عقائد کا مجموعہ تھی:

- عقیدۂ تثلیث
- عقیدۂ مصلوبیت اور کفارہ
- عیسائی بننے کا طریقہ
- صلیبِ مقدس
- حیاتِ ثانیہ

عقیدۂ تثلیث

عیسائیوں کے یہاں خدا ایک ہوتے ہوئے تین ہستیوں یا ان کی اصطلاح میں تین اقانیم کا مرکب ہے جو باپ، بیٹا اور روح القدس ہیں۔ ان کے مطابق یہ تینوں مل کر ایک خدا بنتے ہیں یعنی تین خدا نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کی خدائیت اور ان کے باہمی تعلق کے بارے میں بھی ان کے درمیان بہت سا اختلاف پایا جاتا

ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ باپ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، بیٹا اللہ کی صفتِ کلام (یا کلمۃ اللہ) ہے اور روح القدس صفتِ حیات و محبت ہے اور یہ صفات حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کے جسم میں حلول کر گئی تھیں۔ یہ ذہن میں واضح رہے کہ قرآنِ مجید میں جہاں حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے، وہاں اس سے مراد حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کی بغیر باپ کے تخلیق کا الٰہی حکم ہے، صفت یا صفت کا حلول قطعاً مراد نہیں ہے۔

اس عقیدے کو ماننے سے عقیدۂ حلول اور تجسیم بھی لازم آتا ہے۔ حلول و تجسیم سے مراد اللہ تعالیٰ کی کسی صفت یا جزو کا کسی مخلوق میں حلول ہو جانا یا مخلوق کی شکل میں مجسم ہو جانا ہے، جو کہ اللہ کی شان میں گستاخی پر مبنی ایک باطل عقیدہ ہے۔

عقیدۂ مصلوبیت اور کفارہ

حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کو خدائی صفات کا حامل اور ابن اللہ قرار دینے اور پھر صلیب پر چڑھ جانے کی توجیہ کے لیے عیسائیوں نے 'عقیدۂ مصلوبیت' ایجاد کیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جنت میں حضرت آدم عَلَیہِ السَّلام سے سرزد ہونے والی اصلی اور ابتدائی غلطی تمام انسانیت میں نسل در نسل پھیل گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا تقاضا یہ تھا کہ تمام انسانوں کو سزا دے مگر ساتھ ہی ساتھ صفتِ رحمت کا تقاضا تھا کہ خطاکاروں کو بخش دے۔ اس مشکل سے نکلنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے (نعوذ باللہ) حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام میں اپنی صفتِ رحمت ڈالی۔ حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کے بشری جسم کی بنا پر ان میں انسانیت کا ابتدائی گناہ سرایت کر گیا تھا اور روح القدس کے حلول سے صفتِ رحمت آگئی۔ بیٹے میں صفتِ رحمت نے انسانی گناہ کو معاف کروانے کے لیے تمام انسانوں کی طرف سے کفارہ ادا کرتے ہوئے اپنے آپ کو صلیب پر چڑھا دیا۔ اب انسان دوزخ کی آگ سے بچنے کے لیے صرف اتنا مکلف ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عمل کو تسلیم کرلے، یعنی حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کو اللہ کا بیٹا مان کر عیسائی بن جائے۔

عیسائی بننے کا طریقہ

عیسائی عقیدہ اپنانے کے لیے عیسائیوں کی مذہبی روایات میں 'بپتسمہ' (Baptism) اور 'عشائیہ ربانی' (Lord's Supper) کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ 'بپتسمہ' یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص عیسائی ہوتا ہے تو اس پر خاص پانی چھڑک کر اسے پاک کیا جاتا ہے۔ اس دوران عیسائی ہونے والا شخص سفید کپڑے پہنتا ہے۔ عیسائیوں کے یہاں بپتسمہ کی بنیاد یہ ہے کہ جب حضرت یحییٰ عَلَیہِ السَّلام لوگوں کو توبہ کراتے تھے تو انھیں نہر

میں غسل کرنے کا کہتے تھے۔ اس کے بعد عشائیہ ربانی کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں شراب اور خاص قسم کی روٹی تقسیم ہوتی ہے۔

صلیبِ مقدس

عقیدۂ مصلوبیت پر اپنے ایمان کو ظاہر کرنے کے لیے عیسائیوں میں صلیبِ مقدس کا رواج ہوا۔ اس کی ابتدا شاہ قسطنطین کے زمانے میں ہوئی جب اس نے اپنے دشمن کے مقابلے میں آسمان پر صلیب بنی ہوئی دیکھی اور اسے فتح حاصل ہوئی۔ پھر روایات کے مطابق شاہ کی ماں ''سینٹ ہیلینا'' کو کہیں سے وہ صلیب مل گئی جو حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے لیے تیار کی گئی تھی جسے ہر مشکل کام سے پہلے اونچا کیا جانے لگا۔ اب عیسائی اپنے ہر مقدس کام سے پہلے اور خوشی یا غم کے موقعے پر انگلی کے اشارے سے چہرے اور سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہیں اور صلیب کو بطورِ تعویذ گلے میں بھی لٹکاتے ہیں۔

عقیدۂ حیاتِ ثانیہ

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام ایک مرتبہ صلیب چڑھ جانے کے بعد قیامت کے قریب دوبارہ آئیں گے اور عظیم حکومت قائم کریں گے۔ اسے 'عقیدۂ حیاتِ ثانیہ' (Second Coming of Christ) کہتے ہیں۔ عیسائیوں کے یہاں اس عقیدے کی بنیاد اللہ کی صفتِ حیات ہے جو ان کے بقول مصلوب ہونے کے تیسرے روز حواریوں کے سامنے حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی شکل میں یہ خوشخبری دینے دوبارہ آئی تھی کہ وہ دوبارہ تشریف لائیں گے تاکہ دنیا میں بدی کی قوتوں کو شکست دے کر تا قیامت حکومت کریں۔ یہ عقیدہ یہودیوں اور مسلمانوں میں پائے جانے والے عقیدۂ مسیح موعود سے مشابہ ہے۔

یورپ کی تاریخ

عیسائیت کے پہلے دو ادوار کا تعلق ترکی، شام، فلسطین اور مصر سے تھا کیونکہ عیسائیت کی ابتداء انھی علاقوں سے ہوئی تھی۔ یہ عیسائیت کا مشرقی حصہ تھا جبکہ یورپ کو عیسائیت کا مغربی حصہ کہا جاتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کے ظہور اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی فتوحات نے عیسائیت کو مشرق میں زوال پذیر کر دیا۔ اب عیسائیت یورپ تک محدود ہو کر رہ گئی جہاں اس نے اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لیے وسطی اور مغربی یورپ میں ایک مستحکم نظام قائم کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یورپ کو جدید شکل میں منظم کرنے والی قوت رومن کیتھولک عیسائیت ہی تھی تو غلط نہ ہوگا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا تھا، ہم عیسائیت کے آخری ادوار کا ذکر تاریخِ یورپ کے ذیل میں کریں گے کیونکہ یہ تاریخِ یورپ کا بھی حصہ ہیں۔ یورپ کی یہ جدید تاریخ تین بڑے ادوار پر مشتمل ہے جن میں سے آخری دور کے دو حصے ہیں:

- یورپ کا تاریک زمانہ (۵۹۰ء۔۸۰۰ء)
- قرونِ وسطیٰ (۸۰۰ء۔۱۴۵۳ء)
- نشاۃِ ثانیہ کا دور (۱۴۵۳ء۔۱۷۸۹ء)
  - عقلیت کا دور (۱۴۵۳ء۔۱۶۷۵ء)
  - تنویریت کا دور (۱۶۷۵ء۔۱۷۸۹ء)

یورپی تاریخ کی اس تقسیم کے بارے میں مؤرخین کے مابین اختلاف بھی ہے۔ کئی مؤرخین کا خیال ہے کہ تاریخ کی یہ تقسیم خالصتاً سیکولر مؤرخین نے پیش کی ہے جنھوں نے عیسائیت کے عروج کو تاریک زمانہ اور اس کے زوال کو روشن خیالی سے تعبیر کیا ہے۔ تاہم جدید زمانے میں چونکہ سیکولر نظام وافکار کا غلبہ ہے اس لیے یورپی تاریخ کی سب سے زیادہ قابلِ قبول تقسیم یہی ہے، لہٰذا ہم بھی اسے ہی درج کر رہے ہیں۔ ہم یہاں یہ بھی واضح کرتے چلیں کہ ہمارا مقصد یورپ کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ان عوامل کو مسلمانوں کے سامنے لانا ہے جن کا تعلق عصر حاضر میں امتِ مسلمہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ ہے۔

یورپ کا تاریک زمانہ (۵۹۰ء۔۸۰۰ء)

یورپ کی تاریخ میں چھٹی صدی عیسوی سے نویں صدی عیسوی کو 'تاریک زمانے' (Dark Ages) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یورپ کی تاریخ کے اس حصے کو تاریک زمانہ کیوں کہا جاتا ہے، اس کی مؤرخین تین وجوہات بتاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ یورپ میں رومی حکومت کا زوال

بعض مؤرخین کے مطابق اس اصطلاح کا استعمال ۱۳۳۰ء میں اٹلی کے ایک مؤرخ 'پیٹرک' نے کیا تھا۔ اس نے پانچویں صدی عیسوی میں حکومتِ روم کے زوال[29] کو یورپ کے علمی زوال سے تعبیر کرتے ہوئے

[29] یہاں رومی حکومت کے زوال سے مراد مغربی یورپ میں 'رومی سلطنت' (Roman Empire) کا زوال ہے، مطلقاً عیسائیت کا زوال نہیں۔ کیونکہ رومی سلطنت کے خاتمے کے بعد مشرقی یورپ میں 'بازنطینی سلطنت' (Byzantine Empire) کی صورت میں

اس کو 'تاریک زمانہ' قرار دیا اور یہ پیشین گوئی کی کہ رومی حکومت دوبارہ عروج حاصل کرے گی اور یورپ تاریک زمانے سے باہر آئے گا۔

۲۔یورپ کا تاریک زمانہ اور اسلام کا عروج

یورپی تاریخ کے اس زمانے کو 'تاریک زمانہ' کہنے کی دوسری وجہ 'عروجِ اسلام' ہے۔ساتویں صدی عیسوی میں جزیرۂ عرب میں اسلام کا ظہور ہوا۔ تئیس سال کے قلیل عرصے میں یہ دین پورے عرب پر غالب آگیا۔ آپ ﷺ کے اس دنیا سے وصال کے بعد خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ملکِ شام کے خلاف ...جہاں اس وقت رومی عیسائی آباد تھے اور قیصر کی حکومت تھی... چار فوجیں روانہ فرمائیں۔ مسلمان جرنیلوں نے چند ہی سالوں میں رومی حکومت کا تمام مشرقی حصہ فتح کر لیا۔ قیصر روم کی حکومت سمٹ کر اب صرف قسطنطنیہ تک محدود ہو گئی تھی۔عیسائیت ...جو رومی سلطنت کا جزو لازم تھی... سمٹ کر یورپ کے بہت ہی محدود علاقے میں رہ گئی۔ مشرق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں شکست سے لے کر آج تک عیسائیت کی جدید تاریخ تمام کی تمام یورپ میں رہی۔ عیسائیت کے یورپ میں سمٹ جانے کی وجہ سے اس کو 'تاریک زمانہ' کہا گیا۔

۳۔یورپ میں عیسائیت کا یونانی فلسفے کو دبانا

'تاریک زمانہ' کہلانے کی تیسری وجہ 'سیکولرزم' ہے۔ یورپ کے بعض سیکولر مؤرخین کے نزدیک اس دور میں کلیساء نے یونانی فلسفے، سیکولرازم یا الحاد کو ریاستی جبر سے دبا دیا۔ اس جبر کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ ان کے خیال میں علم کی روشنی سے محروم ہو گیا۔مزید یہ کہ عیسائی پادریوں کی تنگ نظری اور زبردستی کے سبب یورپ میں ایسا نظام نافذ ہوا جس کی وجہ سے یورپ میں عصری علوم پر پابندی لگ گئی۔ان کے بقول عقل، علم اور آزادی پر یہ پابندیاں یورپ پر صدیوں تک چھائی ہوئی تاریکی کا سبب بنیں۔ بہت سے مؤرخین اس اصطلاح کو ہی صحیح نہیں مانتے اور اسے سیکولر لوگوں کی طرف سے عیسائی مذہب کو بدنام کرنے کی سازش قرار دیتے ہیں۔ یہ تو ایک نہ ختم ہونے والی بحث ہے مگر یہ چیز بہر حال ثابت ہے کہ اس دور میں عیسائیت شمال مشرق اور مغرب

عیسائیت قائم رہی اور پھر آگے چل کر نویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ میں بھی رومن کیتھولک چرچ کا اقتدار قائم ہو گیا جس نے 'مقدس رومی سلطنت' (Holy Roman Empire) کی بنیاد رکھی۔

دونوں حصوں میں زوال پذیر تھی۔ البتہ اسی دور کے آخر میں وسطی یورپ اور مغربی یورپ کے جاہل اور وحشی قبائل کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔

یورپ کی تاریخ کا یہ ابتدائی دور مغربی یورپ میں 'سلطنتِ روم' (Roman Empire) کے خاتمے سے لے کر ۸۰۰ء میں پوپ کے ہاتھوں فرانس کے بادشاہ چارلس (شارلمین) کی تاج پوشی تک پھیلا ہوا ہے۔ وسیع مفہوم میں اس سے مراد ۵۰۰ء سے لے کر ۱۰۰۰ء لیا جاتا ہے جس میں زیادہ تر مغربی یورپ میں ایک طرف خانہ جنگی رہی اور دوسری طرف عیسائیت پھیلتی رہی۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس تمام عرصے میں پورے یورپ میں عیسائی اقتدار میں کوئی فرق نہ آیا تھا کیونکہ مشرقی یورپ میں 'رومی سلطنت' کی وارث 'بازنطینی سلطنت' نے عیسائی اقتدار کو اسی طرح برقرار رکھا، جبکہ مغرب میں ۵۹۰ء میں 'گریگوری اول' (Gregory I) پوپ بنا تو اس نے عیسائیت کی تبلیغ کا دائرہ جرمنی اور برطانیہ تک پھیلا دیا۔ اس عرصے میں عیسائیت یا رومن کیتھولک چرچ ہی واحد طاقت تھی جس نے یورپ کو متحد کیے رکھا۔ اس طرح کلیساء 'چرچ سٹیٹ' (کلیسائی ریاست) یا 'کرسچنڈم' کی شکل میں اس شان سے ابھرا کہ فرانس کے بادشاہ 'چارلس' (شارلیمن) کی تاج پوشی پاپائے کلیساء کے ہاتھوں کرسمس کے موقع پر ہوئی۔ یہ وہ عیسائی بادشاہ تھا جس نے مشرکوں کے خلاف مقدس جنگیں لڑ کر مغربی یورپ کے بیشتر علاقوں کو یکجا کیا اور خود 'مغربی سلطنت' کا فرمانروا ہونے کا اعلان کیا۔

قرونِ وسطیٰ یا درمیانی صدیاں (۸۰۰ء۔ ۱۴۵۳ء)

یورپ کی تاریخ کا دوسرا دور 'قرونِ وسطیٰ' (Middle Ages) کہلاتا ہے۔ تاریک زمانے کی اصطلاح کی طرح 'قرونِ وسطیٰ' بھی ایک بہت متنازعہ اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کو یورپ کے عیسائی اور سیکولر مؤرخین علیحدہ علیحدہ استعمال کرتے ہیں۔ عیسائی مؤرخین کے نزدیک یہ دور کلیساء کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس دور میں یورپ کے بادشاہوں اور کلیساء کے درمیان قائم ہونے والا نظام اپنے عروج کو پہنچا۔ اسی دور میں عیسائیوں نے صلیبی جنگوں کے ذریعے بیت المقدس پر قبضہ کیا اور اسی دور میں عیسائیت نے سپین کے بہت سے علاقے فتح کیے۔ دوسری طرف کلیساء کی بدعنوانیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے اثرات کے باعث لوگوں میں یونانی فلسفے کی جانب توجہ میں اضافہ ہوا جو سیکولر مؤرخین کے نزدیک لوگوں کا تاریکی سے روشنی کی طرف سفر کا ایک اہم قدم تھا۔ اسی دور میں ان کے لادین افکار نے جڑیں پکڑی تھیں اور وہ اس دور کو یورپ میں 'نشاۃ ثانیہ' (Renaissance) اور 'روشن خیالی' (Enlightenment) کا دروازہ قرار دیتے ہیں۔ البتہ بعض

سیکولر مؤرخین اس اصطلاح سے منفی مفہوم بھی لیتے ہیں کہ یہ وہ ہزار سالہ تاریخ ہے جو 'ہیومنزم' (Humanism) کی تحریک کے درمیان آڑے آ گئی تھی۔

بہر حال، عصر حاضر کی فکری بنیادیوں کو سمجھنے کے لیے یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ عصر حاضر کے سب سے بڑے فتنے 'حقوقِ انسانی' (Human Rights) کی جنگ اور جدید 'جمہوریت' کا ارتقاء اسی دور میں ہوا۔ یہ ارتقاء کلیساء اور یورپ کے بادشاہوں کے اس نظام کے ردِ عمل میں ہوا جو 'سینٹ آگسٹین' کے فلسفے کے مطابق اللہ کی حکومت اور انسان کی حکومت کی بنیاد پر بنایا گیا تھا۔ اس لیے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس نظام کو سمجھیں۔ اس دور کا دوسرا اہم واقعہ 'سیکولرزم' کا یورپ میں دوبارہ سر اٹھانا تھا، جس نے مستقبل میں کلیساء اور بادشاہ کے اس نظام کو شکست دی۔ اسی دور کا تیسرا اہم واقعہ طاعون کی وہ وباء تھی جو پورے یورپ میں پھیلی اور اس نے یورپ کی ایک تہائی آبادی کو ختم کر دیا اور یورپ کو مجبور کر دیا کہ وہ زراعت کے علاوہ کوئی اور نظام اپنائیں۔ اس نے یورپ کے معاشی نظام میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں جو رفتہ رفتہ کمپنیوں کی تجارت اور بینکوں کے جدید نظام میں تبدیل ہو گئیں اور انقلابِ فرانس کے بعد 'سرمایہ دارانہ نظام' میں تبدیل ہو کر آج ہمارے سروں پر مسلط ہیں، دوسری طرف جمہوری نظام بھی اپنے ارتقائی مراحل سے گزر کر انقلابِ فرانس کے بعد اس سرمایہ دارانہ نظام کو چلانے والا نظام بن کر سامنے آیا، اور تیسری طرف اسی دور میں صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا جو دو سو سال تک جاری رہیں اور ان کا آج کے جہاد کی فکری بنیادوں کو سمجھنے سے خاص تعلق ہے۔ اس لیے ہماری کوشش ہے کہ ہم اس دور میں ہونے والے اہم واقعات اور عوامل کا تفصیل سے ذکر کریں۔

'سینٹ آگسٹین' کا نظریہ: 'اللہ کا شہر' اور 'انسان کا شہر'

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ پانچویں صدی عیسوی میں یورپ میں 'رومی سلطنت' زوال پذیر ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ چونکہ رومی بادشاہ ہی کلیساء کے محافظ تسلیم کیے جاتے تھے تو اس سلطنت کے زوال کے سبب مغرب میں عیسائیت کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا۔ اس موقع پر 'سینٹ آگسٹین' نے جو رومی کلیساء کا ایک پادری تھا، ۴۱۵ء میں 'اللہ کا شہر' (City of God) اور 'انسان کا شہر' کا مشہورِ زمانہ نظریہ پیش کیا۔ سینٹ آگسٹین کے اس نظریے نے کلیساء، یورپی بادشاہوں اور عوام کو ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط کر دیا۔ یورپ کے تاریک زمانے میں اس نظام کی بنیاد رکھی گئی اور قرونِ وسطیٰ میں یہ نظام اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

یہی وہ نظام ہے جسے آج کے مؤرخین یورپ کا اولڈ ورلڈ آرڈر کہتے ہیں۔ ذیل میں ہم اس نظام کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

'سینٹ آگسٹین' کے پیش کردہ نظریے کے چار عناصر تھے:

- کلیساء
- بادشاہ
- جاگیردار
- عوام

آگسٹین کے مطابق اللہ نے دو طرح کی دنیا بنائی ہے؛ ایک 'ازلی دنیا' ہے جس میں انسان ہمیشہ رہے گا اور ایک 'عارضی دنیا' ہے جو آج کے انسان کی دنیا ہے۔ ازلی دنیا میں اللہ کی حکومت ہے اور اس کا حصول ہی انسان کا مقصد ہے۔ اس ازلی دنیا کا تعلق انسان کی روح سے ہے جبکہ عارضی دنیا کا تعلق انسان کے جسم اور اس کی ضروریات سے ہے۔ کلیساء کا تعلق اصل میں ازلی دنیا سے ہے۔ کلیساء آسمانوں میں جنت کے وسط میں واقع ہے اور اللہ کا گھر ہے اور کلیساء کے سربراہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ زمین پر موجود کلیساء اور اس کے اندر موجود پادری اور راہب روحانی طور پر آسمانی کلیساء کا حصہ ہیں۔ آگسٹین کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس ازلی دنیا میں کلیساء کا سر ہیں اور کلیساء کا باقی پورا نظام جسم کی مانند ہے۔ جس طرح سر اور جسم کا تعلق ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور کلیسا اور اس کے پادریوں کا تعلق ہے۔

اس عارضی دنیا میں کلیساء ہی اللہ کی بنائی ہوئی دنیا کا نمائندہ ہے۔ زمین پر وہ روم میں موجود ہے۔ کلیساء اور پوپ اس دنیا میں اللہ کے نائب اور اللہ کی حکومت کے سربراہ ہیں۔ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے آپ کو وقف کر دیں، وہ اللہ کی حکومت میں شامل ہیں جن میں پادری، بِشپ اور راہب وغیرہ شامل ہیں اور وہ اللہ کے شہر میں رہیں گے۔ اسی لیے آج بھی کلیساء روم کا شہر 'ویٹیکن' (Vatican) 'اللہ کا شہر' کہلاتا ہے۔ اللہ کی اس حکومت سے باہر انسانوں کی حکومت ہے۔ مگر انسانوں کی حکومت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اس حکومت سے آزاد ہو کر اپنی مرضی سے چلے بلکہ انسانوں کی یہ حکومت اللہ کی حکومت کے تحت ہی چلے گی۔ کلیساء ہی بادشاہ کو عوام پر حکومت کرنے کا خدائی اختیار دے گا۔ اس اختیار کے ذریعے وہ عوام کا جائز حکمران تصور ہو گا۔ اس لیے جائز بادشاہ وہی ہو گا جسے کلیساء بادشاہ بنائے گا۔ تمام انسانوں کو عیسائیت کے اس عقیدے کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنا ہو گی۔ بادشاہ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کو اس عقیدے کے مطابق لے کر چلے۔

ابتداء میں کلیساء دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک مشرقی حصہ تھا جس کا مرکز 'قسطنطنیہ' میں تھا اور اس کے بڑے پادری کو 'بطریقِ اعظم' (Ecumenical Patriarch) کہتے تھے۔ دوسرا مغربی حصہ تھا جس کا مرکز روم (اٹلی) میں تھا جس کے بڑے پادری کو 'پاپائے اعظم' (Pope) کہتے تھے۔ چونکہ عیسائیت کی ابتداء مشرق سے ہوئی تھی، اس لیے 'بطریق اعظم' بڑا تصور ہوتا تھا اور 'پاپائے روم' دوسرے نمبر پر آتا تھا۔ تاہم مغرب میں عیسائیت کے عروج کے ساتھ ساتھ 'پاپائے روم' کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ رفتہ رفتہ مشرقی کلیساء اور مغربی کلیساء میں اختلاف ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ قسطنطنیہ کا کلیساء 'مشرقی روایتی' (Orthodox) فرقے کا صدر مقام بن گیا اور روم میں موجود کلیساء 'رومن کیتھولک' فرقے کا مرکز بن گیا۔ اس طرح عیسائیت دو فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔

'پاپا' لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب 'باپ' ہے۔ یہ عیسائیت میں ایک لقب بن گیا ہے جو کلیسائے روم کے سب سے بڑے پادری کے لیے مخصوص ہے۔ عیسائیوں میں یہ عقیدہ بھی پھیل چکا تھا کہ یسوع مسیح اپنے چند برگزیدہ بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے جن کے اقوال و اعمال ہمارے لیے حجت ہیں۔ پھر چونکہ کلیساء کا یہ زعم تھا کہ ان میں سے سب سے زیادہ برگزیدہ بندے کو کلیسا کا پیشوا چنا جاتا ہے، لہٰذا پاپائے اعظم کا مقام یہ ٹھہرا کہ اس کا حکم اللہ کا حکم مانا جانے لگا اور عیسائیت کی بالادستی کا مکمل اختیار روم کے کیتھولک گرجے کو مل گیا۔ ان کے یہاں حاکمیتِ اعلیٰ کے اس تحریف شدہ تصور کا فطری تقاضا تھا کہ معاشرے میں بادشاہ اور جاگیردار سمیت تمام قوتیں کلیساء کی تعظیم اور پوپ کی اطاعت کریں۔

کلیساء کا نظام اور بادشاہ

چونکہ عیسائیوں کے ہاں انسان کی حکومت اس دنیا میں آزاد حکومت نہیں بلکہ وہ کلیساء ہی کے ماتحت ہوتی ہے، لہٰذا بادشاہ کلیساء کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت ہی حکومت کر سکتا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں 'شارلمین' پہلا بادشاہ تھا جس نے اس نظام کے تحت پاپائے روم 'گریگوری اول' کے ہاتھوں تاج پوشی کروائی تھی اور ساری زندگی اس نظام کو غالب کرنے کی کوششوں میں لگا رہا۔ اس نے پاپائے روم کے حکم پر بہت سے مشرک قبیلوں کو عیسائی بنایا اور اسی کے دور سے یورپ میں 'مقدس رومی سلطنت' (Holy Roman Empire) کا آغاز ہوا۔ انگلستان میں عیسائیت اسی کے دور میں پہنچی۔ دسویں صدی عیسوی میں اسی 'مقدس رومی سلطنت' کا اقتدار جرمن نسل کی قوموں کے ہاتھ میں آگیا، جنھوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس سلطنت کو بہت مضبوط کیا یہاں تک کہ تمام وسطی اور مشرقی یورپ اس کا باجگزار ہو گیا۔ 'ہولی رومن ایمپائر' نے سینٹ

آگسٹین کے دیے ہوئے نظام کو پوری طرح اپنایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'ہولی رومن ایمپائر' کی حکومت کمزور ہوتی گئی اور کئی حصوں میں بٹ گئی۔ اس طرح کئی ریاستیں بن گئیں، لیکن اس کے باجود انقلابِ فرانس تک یہ تمام ریاستیں کلیساء کی وفادار رہیں۔

سترھویں صدی عیسوی میں 'ہولی رومن ایمپائر' میں شامل ریاستوں کے درمیان تیس سالہ جنگ ہوئی جس کا اختتام 'ویسٹ فیلیا کے معاہدے' (Peace of Westphalia Treaty) پر ہوا۔ اس معاہدے سے یورپ میں نئی آزاد ریاستوں نے جنم لیا، جن میں فرانس، آسٹریا، جرمنی، بلجیم اور اٹلی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ آج کی جدید جمہوری وطنی ریاستوں (Nation States) کا آغاز تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب لادینیت کا فتنہ یورپ میں پنپتا رہا اور حقوقِ انسانی کی جنگ نے زور پکڑا تو ان ریاستوں کو 'آئینی ریاستیں' بنا دیا گیا۔ گو یہ ریاستیں خود مختار ہو گئیں، تاہم پھر بھی 'ہولی رومن ایمپائر' کی علامتی حیثیت قائم رہی۔ بالآخر ۱۸۰۶ء میں فرانس کے بادشاہ 'نپولین' (Napoleon) نے اسے بھی ختم کر دیا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی ان شاءاللہ۔

کلیساء کے نظام میں خرابیاں

اللہ کی حکومت اور انسان کی حکومت کا نظام گو ایک ہزار سال تک یورپ میں چلتا رہا مگر اس میں بہت سی خرابیاں تھیں۔ کلیساء چونکہ ایک سیاسی قوت بھی تھا اور روحانی قوت بھی، اس لیے جس طرح یورپ میں بادشاہوں کی نامزدگی میں پاپائے روم خاص کردار ادا کرتا تھا، اسی طرح یورپین ریاستوں کے ہر بادشاہ کی بھی خواہش ہوتی تھی کہ نئے پاپا کی نامزدگی کے وقت اس کی مرضی کا پاپائے روم تخت نشین ہو۔ دوسری طرف ہر بادشاہ کے ہاں کلیساء کا ایک نمائندہ بھی نامزد کیا جاتا تھا جسے کلیسائے روم نامزد کرتا تھا۔ ہر بادشاہ کی خواہش ہوتی تھی کہ اس کے ہاں کلیساء کا جو بھی نمائندہ نامزد ہو، اس کی مرضی سے ہو۔ یوں بادشاہ اور کلیساء کی ان خواہشات نے کلیساء اور باشاہوں میں ایک رسہ کشی کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اس کی بہت سی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں جن میں سے چند ایک ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

کلیساء اور بادشاہت کی رسہ کشی

یورپ کی تاریخ میں کلیساء اور بادشاہ کی رسہ کشہ میں فاتح وہ ہوتا تھا جو زیادہ طاقتور ہوتا تھا۔ جب کبھی پاپائے روم زیادہ طاقتور ہوتا تو وہ جیت جاتا اور جب بادشاہ زیادہ طاقتور ہوتا تو وہ فاتح قرار پاتا۔ اس جھگڑے کی ابتداء ہولی

رومن ایمپائر اور کلیساء کے مابین نئے پوپ کے انتخاب کے مسئلہ پر ہوئی۔ ہولی رومن ایمپائر چونکہ مضبوط تھی، اس لیے پوپ کے انتخاب پر اثر انداز ہوتی تھی۔ پاپائے روم کو کلیساء کے معاملات میں باشاہوں کی مداخلت کا بہت قلق تھا۔ جب 'ہنری اول' (Henry I) ہولی رومن ایمپائر کا بادشاہ بنا تو وہ بچہ تھا۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاپائے روم نے بادشاہ کی طرف سے پوپ کی نامزدگی کے اختیار پر اس بنیاد پر پابندی لگادی کہ یہ ایک خالص مذہبی معاملہ ہے اور غیر مذہبی لوگوں کو اس میں مداخلت کا اختیار نہیں ہے۔ پوپ کے انتخاب کے لیے دس ممبروں پر مشتمل پادریوں کا ایک بورڈ بنادیا گیا۔ جب ہنری بڑا ہوا تو اس نے پوپ کے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کردی۔ اس بغاوت کے جواب میں پاپائے روم نے اسے بادشاہت سے ہٹادینے کا فتویٰ دے دیا، عوام نے اس کے خلاف بغاوت کردی اور اس کے بیٹے کو بادشاہ بنادیا۔ ۱۱۲۲ء میں بادشاہ اور کلیساء میں ایک معاہدہ ہوا جس میں دس پادریوں کے بورڈ کو مان لیا گیا۔ آج تک یہی بورڈ نئے پاپائے روم کا انتخاب کرتا ہے۔

کلیساء اور بادشاہ کی رسہ کشی کی دوسری مثال پوپ 'بونی فَیس' (Pope Boniface) اور فرانس کے بادشاہ 'فلپ دی فیئر' (Philip, the Fair) کی لڑائی ہے۔ اس دور میں پاپائے روم بونی فَیس نے پورے یورپ کے بادشاہوں سے یہ مطالبہ کیا کہ انسان کی حکومت کا ہر فرد بلاواسطہ اللہ کی حکومت کے ماتحت کر دیا جائے۔ فرانس کے بادشاہ فلپ نے انکار کردیا۔ پاپائے روم نے فلپ کو معطل کردیا۔ فلپ مضبوط بادشاہ تھا، اس نے ۱۳۰۳ء میں پوپ بونی فَیس کو گرفتار کرلیا مگر تین دن بعد چھوڑ دیا۔ یہ مسئلہ چھ ماہ بعد پوپ کی موت سے ختم ہوگیا، مگر کلیساء اور بادشاہ کی رسہ کشی قائم رہی۔ اسی رسہ کشی کے تسلسل میں فرانس کے بادشاہ نے پورے کلیساء کو ایک طرح سے اغواء کرکے روم سے اٹھا کر فرانس کے شہر 'اوِنگون' (Avignon) میں بٹھادیا اور تقریباً ایک سو دس سال تک پاپائے روم فرانس کے بادشاہوں کے زیرِ اثر رہے۔ کلیساء اور بادشاہ کی رسہ کشی 'میگنا کارٹا' (Magna Carta) کے اس مشہور معاہدے میں بھی نظر آتی ہے جو عوام اور برطانیہ کے بادشاہ 'جون' (King John) کے درمیان ہوا تھا۔ اس معاہدے میں کلیساء نے عوام کا ساتھ دیا۔ اس معاہدے کی پہلی شق میں یہ درج ہے کہ بادشاہ کلیساء کے معاملات میں دخل نہیں دے گا۔ انگلستان کے بادشاہ 'ہنری دوم' (Henry II) کے ہاتھوں کلیساء کے نمائندے 'تھومَس بیکٹ' (Thomas à Becket) کا قتل اسی رسہ کشی کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح پہلی صلیبی جنگ میں یروشلم کا پادری مقرر کرنے میں کلیساء اور بادشاہوں میں رسہ کشی نظر آئی۔ یہ تو چند مثالیں تھیں ورنہ یورپ کی پوری تاریخ ان مثالوں

سے بھری پڑی ہے۔ اس رسہ کشی میں عوام کبھی کلیساء اور کبھی بادشاہ کے درمیان ایک تختہ مشق بنے رہتے تھے۔

کلیساء کی داخلی خرابیاں

یہ تو کلیساء اور بادشاہ کے تعلقات تھے، اس کے علاوہ کلیساء کے داخلی نظام میں بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ کلیساء میں رہبانیت کی وجہ سے بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئیں اور تاریخ پادریوں اور راہباؤں (Nun's) کے تعلقات اور ہم جنس پرستی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اس کے علاوہ خیرات کے مال میں خرد برد اور اس مال پر پادریوں کی پُر تعیش زندگی ایک عام سی بات بن گئی تھی۔

پھر کلیساء کی تاریخ میں معافی ناموں کی تقسیم ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر سامنے آیا۔ پوپ 'اِنوسینٹ دوم' (Innocent II) نے یہ رواج نکالا کہ جو بھی کلیساء کو رقم دے یا کلیساء بنادے، اس کو خصوصی 'معافی نامہ' دیا جاتا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس شخص کے گناہ معاف اور اب جنت اس پر واجب ہوگئی۔ ان معافی ناموں کے علاوہ کلیساء کی وہ بد نامِ زمانہ عدالتیں تاریخ میں مشہور ہوئیں جنھیں 'انکوزیشن' (Inquisition) کہا جاتا ہے۔ ان عدالتوں کے عتاب سے سپین کے مسلمان اور یہودی تو کیا، خود ان کے اپنے عیسائی عوام بھی محفوظ نہ تھے۔ تھوڑا سا بھی کسی نے کلیساء کی کسی بات سے اختلاف کیا تو جھٹ اس پر کفر اور الحاد کا مقدمہ قائم کر کے زندہ جلا دیا گیا۔ بے شمار مسلمان سپین میں زندہ جلائے گئے۔ بہت سے یہودی اور پروٹسٹنٹ عیسائی ان عدالتوں کی بھینٹ چڑھے۔

کلیسا کی تقسیم؛افتراقِ عظیم (۱۰۵۴ء)

قرونِ وسطیٰ کا ایک اہم واقعہ ۱۰۵۴ء میں رومن کیتھولک اور قسطنطنیہ کے کلیساء میں 'افتراقِ عظیم' (Great Schism) تھا۔ اس علیحدگی کی وجوہات نظریاتی، نسلی اور سیاسی تھیں۔ نظریاتی محاذ پر اختلاف بیٹے اور باپ کی فضیلت اور روح القدس کی حیثیت کے بارے میں تھا جبکہ نسلی اعتبار سے مشرقی کلیساء یونانی اور مغربی کلیساء اطالوی تھا۔ رومی سلطنت پہلے ہی دو حصوں میں بٹ چکی تھی اور یورپ میں دو سلطنتیں قائم ہوگئی تھیں؛ مشرقی یورپ میں روایتی کلیساء کے تحت 'بازنطینی سلطنت' قائم ہوئی اور مغربی یورپ میں خانہ جنگی کے بعد بالآخر شارلیمن کی بادشاہت میں 'رومن کیتھولک سلطنت' قائم ہوئی۔

مشرقی کلیساء 'آرتھوڈوکس' کے نام سے مشہور ہوا جس کا مرکز 'قسطنطنیہ' تھا اور اس کا پیشوا 'بطریقِ اعظم' کہلایا۔ آج بھی ترکی، شام، لبنان، آرمینیہ، روس اور وسطی ایشیائی ریاستوں میں موجود عیسائی اس روایتی کلیساء کے پیروکار ہیں۔ جبکہ مغربی کلیسا 'رومن کیتھولک' کے نام سے مشہور ہوا جس کا مرکز اٹلی کا شہر 'روم' ٹھہرا اور اس کا سربراہ 'پوپ' کہلایا۔ اسی شہر میں ایک سودس ایکڑ پر محیط ایک احاطہ ہے جس کا نام 'ویٹیکن' ہے جسے ۱۹۲۹ء میں اٹلی کی حکومت نے پاپائیت سے جان چھڑانے کے لیے پاپائے روم کے تحت 'آزاد کلیسائی ریاست' قرار دیا۔ ویٹیکین سٹی اب تک مغربی دنیا میں مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس مذہب کے پیروکار یورپ اور امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔ علیحدگی کے دوسو سال تک پاپائے روم دونوں کلیساؤں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اس میں اسے ابتدائی طور پر کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ مگر پاپائے روم کی طرف سے اتحاد کی کوششوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب ۱۲۰۲ء میں 'چوتھی صلیبی جنگ' میں صلیبی سپاہی جویروشلم کو فتح کرنے نکلے تھے، مالی مشکلات کا شکار ہوگئے۔ اپنی اس مالی مشکل کو دور کرنے کے لیے صلیبیوں نے 'قسطنطنیہ' پر حملہ کر دیا، خوب لوٹ مار کی اور تعصب کی بنا پر انھوں نے روایتی فرقے کے سب سے بڑے کلیساء 'آیا صوفیاء' کی بے حرمتی کی اور بطریقِ اعظم کی نشست پر ایک طوائف کو بٹھا کر گانے سنتے رہے۔ اس واقعے کے بعد یہ دونوں فرقے پھر کبھی ایک دوسرے کے قریب نہ آسکے۔

یورپ کا طبقاتی نظام، جاگیر دار اور عوام

جب بھی ہمارے سامنے جاگیر دارانہ نظام کا نام آتا ہے تو ہمارے ذہن میں ایک ظالم جاگیر دار یا زمیندار کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے جو اپنے مزارع سے بیگار کا کام لیتا ہے، اس کے بیمار بچے کے لیے پیسے نہیں دیتا، اس کی جوان بیٹی کو اغوا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ باتیں ہیں جو اس نظام کا ایک پہلو تو دکھاتی ہیں مگر اس کے اصل پہلو کو انسان کی نظروں سے غائب کر دیتی ہیں۔ جاگیر دارانہ نظام کسی علاقے کا نظم ونسق چلانے کا قدیم ترین نظام ہے جو بادشاہ اپنی حکومت چلانے کے لیے قائم کیا کرتے تھے۔ یہ نظام اسلامی خلافت کے بعض علاقوں میں بھی قائم تھا اور یہی نظام عیسائی یورپ، زار روس، قدیم چین اور ہندوستان میں بھی قائم تھا۔ یہ نظام بنی نوع انسان کا سب سے زیادہ چلنے والا اور سب سے کامیاب نظام رہا ہے۔ البتہ یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس نظام کی بنیادیں، اصول اور طریقہ کار ہر علاقے اور ہر بادشاہ کے لحاظ سے مختلف رہے ہیں۔ جہاں جہاں اس نظام میں یا بادشاہوں کی طرف سے جاگیر دار کے اختیارات میں عدمِ توازن قائم کیا گیا، یا بادشاہت کمزور پڑ گئی تو جاگیر دار خود علاقے کا بادشاہ بن گیا اور اس نے ظلم وجبر کا وہ بازار گرم کر دیا جو آج تاریخ کی کتابوں کا حصہ ہے۔ قرونِ

وسطیٰ میں یورپ کے ان اختیارات کے عدمِ توازن کی وجہ سے ہی عوام میں وہ ردِ عمل پیدا ہوا جس کے نتیجے میں یورپ میں 'حقوقِ انسانی' کی جدوجہد کا آغاز ہوا اور جس نے بعد میں موجودہ 'جمہوریت' کی شکل اختیار کی۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ عصر حاضر کے جہاد کی فکری بنیادوں کو سمجھنے کے لیے مسلمانوں اور مجاہدین کو جاگیر داری کے نظام کو تفصیل سے سمجھنا ضروری ہے۔ ہم اس نظام کو یہاں ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔

بادشاہوں کے نزدیک جاگیرداری کے نظام کو قائم کرنے کے تین بڑے مقاصد ہوا کرتے تھے۔ اس نظام کا پہلا مقصد معاشی فوائد کا حصول، دوسرا مقصد علاقے کا نظم و نسق چلانا جبکہ تیسرا مقصد عسکری قوت کی فراہمی تھا۔ زمانہ قدیم کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا اور زراعت زمین کی زرخیزی پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لیے بادشاہ جب ایک علاقے کے نظم و نسق کی ذمہ داری کسی کو دیتا تو زرخیز زمین کا بہت بڑا خطہ اسے دے دیا جاتا تھا۔ اس جاگیر دار کی یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ اس زمین کی پیداوار اور اس کی آمدنی سے علاقے کا نظم و نسق چلائے۔ یہاں پر اس نظام کی بنیادوں میں ایک بہت بڑا فرق زمین کی ملکیت پر پیدا ہوتا تھا کہ آیا یہ زمین بادشاہ نے جاگیر دار کو ذاتی طور پر دے دی ہے یا اس زمین کی ملکیت حکومت کے پاس ہے اور جاگیر دار صرف اس کا انتظام کر سکتا ہے۔ پہلی صورت میں جب زمین زمیندار کی ملکیت میں دے دی جاتی تو وہ زمین دار اس علاقے میں بہت مضبوط ہو جاتا اور اس کی اولاد آنے والے وقتوں میں اس علاقے کی بادشاہ بن جاتی۔

یورپ کے نظام میں سب سے بڑی خرابی بادشاہ کی طرف سے زمین کو جاگیر دار کی ملکیت میں دینا تھا۔ اس ملکیت کی وجہ سے یورپ میں جاگیرداروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جو رفتہ رفتہ اتنا طاقتور ہو گیا کہ اس نے عملی طور پر عوام کو اپنا غلام بنا لیا۔

اس کے برعکس مسلمانوں میں یہ نظام مختلف طریقے سے چلتا تھا۔ زمین دیتے ہوئے بادشاہ زمیندار کی ملکیت اور حکومت کی ملکیت کی زمینوں میں فرق کرتا تھا۔ اکثر جس زمین سے علاقے کا نظم و نسق چلانا مقصود ہوتا، وہ حکومت کی ملکیت رہتی جس کی وجہ سے طبقہ خواص اور طبقہ عوام میں زیادہ فرق نہ ہوتا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ اسلامی دنیا میں شریعت نافذ تھی اور زکوۃ و عشر کا نظام قائم تھا۔ زمیندار اور مزارع کے درمیان واضح عادلانہ شرعی اصول موجود تھے جس کی وجہ سے کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ مسلمانوں کے یہاں بھی جاگیرداری کی موجودہ بگڑی ہوئی ظالمانہ شکل میں تب سامنے آئی جب وہ اپنے دین کے احکامات پر عمل چھوڑ بیٹھے۔ جبکہ یورپ میں عیسائیت کے پاس کوئی شریعت نہ تھی۔ اس لیے یہ نظام پاپائے روم یا بادشاہ کے اپنے بنائے ہوئے قانون سے چلتا تھا۔ ان قوانین میں طبقہ اشرافیہ کے لیے تو سہولتیں رکھی جاتیں جبکہ عوام پر سارا

بوجھ ڈال دیا جاتا تھا۔

جاگیرداری نظام کا دوسرا مقصد علاقے کا نظم ونسق چلانے کے لیے اخراجات کی فراہمی تھا۔زمینی پیداوار کی فروخت سے علاقے کے قاضیوں، پولیس اور دیگر حکومتی اہل کاروں کی تنخواہیں نکلتی تھیں۔ اس کے علاوہ علاقے میں ترقیاتی کاموں کے اخراجات بھی اسی زمین سے نکلتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نظام علاقے کی انتظامی اور بلدیاتی ضروریات بھی پوری کرتا تھا۔ اس نظام کا تیسرا مقصد بادشاہِ وقت کے لیے بوقتِ ضرورت فوجی کمک کی فراہمی بھی ہوتا تھا۔اسی طرح اس زمین سے خاص تعداد کی فوج کی تنخواہیں اور گھوڑوں کی خوراک بھی اس جاگیردار کی ذمہ داری ہوتی تھی۔اس بحث سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ جاگیرداری کا نظام جاگیردار کو محض اختیار ہی نہیں دیتا تھا، بلکہ ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔

یورپ میں یہ ہوا کہ یہ نظام ذمہ داری اور اختیارات کے مابین عدمِ توازن کی وجہ سے ظلم وجبر کی علامت بن گیا۔ زمین کو جاگیردار کی ملکیت میں دینے کی وجہ سے یورپی معاشروں میں طبقاتی نظام رائج ہو گیا۔ پاپائے روم اور کلیسا سے بڑھ کر تو کوئی نہ تھا۔ان کے بعد شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے طبقہ کو سب سے اونچا تصور کیا جاتا تھا۔ پھر طبقہ اشرافیہ تھا جس میں جاگیردار، فوج کے بڑے عہدیدار یا نائٹس اور علاقے کے پادری وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ معاشرے کے باقی تمام افراد طبقہ عوام تھے۔ برطانیہ میں انھیں ''کومنز'' (Commons) کہا جاتا تھا[30]۔اس زمانے میں عملی طور پر عام یورپی کی حیثیت ادنیٰ غلام سے بڑھ کر نہ تھی جس کا کام محض جاگیردار کی خدمت کرنا تھا۔اس کے عوض اسے جو بھی مل جاتا،اسی پر صبر وقناعت میں وہ اپنی عافیت پاتا۔عام آدمی کو اتنا اختیار بھی نہ تھا کہ اگر وہ کسی جاگیردار سے تنگ ہو تو اپنی مرضی سے دوسرے کے یہاں جا کر کام کر لے یا تمام جاگیرداروں سے ہٹ کر کسی غیر آباد زمین کو آباد کرے۔یہ ایک ایسا جرم تھا جس کا انجام قید وبند کی اذیت یا موت تھا۔

کلیساء، بادشاہ اور جاگیردار کا 'شیطانی مثلث'

اس طرح پاپائیت، بادشاہت اور جاگیردارانہ نظام نے ظلم وجبر کی تکون بنا رکھی تھی۔ معمولی باتوں کی بنا پر عوام الناس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جاتے۔ان سے اناج لینے کے بعد ان کی خوراک کی ضروریات بھی پوری

---

[30] یہی وہ طبقہ تھا جس نے حقوقِ انسانی کی جنگ شروع کی۔ پھر 'میگنا کارٹا' (معاہدے) کے نتیجے میں ان کے کچھ حقوق مانے بھی گئے اور ان کا ایک اتحاد قائم کیا گیا جسے 'ہاؤس آف کومنز' کہا گیا۔آج برطانیہ کی پارلیمنٹ کو اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

نہ کی جاتیں۔ دولت جمع کرنا تو گویا ان پر حرام تھا۔ تاجر اور دیگر پیشہ ورانہ افراد پر ان کی استطاعت سے زیادہ ٹیکس لاگو کیا جاتا اور جو نہ ادا کر سکتا، اسے اور اس کے کاروبار کو اتنا نقصان پہنچایا جاتا کہ وہ اپنی روزی سے ہمیشہ کے لیے ہی محروم ہو جاتا۔ ان کے گھر اور ان کی عصمتیں بھی محفوظ نہ تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ سارا کام کلیساء کے سایے میں اللہ کے نام پر ہوتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے عوام کے سامنے ایک طرف کلیساء تھا تو دوسری طرف بادشاہ اور تیسری طرف جاگیر دار۔ عوام کی حیثیت ان تینوں کی رسہ کشی میں ایک غلام کی سی تھی۔ یہی وہ حالات تھے جنھوں نے یورپ میں لادینیت کے لیے ایک خلاء پیدا کر دیا۔ اسی لادینیت سے حقوقِ انسانی کی جنگ نے جنم لیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک پورے جمہوری نظام کی صورت میں نمودار ہوئی۔

میگنا کارٹا یا آزادی کا میثاقِ عظیم (۱۲۱۵ء)

اپریل ۱۱۹۹ء میں یورپ کے صلیبی ہیرو اور انگلستان کے بادشاہ 'رچرڈ' (Richard, the Lion-Hearted) کی موت کے بعد اس کا بھائی 'جون اول' (John I) انگلستان کے تخت پر بیٹھا۔ جون اول اپنی بادشاہت کے آغاز ہی میں اس وقت مشکلات کا شکار ہو گیا جب اس کے اور پاپائے روم کے درمیان انگلستان کا بِشپ (بڑا پادری) نامزد کرنے پر اختلاف ہو گیا۔ پاپائے روم اپنی مرضی سے ایک شخص کو انگلستان کا پادری بنانا چاہتا تھا جبکہ بادشاہ جون دوسرے شخص کو بنانا چاہتا تھا۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھ گیا کہ پاپائے روم نے بادشاہ جون کو بادشاہت سے معطل کر دیا اور فرانس کے بادشاہ کو اپنے مقبوضات واپس لینے کی اجازت دے دی۔ اس معطلی نے بادشاہ جون کے لیے صورتِ حال بہت خراب کر دی۔ بادشاہ کی اس معطلی کے دوران انگلستان کے تمام کلیساؤں میں عبادات بند ہو گئیں۔ عوام میں اضطراب بڑھ گیا اور دوسری طرف جاگیر داروں نے بھی بادشاہ جون اول کے خلاف بغاوت کر دی۔

جون اول کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنی بادشاہت بچانے کے لیے کلیساء کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ تاہم بادشاہ کے خلاف جاگیر داروں اور عوام کی بغاوت بدستور جاری رہی۔ اس بغاوت کو ختم کرنے کے لیے بادشاہ نے کلیساء سے مدد کی درخواست کی۔ کلیساء نے اس بغاوت کو ختم کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بادشاہ، عوام اور جاگیر داروں کے درمیان باقاعدہ معاہدہ طے پایا جسے لاطینی زبان میں لکھا گیا۔ اس معاہدے کو تاریخ میں 'میگنا کارٹا' (Magna Carta) یا 'آزادی کا میثاقِ عظیم' کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت بادشاہ نے عوام کے کچھ حقوق مان لیے جن میں سے ایک 'بغیر کسی جرم کے گرفتار

کرنے" کا معاملہ تھا، جسے آج کی قانونی اصطلاح میں حبسِ بے جا کا قانون کہتے ہیں۔ دوسری چیز جو اس معاہدے میں شامل تھی، وہ ایک عوامی کونسل کا قیام تھا۔ گو اس کونسل کا کام صرف عوامی معاملات میں بادشاہ کو مشورے دینا تھا مگر یورپ کے مؤرخین اس کو پارلیمنٹ کے قیام کی طرف پہلا قدم قرار دیتے ہیں۔ اور واقعتاً ایسا ہی ہوا، جب صرف ایک صدی کے اندر بادشاہ جون کے پوتے 'ایڈورڈ اول' (Edward I) نے ایک پارلیمنٹ کی بنیاد رکھ دی۔ یہ نہ صرف انگلستان بلکہ یورپ کی پہلی پارلیمنٹ تھی۔ میگنا کارٹا کے اس معاہدے نے بادشاہ ولیم کا بنایا ہوا وہ قدیم قانون بھی ختم کر دیا جس کے تحت بادشاہ نے انگلستان کی ایک تہائی زمین شاہی جنگلات کی مد میں دبائی ہوئی تھی۔

بہر حال میگنا کارٹا کے معاہدے کا یورپ کی دنیا پر آنے والے سالوں میں بہت ہی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ میگنا کارٹا آج کے جمہوری نظام میں موجود ہر آئین اور آج انسان کے بنائے ہوئے جدید قانون کا ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ پھر میگنا کارٹا ہی آج کی حقوقِ انسانی کی جنگ کا آغاز ہے جو بعد میں آنے والے سالوں اور صدیوں میں مغرب کا ایک ہتھیار رہا ہے اور آج بھی ہے۔ میگنا کارٹا ہی مغرب میں سیکولرازم کے پنپنے کا دروازہ ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں سیکولر افکار کا آغاز

قرون وسطیٰ میں لادینیت کے جراثیم یورپ کے معاشرے میں پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مؤرخین اس کی تین وجوہات بتاتے ہیں؛ پہلی وجہ 'میگنا کارٹا' کا معاہدہ، دوسری وجہ 'آکسفوڈ' اور 'کیمرج' کی یونیورسٹیوں کا قیام اور تیسری وجہ پیرس کی یونیورسٹی سے یونانی فلسفے کے استادوں کا اخراج تھا، جو بعد میں آکسفوڈ اور کیمرج یونیورسٹیوں میں آکر پڑھانے لگے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ میگنا کارٹا کے معاہدے کے تحت انگلستان کے گوشے گوشے میں بہت سے جنگلات عام لوگوں کے استعمال میں آ گئے۔ ان زمینوں کی آبادکاری سے نئے معاشرے وجود میں آنا شروع ہو گئے۔ عوامی طبقے سے تعلق رکھنے والے پیشہ ور، ہنر مند، تاجروں اور مزدوروں نے جو پاپائیت اور جاگیردارانہ نظام کے ظلم وجبر سے تنگ آ چکے تھے، شہروں سے دور بھاگ کر آبادکاری شروع کر دی۔ اس طرح مختلف ٹاؤن بننا شروع ہو گئے جہاں تجارت اور صنعت نے فروغ پایا۔ ان کے ہنر مند اور تجارت پیشہ ہونے کے سبب انھی سے یورپ میں صنعت، تجارت اور جدید معیشت کا آغاز ہوا، اور انھیں 'گلڈ' (Guilds) کہا جانے لگا۔ آغاز میں ان آبادیوں کو بادشاہ یا کلیساء کی طرف سے کسی قسم کے شہری حقوق حاصل نہ تھے اور چونکہ اس زمانے میں تعلیم دینا صرف کلیساء کے اختیار میں تھا، لہٰذا 'گلڈ آبادیوں' میں تعلیم کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں ان دھتکارے ہوئے عوام کی طرح پیرس کی یونیورسٹی کے کئی دھتکارے ہوئے اساتذہ بھی

تھے جنھیں کلیساء نے اس لیے لادین قرار دیا تھا کہ انھوں نے یونانی فلسفہ اور منطق پڑھنے کے بعد عیسائیت کی بعض بنیادی تعلیمات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ ایسے نظریات کو کلیساء نے 'ہیریسی' (Heresy) یا ارتداد کا نام دیا تھا۔ فرانس سے نکلے ہوئے یہ لادین استاد انگلستان پہنچے اور ان معاشروں میں انھیں بچوں کی ایک ایسی کھیپ میسر آگئی جو کلیساء کی نظروں اور اس کے نظامِ تعلیم سے دور تھے۔ اس طرح گلڈ معاشروں میں لادینیت پھیل گئی۔ آنے والی دو صدیوں میں 'کیمبرج' اور 'آکسفورڈ' کے مقام پر قائم گلڈ معاشروں میں قائم ہونے والے تعلیمی ادارے پورے یورپ میں اس قدر مشہور ہوئے کہ پورا یورپ ان سے اپنی علمی پیاس بجھانے پر مجبور ہو گیا۔ یہ تعلیمی ادارے آج 'کیمبرج' اور 'آکسفورڈ یونیورسٹی' کے نام سے مشہور ہیں جو اب امتِ مسلمہ میں پچھلے ڈیڑھ سو سال سے مسلسل منافقین کی فوجیں تیار کر کے بھیج رہے ہیں۔ ان تعلیمی اداروں کے تحت ایک 'سائنٹیفک سوسائٹی' تشکیل دی گئی جس کا مقصد بظاہر پوری دنیا میں ہونے والی سائنسی تحقیق اور مقالہ جات کو جمع کر کے شائع کرنا تھا تاکہ سائنس کی ترقی اور فروغ میں مددگار ثابت ہوں۔ مگر درحقیقت اس کی آڑ میں سائنس نے عیسائی عقائد کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ یوں یورپ میں مذہب اور سائنس کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔

ان معاشروں نے انگلستان میں لادینیت کی ایک مسلسل تحریک برپا کر رکھی تھی۔ حکمرانوں اور ان لادین عامیوں کے درمیان حقوقِ انسانی کے نام پر بہت سی فکری، سیاسی اور عسکری جنگیں ہوئیں جس کے نتیجے میں 'میگنا کارٹا' کے تحت قائم پارلیمنٹ کو زیادہ اختیارات ملتے گئے۔ انگلستان میں برپا ہونے والے واقعات کی بازگشت جیسے ہی یورپ میں پھیلی تو کلیساء نے فرانس میں اس لادینیت کا مقابلہ انتہائی جبر سے کیا۔ فرانس کے بادشاہوں نے جو خود بھی راسخ العقیدہ عیسائی تھے، کلیساء کا بھرپور ساتھ دیا۔

وائی کلف کی اصلاحی تحریک (۱۳۸۴ء)

قرونِ وسطیٰ میں کلیساء کی بہت سی بدعنوانیاں سامنے آنا شروع ہو گئی تھیں۔ ان بدعنوانیوں کے خلاف کہیں کوئی جرأت سے بولتا تو اس کی زبان بند کر دی جاتی۔ ایسی ہی ایک تحریک 'جان وائی کلف' (۱۳۳۰ء-۱۳۸۴ء) کی تحریک تھی۔ 'وائی کلف' (John Wycliffe) کو 'ریفارمیشن' (اصلاح) کا ستارہ کہا جاتا ہے۔ وائی کلف نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہیں تدریس شروع کی تھی۔ ساتھ میں وہ کلیسائے روم سے علیحدہ آزاد مقامی چرچ میں پادری کے فرائض بھی انجام دیتا رہا۔ اسے شہرت تب ملی جب پاپائے روم نے برطانیہ کے بادشاہ 'ایڈورڈ سوم' (Edward III) سے

مزید بھتے کا مطالبہ کیا۔ وائی کلف نے پوپ کے خلاف اور پارلیمنٹ کے حق میں کئی پمفلٹ شائع کیے جس کے نتیجے میں بادشاہ نے مسئلے کے حل کے لیے پوپ کے نمائندوں کے ساتھ ہونے والی کانفرس میں اسے بھی نمائندہ مقرر کیا۔

اگرچہ کانفرس ناکام رہی مگر وائی کلف کو پارلیمنٹ میں شہرت حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد وائی کلف نے ایسی کتاب لکھی جس میں چرچ آف انگلینڈ پر بددیانتی کا الزام آتا تھا اور ساتھ ہی آکسفورڈ میں اپنے ساتھیوں کے تعاون سے لاطینی بائبل کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا جو کہ اس وقت بحکمِ کلیساء حرام تھا۔ اس بناپر اسے عیسائی عدالت میں پیش ہونا پڑا اور عدالت نے فتویٰ دیا کہ وہ 'ہیریطی' (Heretic) یعنی 'بددین' ہے۔ اس کے نتیجے میں اسے آکسفورڈ سے نکال دیا گیا مگر اس نے اپنا مشن جاری رکھا۔ اس نے اپنے آزاد چرچ میں پادری کے فرائض باقاعدگی سے انجام دینا شروع کر دیے اور مبلغین کی ایک کھیپ تیار کی جنھوں نے اس کے نظریات کو انگلستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔

اس کی بنیادی تعلیمات حسبِ ذیل تھیں:

- اللہ کے ساتھ تعلق کے لیے کسی پادری یا گرجا کی ضرورت نہیں ہے۔
- عیسائی کتبِ مقدسہ کے ساتھ براہِ راست تعلق قائم کر کے خود اپنی زندگیوں کو منضبط کر سکتے ہیں۔
- عیسائی علماء کو چاہیے کہ وہ انجیل میں مذکورہ مسیح اور اس کے حواریوں کی فقیرانہ طرز کی تقلید کریں۔
- عیسائیت میں جنگوں اور غلامانہ مزدوری کا کسی طرح جواز نہیں پایا جاتا۔

۱۳۸۴ء میں اس کی وفات کے بعد اس کے شاگردوں نے ترجمہ شدہ انجیل کو بڑے پیمانے پر شائع کیا مگر براہِ راست اس کے شاگردوں میں سے کوئی تحریک کو دوام نہ دے سکا۔ اس کے بعد بہت سی اصلاح پسند شخصیات نے جنم لیا جن میں 'بوہیمیا' (Bohemia) کا 'جون ہس' (John Huss) نہایت مشہور ہے۔ اس مذہبی مصلح نے وائی کلف کے نظریات کا پرچار کیا تو اسے بحکمِ کلیساء زندہ جلا دیا گیا۔ خود وائی کلف کی لاش کو بھی ۱۴۲۸ء میں ایک فتویٰ کی بناپر نکال کر جلایا گیا۔ البتہ ان شخصیات کے بعد سولہویں صدی میں 'مارٹن لوتھر' کی اصلاحی تحریک کو کامیابی نصیب ہوئی جس کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔ مارٹن لوتھر نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وائی کلف کا اس پر بھاری قرض ہے۔

صلیبی جنگیں (۱۰۹۵ء تا ۱۲۷۱ء)

قرونِ وسطیٰ کا ایک اور اہم واقعہ صلیبی جنگوں کا وقوع پذیر ہونا ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں صلیبی جنگیں اللہ کے نبی ﷺ کی زندگی میں ہی شروع ہو چکی تھیں۔ 'جنگِ موتہ' وہ پہلی جنگ تھی جو مسلمانوں اور رومی عیسائیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پہلی دفعہ مسلمان جرنیل کے طور پر سامنے آئے۔ نبی ﷺ کی زندگی میں دوسری صلیبی جنگ 'جنگِ تبوک' تھی جس میں اللہ کے نبی ﷺ خود بھی شریک ہوئے مگر یہاں لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ رومی صلیبیوں سے دوسری بار مسلمانوں کا آمنا سامنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا جس میں صحابہ کرامؓ کو شام کی فتوحات نصیب ہوئیں۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں 'قسطنطنیہ' کی بازنطینی حکومت کے ساتھ مسلمانوں کی جنگیں جاری رہیں۔ قسطنطنیہ کی فتح مسلمانوں کا ہمیشہ سے خواب رہا ہے کیونکہ اس کے فاتح لشکر کو اللہ کے نبی ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی۔ اسی فضیلت کے پیشِ نظر صحابہ کرامؓ اپنی کبر سنی کے باوجود قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے لشکر کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک مہم میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے شرکت کی تھی اور ان کی وفات بھی وہیں ہوئی اور وہ قسطنطنیہ کے قلعہ کی دیوار کے ساتھ ہی دفن کیے گئے۔

بعد کے ادوار میں سلجوقی سلطانوں کی بازنطینی حکومت سے ہونے والی لڑائیاں بھی 'صلیبی جنگیں' ہیں۔ تاہم تاریخ میں دسویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہو کر تیرہویں صدی عیسوی تک جاری رہنے والی جنگیں 'صلیبی جنگوں' (Crusade Wars) کے طور پر زیادہ مشہور ہوئیں۔ شاید اس کی بنیادی وجہ صلیبیوں کا بیت المقدس کو حاصل کرنے کا مذہبی جنون تھا اور بیت المقدس کا پہلی دفعہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلنا بھی مسلمانوں کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ تھا۔ پھر شاید اس شہرت کی وجہ 'عماد الدین زنگی'، 'نور الدین زنگی' اور 'صلاح الدین ایوبی' رحمہم اللہ کی قیادت بھی تھی جس نے امتِ مسلمہ کی کھوئی ہوئی متاع واپس حاصل کی، اور شاید اس کی وجہ سلطان 'ظاہر بیبرس' کی ذات بھی تھی جس نے نہ صرف 'ہلاکو خان' کو 'عینِ جالوت' کی جنگ (Battle of Ayn Jalut) میں شکست دی بلکہ صلیبیوں کو فلسطین سے نکال کر پونے دو سو سالہ جنگ کا خاتمہ کر دیا۔

صلیبی جنگیں یہاں پر ہی ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ 'سلطنتِ عثمانیہ' کے دور میں ہونے والی مشرقی اور وسطی یورپ کی جنگیں بھی 'صلیبی جنگیں' ہی تھیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ اور فرانس کا امتِ مسلمہ پر قبضہ بھی 'صلیبی جنگ' ہی تھی مگر مختلف طرز کی جنگ تھی۔ انیسویں صدی کی ان جنگوں کو

'صلیبی صہیونی جنگ' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان جنگوں کا ذکر ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں تفصیل سے کریں گے۔ اس وقت ہم قرونِ وسطیٰ میں پونے دو سو سال تک جاری رہنے والی 'صلیبی جنگوں' کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

پہلی صلیبی جنگ (۱۰۹۵ء تا ۱۰۹۹ء)

پہلی صلیبی جنگ کا آغاز ۱۰۹۵ء میں پاپائے روم پوپ 'اربن دوم' (Pope Urban II) کے فتویٰ سے ہوا تھا۔ پاپائے روم نے عیسائی دنیا کے دورے کر کے تمام بادشاہوں کو بیت المقدس اور فلسطین کی مقدس سرزمین بازیاب کرانے پر آمادہ کیا۔ پے درپے حملے کرنے کے بعد مشترکہ یورپ کی صلیبی افواج فلسطین اور شام کے بڑے علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اور ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس پر بھی قبضہ کر لیا جہاں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ایسا وحشیانہ برتاؤ کیا جس کی تاریخ میں کم ہی مثال ملتی ہے۔ تاریخ دان بیان کرتے ہیں کہ بیت المقدس میں صلیبیوں کے گھوڑے گھٹنوں تک مسلمانوں کے خون اور لوتھڑوں میں ڈوب گئے تھے۔

دوسری صلیبی جنگ (۱۱۴۷ء تا ۱۱۴۹ء)

دوسری صلیبی جنگ کا آغاز حلب کے امیر 'عمادالدین زنگی' رحمہ اللہ کے صلیبی شہر 'اڈیسہ' پر قبضہ کرنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب بدقسمتی سے مسلمانوں کے داخلی حالات بہت خراب تھے۔ سلجوقی بادشاہ جو کسی زمانے میں مسلمانوں کے عروج اور سطوت کا نشان مانے جاتے تھے، اب زوال کا شکار تھے۔ 'خلیفہء بغداد' اور سلجوقوں کے مابین بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سلجوقوں میں اگرچہ 'سلطان مسعود' اور 'سلطان سنجر' موجود تھے جو کافی مضبوط سلطان شمار کیے جاتے ہیں، مگر وہ بھی داخلی خانہ جنگیوں اور خلیفہ کے ساتھ غلط فہمیوں کی وجہ سے امتِ مسلمہ کے اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ نہ دے پا رہے تھے۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے اتابکی خاندان میں سے 'عماد الدین زنگی' رحمہ اللہ کو 'موصل' ملکِ شام میں عروج عطا فرمایا۔ عماد الدین زنگی کا دل صلیبیوں کے فلسطین کے اس قبضے سے ہر وقت کڑھتا رہتا تھا۔ اس نے شام اور فلسطین کو صلیبیوں کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے منظم مہم کا آغاز کیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ شام کے شہر 'اڈیسہ' (Edessa) کو فتح کرنا تھا جو اس وقت صلیبیوں کی رسد کا اہم مرکز تھا۔ اڈیسہ کی فتح سے پورے یورپ میں آگ لگ گئی۔ فرانس کا بادشاہ 'لوئی ہفتم' (Louis VII) اور مقدس روم کا فرمانروا 'کونراڈ سوم' (Conrad III) پاپائے روم کے حکم سے اپنی اپنی فوجیں لے کر نکلے۔ اس وقت عمادالدین زنگی رحمہ اللہ کا

بیٹا 'نورالدین زنگی' رحمہ اللہ موصل کا حاکم بن چکا تھا۔ صلیبوں نے دمشق پر حملہ کر دیا جو اس وقت ایک آزاد حکومت تھی اور اپنا دفاع نہیں کر سکتی تھی۔ نورالدین زنگی نے نہ صرف دمشق کا دفاع کیا بلکہ اس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس طرح دوسری صلیبی جنگ میں صلیبیوں کو منہ کی کھانا پڑی۔

تیسری صلیبی جنگ (۱۱۸۷ء تا ۱۱۹۲ء)

تیسری صلیبی جنگ 'صلاح الدین ایوبی' رحمہ اللہ کے فلسطین پر حملے اور بیت المقدس کی فتح کے بعد سے شروع ہوئی۔ نورالدین زنگی رحمہ اللہ نے 'شیر کوہ' کو مصر کا گورنر بنایا۔ شیر کوہ کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا صلاح الدین ایوبی مصر کا گورنر بنا۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد ہی بیت المقدس کی آزادی رکھا۔ 'حطین' کی مشہور لڑائی میں سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے صلیبی فوجوں کو شکست دے کر بیت المقدس کو فتح کر لیا۔ بیت المقدس میں شکست کی خبر سن کر پورے یورپ میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ انگلستان، فرانس اور جرمنی کے بادشاہ اپنی اپنی فوجوں کو لے کر نکلے۔ یہ تیسری صلیبی جنگ تھی۔ انگلستان کے بادشاہ 'رچرڈ' نے عکہ اور جافہ کو فتح کر لیا مگر بیت المقدس فتح نہ کر سکا اور سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کے ساتھ معاہدہ کر کے واپس چلا گیا۔

چوتھی صلیبی جنگ (۱۲۰۲ء تا ۱۲۰۴ء)

۱۱۹۸ء میں پوپ 'انوسینٹ سوم' (Innocent III) پاپائے روم بنا۔ اس نے ایک دفعہ پھر بیت المقدس کو فتح کرنے کی مہم شروع کر دی۔ ۱۲۰۲ء میں فرانس اور بہت سی ریاستوں نے اپنی فوجیں بھیجنا شروع کر دیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ یہ فوج اٹلی کے شہر 'وینس' (Venice) سے سمندر کے راستے مصر کے لیے روانہ ہو گی۔ اس سفر کے لیے ۸۱۰۰۰ چاندی کے سکے چاہیے تھے مگر صلیبیوں کے پاس اس وقت صرف ۵۱۰۰۰ چاندی کے سکے تھے۔ صلیبیوں کی یہ مہم شروع سے ہی مالی مشکلات کا شکار تھی۔ اس مالی مشکل سے نکلنے کے لیے انھوں نے ہنگری کی عیسائی ریاست 'زارا' (Zara) کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد بازنطینی قسطنطنیہ کو بھی فتح کیا، وہاں لوٹ مار کا ایسا بازار گرم کیا کہ عیسائی مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ اگر مسلمان اس شہر پر قبضہ کرتے تو یہ کچھ نہ کرتے جو ان صلیبیوں نے کیا۔ یہ مہم بھی یروشلم کی طرف روانہ نہ ہو سکی اور عیسائی علاقوں میں ہی اختلافات کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔

پانچویں صلیبی جنگ (۱۲۱۷ء تا ۱۲۲۱ء)

پانچویں صلیبی جنگ میں 'ہنگری' اور 'آسٹریا' کے بادشاہوں نے حصہ لیا اور انھوں نے مصر پر حملہ کر دیا۔ 'سلطان الکامل' کے خلاف کچھ ابتدائی کامیابوں کے بعد ان صلیبیوں کو بالآخر شکست ہوئی اور یہ آٹھ سال کا امن معاہدہ کر کے واپس ہو گئے۔

چھٹی صلیبی جنگ (۱۲۲۸ء تا ۱۲۲۹ء)

ہولی رومن ایمپائر کے بادشاہ 'فریڈرک دوم' (Frederick II) نے بیت المقدس کو فتح کرنے کی قسم کھائی۔ اس وقت 'سلطان الکامل' کی حکومت کمزوری کا شکار ہو چکی تھی۔ بہت سی لڑائیوں کے بعد الکامل نے فریڈرک دوم کے ساتھ دس سالہ امن معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کے تحت یروشلم، ناصرہ اور بیت اللحم دس سال کے لیے عیسائیوں کو دے دیے گئے جب کہ مسجدِ اقصیٰ اور گنبد صخریٰ مسلمانوں کے پاس رہا۔ ۱۲۴۴ء میں مسلمانوں نے یہ تمام علاقے واپس لے لیے، جس کے نتیجے میں ساتویں صلیبی جنگ شروع ہو گئی۔

ساتویں صلیبی جنگ (۱۲۴۸ء تا ۱۲۵۴ء)

۱۲۴۴ء میں تاتاریوں کے حملے سے پسپا ہو کر مصر جانے والی خوارزمی فوج نے یروشلم میں موجود صلیبی فوج کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے جواب میں فرانس کے بادشاہ 'لوئی نہم' (Louis IX) نے مصر پر حملہ کر دیا۔ فرانس کے بادشاہ نے 'توران شاہ' کے ہاتھوں عبرتناک شکست کھائی اور اس جنگ میں خود بھی گرفتار ہوا۔ بعد میں ۵۰،۰۰۰ سونے کے سکے تاوان میں ادا کر کے رہا ہوا۔ اس جنگ کی خاص بات یہ تھی کہ یہ جنگ 'الملک الظاہر بیبرس' کے عروج کی جنگ تھی جس نے بعد میں نہ صرف ہلاکو خان کی فوجوں کو بلکہ صلیبی فوجوں کو فیصلہ کن شکست دی۔

آٹھویں صلیبی جنگ (۱۲۷۰ء)

فرانس کے بادشاہ 'لوئی نہم' نے ۱۲۷۰ء میں آٹھویں صلیبی جنگ کا آغاز کیا۔ اس دفعہ صلیبیوں نے اس مہم کا آغاز شمالی افریقہ سے کیا۔ لوئی نہم اپنی فوجوں کے ساتھ تیونس میں اترا مگر وہاں بیمار ہو کر مر گیا۔ یوں یہ مہم بھی ختم ہو گئی۔

نویں صلیبی جنگ (۱۲۷۱ء تا ۱۲۷۲ء)

لوئی نہم کی موت کے بعد انگلستان کے بادشاہ نے نویں صلیبی جنگ کو آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اسی دوران مصر کے مملوک سلطان بیبرس نے 'عینِ جالوت' کے مقام پر ہلاکو خان کی فوج کو عبرت ناک شکست دینے کے بعد تمام صلیبی مقبوضات جن میں انطاکیہ، عکہ، طرابلس اور جزائرِ روڈ شامل تھے، پر قبضہ کر کے پونے تین سو سال تک جاری صلیبی جنگوں کا خاتمہ کر دیا۔

طاعون کی وباء یا کالی موت (۱۳۴۷ء۔۱۳۵۱ء)

قرونِ وسطیٰ کا ایک اور اہم واقعہ جس نے یورپ کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کیے، وہ 'طاعون کی وباء' تھی جسے یورپ کی تاریخ میں 'کالی موت' (Black Death) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ۱۳۴۷ء سے لے کر ۱۳۵۱ء تک یورپ میں طاعون کی وبا پھیل گئی جس نے یورپ کی تقریباً ایک تہائی آبادی کو ختم کر دیا۔ اس وقت کے لوگ اسے 'عظیم ہلاکت' (Great Mortality) کہتے تھے مگر بعد میں آنے والے مؤرخین نے اسے کالی موت کہنا شروع کر دیا۔ یورپ پر مختلف حوالوں سے اس حادثے کے اثرات ہوئے۔ ایک اثر یہ ہوا کہ عیسائی باشندوں نے اپنا غم و غصہ یہودیوں اور دیگر غریب و مفلوک الحال طبقے پر نکالا جن پر باقاعدہ یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے پانی اور ہوا کو آلودہ کیا تھا جس کے سبب یہ وباء پھیلی۔ اس کے نتیجے میں کئی مقامات پر عیسائیوں نے یہودیوں کو جمع کر کے زندہ جلا ڈالا۔

دوسرا اثر یہ ہوا کہ یورپ کی اقتصادی حالت بگڑ گئی۔ مزدور کی اجرت کئی گنا بڑھ گئی جبکہ جاگیرداروں کی آمدن گھٹ گئی۔ اس کے سبب یورپ کا جاگیردارانہ نظام کمزور ہو گیا۔ لوگ معاش کی تلاش میں دیہات چھوڑ کر شہروں کا رخ کرنے لگے۔ ایسے میں جاگیرداروں اور مزدوروں کے درمیان تنازعات نے کشمکش کی شکل اختیار کر لی جو آگے چل کر 'حقوق کی جنگ' میں تبدیل ہو گئی۔

اقتصادی حالت کی خرابی کے مزید اثرات بھی ہوئے۔ اول تو یورپ میں افرادی قوت اتنی کم ہو گئی کہ پیداوار کرنے والے مزدور نہ رہے، اگر مزدور میسر ہو بھی جاتا تو مزدوروں کی اجرت اتنی زیادہ ہو گئی کہ جو پیداوار ہوتی بھی تو وہ اتنی مہنگی ہوتی کہ اس کو کوئی خرید نہ سکتا تھا۔ دوسرا افرادی قوت کی کمی کی وجہ سے بازار میں خریدار ہی ختم ہو گئے تھے۔ ان حالات نے یورپ کے تمام ممالک کو دنیا میں نئی منڈیوں کی تلاش پر مجبور کر دیا۔ اس زمانے میں ہندوستان پوری دنیا کو کپاس، کپڑا اور مصالحہ جات فراہم کرتا تھا۔ اس لیے ان سب کا رخ ہندوستان کی طرف تھا۔ سب سے پہلے پرتگال، پھر ہالینڈ، فرانس اور سب سے آخر میں برطانیہ نے 'ایسٹ

انڈیا کمپنی' (East India Company) بنا کر ہندوستان سے تجارت شروع کی۔ان کمپنیوں کی اس بین الاقوامی تجارت میں جب زیادہ پیسے کی ضرورت پیش آئی تو بینکوں اور جدید کرنسی کا نظام وجود میں آیا۔ یہیں سے ایک طرف جدید معیشت کا آغاز ہوا جس میں کرنسی، بینک اور عالمی کمپنیوں کا ارتقاء ہوا جو بعد میں سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیل ہوگیا اور دوسری طرف اسی تجارت کے دوران برطانیہ ہندوستان پر قابض ہوگیا۔ ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ دنیا میں مغرب کے عروج کا دروازہ ہے۔اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

بعض مؤرخین کی رائے میں طاعون کی اس وباء کا ایک اثر یورپ کی تاریخ پر یہ پڑا کہ لادینیت اور سیکولرزم کو عوام میں قبولیتِ عامہ حاصل ہونا شروع ہوگئی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیکولر مفکرین نے مذہب پر شدید تنقید کی کہ کلیساء اس وباء کو قابو کرنے کی بجائے صرف صبر کی تاکید کرتا ہے۔اگر انسان دین کی پیروی کرنے کی بجائے اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتا تو اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔ یہ خیال آہستہ آہستہ آنے والی صدیوں میں زور پکڑتا گیا اور بالآخر انقلابِ فرانس کے وقت کلیساء کی شکست اور لادینیت کی جیت کی شکل میں نمودار ہوا۔

قرونِ وسطیٰ اور یہودی

یورپ میں یہودیوں کی زیادہ آمد قرونِ وسطیٰ میں ہی ہوئی۔ یورپ میں زیادہ تر یہودی مسلم 'اندلس' میں رہتے تھے جو خود ان کے نزدیک ایک سنہری دور تھا۔ یہاں وہ شمالی افریقہ کے مسلم علاقوں سے آئے تھے۔ یہودیوں کی یورپ میں آمد کا دوسرا راستہ ترکی سے تھا مگر ان راستوں سے بہت کم یہودی یورپ میں داخل ہوتے کیونکہ عیسائی دنیا کی نسبت مسلمان دنیا میں وہ ذمی کے طور پر پرامن زندگی گزار رہے تھے۔ان دونوں راستوں سے آنے والے یہودی آج 'سفارڈی یہودی' کہلاتے ہیں۔ یہ آج کی دنیا میں پائے جانے والے یہویوں کا 'بیس فیصد' ہیں اور یہی یہودی اصل بنی اسرائیل کی نسل سے ہیں۔

یورپ میں یہودیوں کی سب سے زیادہ آمد منگولوں کے روس پر حملے کے بعد ہوئی جب وہ روس سے بھاگ کر پولینڈ اور مشرقی یورپ کے علاقوں کی طرف منتقل ہوئے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ قوقاف میں خیصار بادشاہ کی حکومت تھی جس نے آٹھویں صدی عیسوی میں یہودیت قبول کی تھی۔ یہودی خیصار حکومت میں امن اور چین سے زندگی گزار رہے تھے کہ تاتاریوں کی روس پر یلغار کی وجہ سے انھیں روس سے نکلنا پڑا اور وہ مشرقی یورپ میں بھاگ گئے۔ پھر یہاں سے وہ پورے یورپ میں پھیل گئے۔روس اور پولینڈ سے یورپ میں پھیلنے والے یہودیوں کو آج کی جدید دنیا میں 'اشکنازی یہودی' کہا جاتا ہے اور یہ آج کی یہودی آبادی کا 'اسّی

فیصد' ہیں۔ یہ اسّی فیصد یہودیت کا دعویٰ کرنے والے اصلی یہودی نہیں ہیں بلکہ خیصاری نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

یورپ میں قرونِ وسطیٰ کا دور یہودیوں کے لیے بہت مشکل دور تھا۔ یورپ میں عیسائی قتلِ عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے انھیں معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھے جس کی وجہ سے ان کے لیے عیسائی علاقوں میں رہنا، کوئی حکومتی عہدہ حاصل کرنا قطعاً ممنوع تھا۔ اسی زمانے میں یہودیوں کو عیسائی علاقوں سے دور آباد ہونے کی ہدایت تھی اور ان یہودی آبادیوں کو تاریخ میں رومن کیتھولک عیسائیوں کا 'باڑہ' (Ghetto) کہا جاتا تھا۔ باڑے کا لفظ اردو زبان میں جانوروں کو باندھنے والی جگہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں یورپ میں یہودیوں کے کئی قتلِ عام بھی ہوئے۔ قتلِ عام کی تین بڑی وجوہات تھیں۔

← قتلِ عام کی پہلی وجہ یورپ کا صلیبی جنگوں کے لیے نکلنا تھا۔ جب بھی یورپ میں صلیبی جنگ کا شور اٹھتا اور صلیبی فوج مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے نکلتی تو یہ صلیبی یورپ کے جس علاقے سے بھی گزرتے، وہاں یہودیوں کا قتلِ عام کرتے جاتے۔

← یہودیوں کے قتلِ عام کی دوسری وجہ یورپ میں طاعون کی وباء تھی۔ جب یورپ میں طاعون کی وباء پھیلی تو اس وباء کو یہودیوں کے گناہ قرار دے کر ان کا بے دریغ قتلِ عام کیا گیا۔ تقریباً یورپ کے ہر ملک میں یہ قتلِ عام ہوا۔

← یہودیوں کے قتلِ عام کی تیسری وجہ ان کا سود در سود کا نظام تھا جس میں انھوں نے یورپ کے معاشروں کو قرضوں کی غلامی میں جکڑ رکھا تھا۔ جب ان کا یہ ظلم انتہاء کو پہنچ جاتا تو معاشرے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے، ان کا قتلِ عام ہوتا اور انھیں ملک بدر کر دیا جاتا۔ اس قسم کا ایک مشہور قتلِ عام اور یہودیوں کی ملک بدری کا واقعہ فرانس کے بادشاہ 'فلپ دی فیئر' کے حکم سے فرانس میں ہوا۔ یہودیوں کا دوسرا قتلِ عام انگلستان کے بادشاہ 'ایڈورڈ اول' کے زمانے میں پیش آیا جب قتلِ عام کے بعد باقی بچ جانے والے یہودیوں کو انگلستان سے نکال دیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہودیوں کا قتلِ عام کرنے والے یہی دو ممالک...... برطانیہ اور فرانس...... پہلی جنگ عظیم میں انھی یہودیوں کے لیے سلطنتِ عثمانیہ سے فلسطین کو فتح کرتے ہیں اور وہاں ریاستِ اسرائیل کو قائم کرنے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔

یہی وہ راز اور پیچیدہ گتھی ہے جسے سلجھانا ہماری اس کتاب کا مقصد ہے۔

یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا دور (۱۴۵۳ء - ۱۷۸۹ء)

یورپ کی تاریخ کا تیسرا دور جس نے آج کے جدید مغرب کی شکل اختیار کی، 'نشاۃ ثانیہ' (Renaissance) کا دور کہلاتا ہے۔ اپنے پہلے ادوار کے ناموں کی طرح یہ نام بھی مؤرخین کے درمیان بہت سے اختلافات لیے ہوئے ہے۔ یہ دور یورپ میں رومن کیتھولک عیسائیت کے زوال اور لادینیت کی فتح کا آغاز تھا۔ اس لیے عیسائی مؤرخین اس کو نشاۃ ثانیہ سے زیادہ مذہب بے زاری کا دور کہتے ہیں۔ لیکن دور جدید میں یورپ میں لادین اور سیکولر عناصر کا زیادہ زور ہے، اس لیے اس اصطلاح کو قبولِ عام حاصل ہے۔ یورپی مؤرخین اس دور کے لیے انگریزی کا لفظ 'رینائیسنس' استعمال کرتے ہیں جس کا اردو یا عربی ترجمہ 'نشاۃ ثانیہ' یا 'میلادِ جدید' ہے۔ بہر حال ہمیں اس نام اور اصطلاح پر بحث سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، ہمیں تو صرف یورپ کی تاریخ سے اتنی دلچسپی ہے جس سے ہم آج اپنے دشمن کو سمجھ سکیں اور اس کی امتِ مسلمہ کے خلاف چالوں سے باخبر ہو سکیں۔ اس لیے ہم اس دور میں ہونے والے ان واقعات کو بیان کریں گے جو ہمارے موضوع کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں۔

اگر ہم نشاۃ ثانیہ کے اس دور کا مطالعہ کریں جو ۱۴۵۳ء سے لے کر تقریباً انقلابِ فرانس یعنی ۱۷۸۹ء تک چلتا ہے تو اس میں ہمیں بہت سے اہم واقعات اور تبدیلیاں نظر آتی ہیں جنھوں نے آج کی جدید دنیا اور نیو ورلڈ آرڈر کے قیام میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس دور کی سب سے بڑی تبدیلی یورپ کی فکر میں تبدیلی تھی۔ اس فکری تبدیلی کی بنیاد یورپ کے عوام میں دین بیزاری سے پڑی جس کی بدولت ان میں نئی لادین فکر کو اپنانے کی آمادگی پیدا ہوئی جو بعد میں 'عقلیت پرستی' کی راہ سے گزر کر انقلابِ فرانس کی شکل میں عیسائی مذہب سے چھٹکارہ پانے پر منتج ہوئی۔ اسی دور میں کلیساء کی اصلاح کے لیے شروع کی گئی تحریکیں......جو قرونِ وسطیٰ میں ناکام ہو گئی تھیں......زیادہ زور پکڑ گئیں۔ آخر کار 'مارٹن لوتھر' (Martin Luther) کی 'پروٹیسٹنٹ تحریک' نے کامیابی حاصل کی اور عیسائیت میں پروٹیسٹنٹ کا ایک نیا فرقہ وجود میں آیا۔ بعد کے آنے والے دور میں اس فرقے نے انگلستان اور امریکہ میں طاقت پکڑی جو اب تک قائم ہے۔ یہی فرقہ بعد میں عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان محبت کا آغاز اور 'صلیبی صہیونی اتحاد' کا آغاز ثابت ہوا۔ اسی دور میں امریکہ کی دریافت ہوئی اور یہ ملک پروٹیسٹنٹ اور یہودیوں کے لیے پناہ گاہ ثابت ہوا، اور پھر اسی ملک میں پہلا 'لادین انقلاب' آیا جسے 'انقلاب امریکہ' (American Revolution) کہا جاتا ہے۔

نشاۃ ثانیہ کے دور میں ہی یورپی ممالک نے تجارت کی غرض سے ہندوستان کے لیے کمپنیوں کو روانہ کیا جو بعد میں انگلستان کے ہندوستان پر قبضہ کا باعث ہوا۔ ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ بین الاقوامی سطح پر مغرب کے عروج کا دروازہ ثابت ہوا۔ اسی دور میں دنیا میں باقاعدہ بینکوں اور کاغذی کرنسیوں کا اجراء ہوا جو سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد بنا۔ آج کے امریکہ کے معاشی نظام...... جسے منڈی کی معیشت کہا جاتا ہے...... کی بنیاد بھی یہی بینک، کرنسی اور کمپنیاں ہیں اور اسی سرمایہ دارانہ نظام کے ردِ عمل کے طور پر روس میں 'کمیونسٹ انقلاب' آیا اور امریکہ اور روس کے درمیان چالیس سال تک سرد جنگ جاری رہی۔ نشاۃ ثانیہ کے اسی دور میں جرمنی میں قائم 'ہولی رومن ایمپائر' کے ممالک میں ایک جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ تیس سال تک جاری رہی۔ اس لڑائی کے اختتام پر 'ویسٹ فیلیا' کا معاہدہ ہوا جس میں آج کی جدید وطنی ریاست کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ ان وطنی ریاستوں کے تصور سے آج کے یورپ کی ریاستوں کے درمیان حد بندی کی گئی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد امتِ مسلمہ کی تقسیم بھی اسی ویسٹ فیلیائی معاہدے کے تحت کی گئی۔ آج اقوامِ متحدہ بھی اسی معاہدے کے اصول کے مطابق ہی کسی ریاست کو ریاست تسلیم کرتی ہے۔

ذیل میں ہم ان تمام واقعات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

نشاۃ ثانیہ کے دور میں یورپ کی فکری تبدیلی

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے دور کا آغاز ۱۴۵۳ء میں ہوا۔ اس دور کا آغاز عثمانی خلیفہ سلطان محمد فاتح کے قسطنطنیہ پر قبضہ سے ہوا۔ اس قبضے کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی۔ قسطنطنیہ کی اس فتح کے ساتھ ہی بازنطینی حکومت ختم ہو گئی تھی۔ اس فتح کے اثرات اسلامی دنیا میں جو آئے سو آئے مگر یورپ میں اس فتح کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یونانی فلسفے کے بہت سے ماہرین اور مسلم دنیا میں مختلف مدرسوں میں عصری تعلیم حاصل کرنے والے عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد نے اس حملے کے بعد وسطی اور مغربی یورپ کی طرف ہجرت کی۔ یہ ماہرین پہلے اٹلی میں جمع ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ پورے یورپ میں پھیل گئے۔ اس لیے نشاۃ ثانیہ کے اس دور کا آغاز اٹلی سے ہوا۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ان ماہرین نے عصری تعلیم تو مسلمانوں سے حاصل کی تھی مگر انھوں نے اس کو لادین اندازِ فکر کے ساتھ پیش کرنا شروع کر دیا۔ اس کا ذکر ہم ان شاء اللہ بعد میں کریں گے۔ امتِ مسلمہ کا درد رکھنے والے مسلمانوں اور مجاہدینِ اسلام کے لیے یورپ کی تاریخ کے اس دور کو سمجھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ مسلمان دنیا میں لادین طبقے کے خاص دلائل میں سے ایک دلیل یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور ہے۔ ہمارے یہاں کا لادین طبقہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ

یورپ کی اصل ترقی کا راز نشاۃ ثانیہ کے دور میں لادین نظریات کو قبول کرنا اور سائنس کے علم میں ترقی کرنا تھا، حالانکہ حقیقت اس سے بالکل الٹ ہے۔ مسلمانوں کے زوال کی وجہ اپنے نظامِ تعلیم کو چھوڑ مغرب کے اس نظام تعلیم کو اپنانا تھا جو مغرب نے نشاۃ ثانیہ کے دور میں مذہب بیزاری کی آمیزش کے ساتھ اپنایا تھا۔ اس پر ہم اس تاریخ کے خلاصے میں بحث کریں گے ان شاء اللہ۔

نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں جو فکری تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان میں ایک یونان کا وہ قدیم فلسفہ ہے جس میں انسانی عقل کو علمِ وحی پر مقدم ثابت کیا گیا تھا۔ انسانی عقل کی بنیاد پر قائم ہونے والے اس نظریے کو آج کے جدید دور میں 'ہیومن ازم' (Humanism) کہا جاتا ہے۔ دوسری فکری تبدیلی جو اس دور میں عام یورپی ذہن نے قبول کی، وہ مذہبی نظام تعلیم کی جگہ لادین عصری تعلیم تھی۔ عصری تعلیم کا بیشتر حصہ مسلم دنیا سے آیا تھا، لیکن انھوں نے اسے لادین انداز میں پڑھانا شروع کر دیا، حالانکہ مسلم دنیا میں یہی عصری نصاب دینی مدارس میں علمِ فن کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ دراصل قرونِ وسطیٰ کے اس کلیساء اور بادشاہت کے نظام کے ردِ عمل میں ہو رہا تھا جس سے یورپ کے عوام تنگ تھے۔

یورپ میں سیکولرزم (لادینیت)

اس سے پہلے کہ ہم نشاۃ ثانیہ کے دور میں سیکولرزم کے ارتقاء کو سمجھیں، ضروری ہے کہ سب سے پہلے خود سیکولرزم کو سمجھا جائے تاکہ ہم اس کے ارتقاء کو صحیح معنوں میں سمجھ سکیں۔ اردو لغات کے مطابق سیکولرزم کا مطلب 'لادینیت' ہے، بظاہر آسان نظر آنے والے اس لفظ نے اپنے اندر انتہائی پیچیدہ فلسفہ سمو رکھا ہے جسے مغربی علمائے ادیان خود ایک مستقل ''دین'' کا درجہ دیتے ہیں۔ **گویا یہ دینِ لادینیت ہے**۔ یہ پیچیدگی ہی اس کی خامیوں میں سے ایک بڑی خامی ہے۔ اس پیچیدگی کی وجہ اول تو یہ ہے کہ یہ انسان کی اس ناقص عقل کا شاہکار ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا سے بڑھ کر علم و فہم کی مالک ہے یعنی نعوذ باللہ خود خدا ہے۔ اس لحاظ سے آپ الہامی دین کے بجائے اسے ''انسانی'' دین کہہ سکتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ صرف ایک ناقص عقل ہی نہیں بلکہ مختلف زمانوں کی مختلف عقولِ ناقصہ کا مجموعہ ہے۔ سوم یہ کہ اس دین کے 'فلسفی پیغامبر' محض ناقص العقل ہی نہ تھے بلکہ اخلاق سے بھی عاری تھے جس کا اعتراف وہ خود کرتے آرہے ہیں اور جس پر تاریخ گواہ ہے۔ چہارم یہ کہ یہ ایک زمانے میں نہیں تشکیل پایا بلکہ پانچ سو سال قبل از مسیح کے رومی و یونانی مشرک معاشرے کی کوکھ سے نکل کر دو ہزار سال بعد از مسیح تک کے طویل عرصے میں بہت سی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے موجودہ شکل میں ڈھلا ہے اور اب بھی مسلسل ارتقا کے مراحل سے گزرتا چلا جارہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ''مستقل ارتقاء

پذیر'' دین ہے۔ پنجم یہ کہ اس کے ارتقاء کا سب سے بڑا سبب مذہب اور معاشرے کے خلاف ردِ عمل تھا۔ اس لحاظ سے آپ اسے ردِ عمل کا دین بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس حقیقت کی کھوج لگانے کے لیے لمبی تاریخیں، مختلف تہذیبیں، قدیم ادیان، مشکل فلسفے اور لاتعداد شخصیات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں ہم انھی پیچیدگیوں کو دور کرتے ہوئے سیکولرزم کو آسان انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس کوشش میں کامیابی عطاء فرمائے، آمین۔

'سیکولرزم' ایک سوچ اور اندازِ فکر کا نام ہے جو ایسے مضامین سے بحث کرتا ہے جن میں راہنمائی اس سے قبل انسانوں کو صرف اور صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے ہی ملتی تھی۔ مثال کے طور پر انسان کون ہے؟ انسان کیوں پیدا کیا گیا؟ انسان کیسے پیدا ہوا؟ کیا دنیا میں انسان کے پاس اپنی مرضی سے کام کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ اور اگر اختیار ہے تو کتنا؟ اس کائنات کو کس لیے پیدا کیا گیا؟ اس کائنات کا خالق کون ہے؟ اس کائنات کے مالک کی مرضی کیا ہے؟ انسان مرتا کیوں ہے؟ مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے؟ کیا انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوگا یا ختم ہو جائے گا؟ ان سوالات کے جوابات صرف انبیاء علیہم السلام وحی کی بنیاد پر دیتے تھے۔ یہ وحی خود خالقِ کائنات کی جانب سے ان سوالات کا جواب ہوتی تھی۔

لیکن جب ان سوالات کے جواب کی تلاش میں انسان انبیاء کی جگہ اپنے ہی جیسے انسان پر انحصار کرنا شروع کر دے تو اس سے لادینیت جنم لیتی ہے۔ یہاں علمِ وحی کی جگہ انسان کی عقل لے لیتی ہے اور ان سوالات کا جواب دینے کے لیے انبیاء کی جگہ فلسفی لے لیتے ہیں۔ 'سیکولرزم' کی کئی اقسام ہیں مگر اس میں سے سب سے زیادہ مقبول قسم جس نے اس دور میں یورپ میں اپنی جگہ بنائی، وہ 'ہیومن ازم' (Humanism) یا 'دینِ انسانی'[31] ہے۔ یہی آج کی لادینیت کی بنیاد ہے اور یہی وہ فکر ہے جس نے یورپ کے عوام، خواص اور یونیورسٹیوں میں جنم لیا اور یہی یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ اگر ہم یہودیت اور عیسائیت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں واضح طور پر یہ نظر آتا ہے کہ ان کی گمراہی کی اصل وجہ انبیاء کی بتائی ہوئی باتوں کو چھوڑ کر علمائے سوء کی باتوں پر ایمان لانا تھا۔ علمائے سوء کی باتیں سوائے ان کی اپنی عقل اور اٹکل پچو کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ سیکولرزم بھی انسان کو بعینہ اسی بات کی دعوت دیتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں علمائے سوء تھے اور یہاں

---

[31] یہاں ہیومن ازم کا اردو ترجمہ دینِ انسانی اور ہیومن کا ترجمہ انسان صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس کے علاوہ اردو میں قارئین کو سمجھانے کے لیے کوئی لفظ دستیاب نہیں۔ ورنہ ہیومن کا لفظی مطلب انسان قطعاً نہیں ہے، بلکہ اس کا خاص مفہوم ہے (جو آپ اگلی سطور میں تفصیل سے پڑھ لیں گے) اور وہ خاص مفہوم عام لفظِ انسان میں ہرگز داخل نہیں۔ یہ وضاحت ذہن میں رکھنا ضروری ہے! (م ح)

عقل پرست فلسفی ہیں۔ دونوں میں ناقص انسان ہی انسانوں کو اپنا فکری غلام بناتا ہے اور دونوں باتیں ایک ہی راستے پر لے کر جاتی ہیں اور وہ راستہ گمراہی کا راستہ ہے۔

ہیومن ازم (دینِ انسانی)

چار سو سال قبل مسیح سے لے کر آج تک یونانی سیکولرزم مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ مگر جس شکل میں اسے مغرب میں مقبولیت حاصل ہوئی، وہ 'ہیومنزم' کی شکل تھی، یہاں تک کہ سیکولرزم اور ہیومنزم مترادف سمجھے جانے لگے۔ جیسا کہ ہم پچھلے باب میں عرض کر چکے ہیں کہ تقریباً تین سو سال قبلِ مسیح میں یونانی فلسفیوں نے مادی دنیا کے بارے میں عقل اور منطق کی بنیاد پر تحقیقات کا آغاز کیا تھا۔ یہ فلسفی 'کوسمولوجسٹ' (Cosmologist) کہلاتے تھے۔ کوسمولوجسٹ فلسفیوں کا دائرہ کار صرف سورج چاند ستاروں کے مطالعہ تک محدود تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد فلسفیوں کا ایک اور گروہ پیدا ہوا جس کا نظریہ تھا کہ جس طرح سورج، چاند اور ستاروں کی گردش کے قوانین معلوم کیے جا سکتے ہیں، اسی طرح انسانی عقل کی بنیاد پر سیاسی اور معاشرتی قوانین وضع کیے جا سکتے ہیں۔ فلسفیوں کے اس گروہ نے معاشرے کے بارے میں اپنی عقل کے سہارے نظریات کا اختراع شروع کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں 'ہیومنسٹ' (Humanist) کہا جانے لگا۔ اس زمانے میں 'ہیومنسٹ' اس شخص کو کہا جاتا تھا جو انسانی مسائل کو مذہب اور علمِ وحی کے بجائے محض عقلِ انسانی سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ چوتھی صدی عیسوی میں مشہور عیسائی پادری 'سینٹ آگسٹین' نے اس نظریے کو شکست دی اور ایک ہزار سال تک عقلیت کا یہ منہج دبا رہا، یہاں تک کہ قرونِ وسطی میں اس مسئلے نے دوبارہ سر اٹھایا اور نشاۃِ ثانیہ کے دوران عقل پرستی دوبارہ پوری قوت سے سامنے آئی۔

آخری ادوار میں ہیومنسٹ اس شخص کو کہا جاتا تھا جو یہ یقین رکھتا ہو کہ اب انسان کو دنیا میں اپنی منزل پانے کے لیے کسی دیوی، دیوتا یا اللہ کی ضرورت نہیں ہے۔ نعوذ باللہ خدا ہو بھی تو اس کی اب ضرورت نہیں بلکہ وہ اپنی عقل کے بھروسے پر اپنی منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ دورِ جدید میں 'ہیومنزم' کے پیغامبر جان لاک (John Locke)، ہیوم (David Hume)، نیٹشے (Nietzsche)، والٹیئر (Voltaire) اور روسو (Rousseau) جیسے فلسفی تھے۔ یہاں ہم اس فکر کے نمایاں خدوخال بیان کرتے ہوئے اس فکر اور شرک کا موازنہ خود قاری پر چھوڑتے ہیں۔

ہیومن ازم کا خلاصہ

ہم یہاں نکات کی صورت میں ہیومن ازم کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں جو اس کے پیغامبر فلسفیوں کی تعلیمات سے اخذ کردہ ہیں۔ ہیومن ازم کا خلاصہ ہے کہ :

- انسان جب پیدا ہوا تو وہ ناتجربہ کار تھا اور بیرونی دنیا سے خوف کھاتے ہوئے وہ کسی جائے پناہ کا متلاشی تھا۔ اس حالت میں اس نے اپنے ذہن میں فوق الفطرت ہستی کو تخلیق کیا جس کے تصور سے وہ اپنے آپ کو امن وراحت دلا سکے۔ اس فرضی ہستی کو وہ اپنا خالق سمجھ بیٹھا اور رفتہ رفتہ انسانی گروہوں نے مختلف صورتوں کے خالق بنا کر انھیں پوجنا شروع کر دیا۔ اس طرح مختلف مذاہب وجود میں آئے۔ لیکن قبل از انقلابِ فرانس کے طویل تجربات کے بعد انسان اپنے بارے میں اتنا تجربہ کار ہو گیا ہے کہ اسے راہنمائی کے لیے اب نہ کسی مذہب کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی خدا کی ضرورت ہے۔
- انسان اگرچہ آزاد پیدا ہوا تھا مگر مذہب کی تخلیق کے بعد وہ اسی کا غلام بن کر رہ گیا اور خود ہی اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو مخلوق بنا دیا۔ حالانکہ درحقیقت انسان کا نہ تو کوئی خالق ہے اور نہ ہی وہ مخلوق ہے۔ وہ تو در اصل ایک 'ہیومن' (human) ہے جو اپنے جیسے دیگر ہیومن کے ساتھ مل کر 'ہیومینٹی'، یعنی 'انسانیت' (humanity) کو تشکیل دیتا ہے۔ (یہیں سے اس فکر کو 'ہیومنزم' کہا جانے لگا۔)
- اب چونکہ انسان سے بڑھ کر کوئی ہستی نہیں، لہٰذا وہ کسی کے زیرِ تسلط اور تابع نہیں بلکہ آزاد اور خود اپنے ارادے کا مالک اور خود مختار ہے۔ خود مختاری سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ہیومن کے طور پہ اپنی زندگی میں آزادی حاصل ہے۔ وہ نہ کسی دین کا پیروکار ہے اور نہ کسی شاہ کا وفادار ہے۔ آزادی کے اس حق کو استعمال کرنے میں اس پر کسی قسم کی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ بلکہ ہر ہیومن کو...... چاہے وہ مرد ہو یا عورت اور چاہے وہ کسی بھی رنگ، نسل، قوم، ملک اور حتی کے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو...... اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے برابر اور مساوی مواقع ملنے چاہییں۔
- ہر انسان اب چونکہ آزاد ہے، لہٰذا وہ باہمی معاملات میں نہ تو کسی خارجی قوت کا اور نہ ہی اپنے میں سے کسی ایک کا تابع ہے۔ البتہ اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی معاہدات میں داخل ہو کر معاشرہ تشکیل دے سکتا ہے۔ اس معاشرتی یا عمرانی معاہدے کے تحت تمام ہیومنز کے مشترکہ ارادوں کی نمائندہ حکومت تشکیل دی جا سکتی ہے جو سب کی آزادی کی ضامن ہو۔ اس

طرح ان ہیومنز میں سے ہر ایک صرف حکومت کی صورت میں تشکیل شدہ اجتماعی ادارے کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

- انسان کی اب تک لکھی جانے والی تاریخ چونکہ مذہبی اور سیاسی طاقتوں کے زیرِاثر تھی، اس لیے اب تاریخ کو نئے سرے سے تدوین کرنا ضروری ہے جو انسانیت کی ترقی اور ارتقاء کو سامنے رکھ کر واقعات کا تجزیہ کرے۔ ہر قوم کی تہذیب میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس نے ہیومن کی ترقی میں کتنا حصہ ڈالا ہے۔ اس تہذیب کے فنونِ لطیفہ اور انسانی خواہشات کی تکمیل کس درجہ اعلیٰ تھی اور اس لحاظ سے اگر فرعونی خاندان نے کمال حاصل کیا ہے تو وہ پوری انسانیت کے ہیومنز کے لیے عظیم ہیرو ہیں، نہ کہ جابر حکمران۔

ہیومن ازم کے ناخداؤں کے بیان کردہ افکار سے بغیر کسی ادنیٰ شک کے یہ بات واضح ہے کہ ان کے یہاں ہیومن کی اصطلاح اس 'انسان' پر کسی طرح بھی منطبق نہیں ہوسکتی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ''عبد'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ الٹا 'ہیومن' بننے کے لیے اللہ تعالیٰ کا انکار لازم آتا ہے۔ 'ہیومن' حرام و حلال کی بندشوں سے آزاد ہستی ہے جو دنیا کے کسی الہامی دین یا اعلیٰ اقدار کے بجائے خواہشاتِ نفس کے مطابق زندگی گزارے، پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ فکر محض خدا اور دین کے انکار تک محدود نہیں بلکہ اس انکار کے ساتھ خود انسان کی اپنی خدائی والوہیت کا اقرار کرتی ہے۔

چنانچہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں عیسائی یورپ کے باشندے ......جو اس سے قبل خود کو اللہ کا بندہ اور اس کی عبادت کو مقصدِ زندگی قرار دیتے تھے...... اب 'بندے' کی تعریف سے نکلنا شروع ہو گئے اور 'ہیومن' بن گئے، اور اب انھوں نے کلیساء کی جگہ یورپ کے فلسفیوں کی تقلید شروع کردی۔

لادین نظامِ تعلیم

'دینِ انسانی' کو قبول کرنے کے بعد دوسری اہم تبدیلی جو یورپ میں نمودار ہوئی، وہ کلیساء کے روحانی نظام تعلیم کی جگہ لادین مادی نظام تعلیم کا آنا تھا جو لوگوں کو چند پیسے کمانے میں مدد دے سکے۔ اب لوگ اپنے بچوں کو کلیساء کے پاس بھیجنے کی بجائے اس لادین نظام تعلیم میں داخل کرانے لگے۔ اس دور میں فلسفے، سائنس، شاعری، خطابت اور مصوری جیسے مضامین پڑھائے جانے لگے۔

یورپ میں سائنس کی ترقی اور عیسائیت کے ساتھ جنگ

'سائنس'[32] وہ خاص مضمون تھا جو اس دور میں اسلامی دنیا سے ترجمہ ہو کر یورپ میں پہنچا۔ یورپ نے اس مضمون پر خاص توجہ دی اور نشاۃ ثانیہ کے اس دور کی خاص بات سائنس کے میدان میں بے پناہ ترقی تھی۔ مسلمان سائنس دانوں جابر بن حیان، البیرونی، ابن ھیثم، ابن سینا وغیرہ کی کتابوں کو یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ ارسطو اور افلاطون کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کے لیے نئے نئے نظریات سامنے آنے لگے۔ یہ نظریات پیش کرنے والوں میں گلیلیو (Galileo)، نیوٹن (Newton)، ولیم ہاروے (William Harvey)، کیپلر (Kepler)، ھیوم (Hume) وغیرہ شامل تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جن مسائل پر یہ سائنس دان اپنے نظریات پیش کر رہے تھے، مسلمان سائنس دان ان نظریات کو پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔ مسلمان دنیا میں سائنسدانوں نے یہ نظریات بڑے بڑے علماء کے سامنے پیش کیے بلکہ بہت سے مسلمان سائنسدان خود بھی عالمِ دین تھے۔ اسلام میں مذہب اور سائنس کی کوئی جنگ اس وقت موجود نہ تھی۔ علمائے حق نے اگر کوئی اعتراض کیا بھی تو ان باتوں پر کیا جو اسلام کے عقائد سے ٹکراتی تھیں اور مسلمان سائنسدانوں نے اعتراضات کے مطابق اپنی غلطی کو درست بھی کر لیا۔ دوسرا یہ کہ مسلمان سائنسدانوں میں سے کسی نے بھی اس علم کو لادین طریقے سے نہیں پیش کیا بلکہ اپنے مشاہدات کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی نشانیاں قرار دیا۔ مگر یہی علم جب یورپ میں پہنچا تو وہاں کے لادین سائنس دانوں نے اسے بالکل لادین طریقے سے پیش کیا، اللہ تعالیٰ کے انکار کی دلیل بنایا اور اسے عیسائی مذہب کو شکست دینے کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا۔ چونکہ عیسائیت کوئی علمی بنیاد پر کھڑا دین نہ تھا اور اس کے پاس ان سائنسی

---

[32] سائنس سے ہم یہاں علومِ طبیعیہ مراد لے رہے ہیں، یعنی اللہ کی تخلیقات پر غور کرنے اور اللہ کی کائنات کے اسرار و رموز سمجھنے کا علم۔ اس علم کو اگر اسی معنی میں لیا جائے اور اپنی حدود سے متجاوز نہ ہو تو یہ قطعاً اسلام سے متصادم نہیں۔ البتہ پندرھویں صدی کے بعد مغرب میں لادین فلسفیوں اور سائنسدانوں نے علمِ سائنس کی تدوین اللہ کے انکار کی بنیاد پر، خالص لادین نظریات کے مطابق کی اور علمِ سائنس کو مذہب کے خلاف ایک آلے کے طور پر استعمال کیا۔ بلاشک وشبہ ایسے علوم وفنون کی... جو کفریہ ملحدانہ فلسفوں یا بے لگام خواہشاتِ انسانی کی تکمیل ہی کو اپنا ہدف بنائیں... علمائے حق نے ہر دور میں مذمت کی اور دلائل کی قوت سے ان زہریلے علوم و نظریات کا توڑ بھی کیا۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ مصنف کے اس جملے کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں نے ہی سائنسی تحقیقات کا آغاز کیا، بلکہ یونان اور ہند میں اس سے قبل یہ علم مدون تھا، مسلمانوں نے اس میں سے مفید، کارآمد اور عملی چیزوں کو اپنایا اور اس کے بعد مزید تحقیقات کو بڑھایا۔ مسلمانوں کے بعد مغرب نے اس علم کو لیا، البتہ... جیسا کہ اوپر ذکر کیا... اسے ملحد نظریات کے ساتھ پروان چڑھایا اور دنیا میں پھیلایا۔ (م ح)

نظریات کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا کوئی علمی ذریعہ نہ تھا، اس لیے اس نے ان نظریات کو ملحدانہ قرار دے کر ان سائنس دانوں کے خلاف ایک محاذ کھول لیا، جسے یورپ کی تاریخ میں مذہب اور سائنس کی جنگ کہتے ہیں۔

یورپ میں عقلیت (عقل پرستی) کا دور

یورپ میں 'عقل پرستی' (Rationalism) کا دور تحریکِ اصلاح کے بعد شروع ہوا تھا مگر ہم اس کو فکری تبدیلی کے باب میں اس لیے درج کر رہے ہیں، کہ یورپ میں فکری تبدیلی کو سمجھنے کا تسلسل قائم رہ سکے۔ عیسائیت اور سائنس کی جنگ کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یورپ کے مفکر اور اہلِ علم نے ہر غلط اور صحیح کی بنیاد عقلِ انسانی کو قرار دیا، یہاں تک کہ انھوں نے مذہب کو بھی عقل کی بنیاد پر پرکھنا شروع کر دیا۔ 'عقلیت' یا 'عقل پرستی' سے مراد یہ ہے کہ غلط اور صحیح کی بنیاد عقل ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہیے کہ مذہب کی بنیاد اور ماخذ عقل ہے۔ اس نظریے کا پرچار کرنے والے بہت سے سائنس دان اور فلسفی تھے جن میں 'ڈسکارٹس' (Descartes)، 'سپی نوزا' (Spinoza)، 'لیبنز' (Leibniz) اور 'جون لاک' (John Locke) شامل تھے۔ عیسائیت میں عقلیت کا دروازہ دراصل تحریکِ اصلاح نے کھولا تھا۔ تحریکِ اصلاح کے نتیجے میں بائبل کی تشریح کا حق ہر کس و ناکس کو دینے سے شکست خوردہ عیسائیت میں ایسے ملحدین گھس آئے جنھوں نے اپنی عقل کو دلیل بناتے ہوئے تحریف شدہ انجیل (جو بہت سے خلافِ واقع باطل نظریات پر مشتمل تھی) کی ہر بات پر اعتراض کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح دین سے منسوب ہر بات خواہ وہ سچی ہی کیوں نہ ہوتی، مشکوک نظر آنے لگی۔

عقلیت پرستی کی اس فکر نے پورے یورپ کے خاص اور عام کو اس طرح سے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا کہ ان کی عقل بالکل ہی ماری گئی۔ عیسائیت کا ہر ماخذ اور ہر دلیل مشکوک ہو گئی۔ اس ذہنی حالت کا فطری تقاضا تھا کہ یورپ کے لوگوں میں پائے جانے والے زندگی گزارنے کے بنیادی تصورات...جو کلیساء نے صدیوں سے قائم کیے تھے...یکدم منہدم ہونا شروع ہو گئے۔ اب یورپ کے عوام کلیساء کے پادریوں کی بجائے لادین فلسفیوں کی طرف رجوع کرنے لگے۔ اب یہ ملحد فلسفی سائنس اور فلسفے کی بنیاد پر ان کے روزمرہ مسائل حل کرنے لگے۔ عقلِ انسانی یا مشاہدے اور تجربے کو حرفِ آخر تصور کیا جانے لگا اور عقل یا مشاہدے سے ماوراء تمام امور کا انکار کیا جانے لگا۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں یورپ کے لوگ 'مخلوق' اور 'انسان' سے 'خالق ہیومن' بن گئے۔ پھر

عقل کو تمام امور میں اصل دلیل و پیمانہ ماننے[33] تک کے سفر کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کے معاشرے نے وجودِ باری تعالیٰ، آخرت پر ایمان اور حقائقِ غیبیہ...... جن کی بنیاد علمِ نبوی یا وحی تھا، نہ کہ تجربہ اور مشاہدہ...... کا انکار شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ آنے والی دو صدیوں میں پورے یورپ کے معاشروں کی اکثریت پر الحاد غالب ہوتا چلا گیا۔ یہی وہ نشاۃ ثانیہ کا دور ہے جس نے پہلے سے ہی گمراہیوں کی مرکب عیسائیت کو مزید گمراہی میں دھکیل دیا۔ یہاں اہم ترین اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس فکری تبدیلی کو عوام تک پھیلانے میں بنیادی کردار خود کلیساء کی اصلاح کے لیے اٹھنی والی 'تحریکِ اصلاح' نے ادا کیا۔

'مارٹن لوتھر' کی تحریکِ اصلاح

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں ایک طرف سے مشرقی یورپ میں اٹلی سے شروع ہونے والی 'ہیومن ازم' کی تحریک آہستہ آہستہ یورپ میں فکری تبدیلی لا رہی تھی اور لوگ کلیساء اور بادشاہت کے نظام کے ردِ عمل میں ان تبدیلیوں کو قبول کر رہے تھے تو دوسری طرف نشاۃ ثانیہ کے اسی دور میں کلیساء کے اپنے اندر تحریکِ اصلاح کے نام سے ایک انقلاب برپا تھا۔ ہیومن ازم کی تحریک کلیساء اور بادشاہت کے نظام سے باہر کی تحریک تھی تو تحریکِ اصلاح کلیساء کے اندر سے تعلق رکھتی تھی۔ نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں یورپ میں اہم فکری اور سیاسی تبدیلیاں لانے میں تحریکِ اصلاح نے ہیومن ازم کی تحریک سے زیادہ اثرات مرتب کیے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تحریکِ اصلاح نے یورپ میں لادینیت کی راہ صاف کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

---

[33] یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ جس طرح اسلام میں دین و سائنس (سائنس بمعنی علوم طبیعیہ) کی کوئی کشمکش نہیں موجود، اسی طرح عقل و وحی کے مابین کشمکش کا بھی کوئی تصور در حقیقت اسلام میں نہیں۔ عقل انسان کی اپنی ایجاد تو نہیں، بلکہ اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے اور قرآن نے اسے نعمت ہی کے طور پر پیش کیا ہے اور اسے استعمال کرنے پر بار بار ابھارا ہے۔ پھر اللہ ہی کی طرف سے آنے والی تعلیمات کیسے اللہ ہی کی عطا کردہ عقل سے کشمکش کا باعث ہو سکتی ہیں؟ البتہ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انسانی عقل کا دائرہ بہت محدود ہے اور وہ اسی وقت درست طریق پر استعمال ہو گی جب اسے قطعی علم کے ماخذ 'وحی' کے مطابق استعمال کیا جائے گا۔ ایسے میں یہی عقل انسان کو معرفتِ خداوندی کی منزل تک لے جاتی ہے۔ یہ بات اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآن جہنمیوں کا قول ذکر کرتا ہے کہ: ''وہ کہنے لگے کہ اگر ہم سنتے یا عقل استعمال کرتے تو ہم آگ والوں میں سے نہ ہوتے''۔ اس لیے عقل و وحی کی کشمکش ان احمقوں کے یہاں ہی جنم لیتی ہے جو عقل سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جو عقلاً بھی عقل کے بس میں نہیں اور جو مشاہدات، تجربات اور محسوسات پر قائم اصولوں سے غیبی امور کے صحیح غلط ہونے کا حتمی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں اور یوں خود اپنی کم عقلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ (م ح)

گو کلیساء کی تحریکِ اصلاح کا آغاز قرون وسطیٰ میں ہی شروع ہو گیا تھا، مگر ان تحریکوں کو کلیساء نے جبر سے کچل دیا تھا۔ یہ تحریکیں قرونِ وسطیٰ میں کامیاب نہ ہو سکیں مگر اپنے اثرات چھوڑ گئیں۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں برپا ہونے والی تحریکیں دراصل قرونِ وسطیٰ کی ان تحریکوں کا ہی تسلسل ثابت ہوئیں۔ ان تحریکوں میں سب سے زیادہ کامیاب ہونے والی تحریک جرمن پادری 'مارٹن لوتھر' کی تحریکِ اصلاح تھی جس نے آنے والی دو صدیوں میں عیسائیت میں ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی۔ مارٹن لوتھر کی اس تحریک کی کامیابی میں فرانس کے پادری 'کیل وِن' (Calvin) اور سویڈن کے پادری 'زونگلی' (Zwingli) نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے ہم مارٹن لوتھر کی اس تحریک کا ذکر قدرے تفصیل سے کریں گے۔

مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء۔۱۵۴۶ء) جرمنی کے ایک محنت کش گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے والد نے اس کی تعلیم کا اہتمام کیا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ قانون دان بنے۔ لوتھر نے تعلیم کے دوران ہی اپنی کتابیں بیچ کر ایک خانقاہ میں رہبانیت اختیار کر لی مگر وہاں بھی اسے اطمینان حاصل نہ ہوا۔ چار و ناچار وہ وہیں اپنی ذمہ داریاں نبھاتا رہا، یہاں تک کہ اسے پادری کا درجہ مل گیا۔ اسی اثناء میں خانقاہ کی طرف سے اسے کلیسائے روم کے دورے پر بھیجا گیا جہاں وہ پادریوں کے پر تعیش طرزِ زندگی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس صدمے نے اسے عیسائیت کے اصولوں پر دوبارہ غور و فکر پر مجبور کر دیا۔ اس کے بقول اس دوران اسے خدا کی طرف سے الہام بھی ہوتا رہا۔ اس طرح ۱۵۱۷ء میں اس نے اپنے مشہور 'پچانوے نظریات' (Ninety Five Theses) نامی مقالہ شائع کیا جس نے علمی اور دینی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ مقالے میں اس نے دیگر نظریات کے ساتھ ساتھ کلیساء کی طرف سے مغفرت نامے فروخت کرنے اور دنیوی تعیش کی مذمت بھی کی تھی۔ اس پر اسے بادشاہِ وقت کے سامنے معذرت کے لیے پیش ہونا پڑا مگر اس نے اپنے ضمیر کے خلاف فیصلہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر ایک درباری دوست اسے بچا کر نکالنے میں کامیاب ہوا جس کے محل میں وہ کچھ عرصے تک چھپا رہا۔ محل میں پناہ کے دوران اس نے یونانی اور بعد میں عبرانی زبان سے بائبل کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا، یہاں تک کہ ملک کے اندرونی خلفشار کے نتیجے میں اسے طویل دینی مذاکروں کے بعد امن دے دیا گیا مگر اسے دینی منصب سے محروم کر دیا گیا اور اس پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔

۱۵۲۴ء میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف محنت کشوں کی مشہور جنگ ہوئی جس میں محنت کشوں کے راہنماؤں نے اس کے چند جملوں کو اپنے لیے دلیل کے طور پہ پیش کیا۔ مگر مارٹن نے ان کے سیاسی مطالبات کے

حق میں ہونے کے باوجود ان کی فکر کی مخالفت کی اور امن بحال کرنے کے لیے جاگیر دار طبقے کا ساتھ دیا۔ آخری عمر میں وہ بیمار ہو چکا تھا اور آخر کار پاپائیت کی پابندیوں سے تنگ آ کر مر گیا۔

اس نے مروجہ عیسائیت میں جو اصلاحی تجاویز دی تھیں، وہ 'وائی کلف' کی تجاویز سے ملتی جلتی تھیں۔ اس کے اہم نکات حسبِ ذیل ہیں:

- انسان کا خدا سے تعلق کسی کلیساء یا پادری کے مرہونِ منت نہیں بلکہ بلا واسطہ تعلق ہے۔
- کسی پادری کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کے گناہ بخشوا کر اسے جنت کی ضمانت دے سکے۔
- اللہ انسان کے ساتھ تورات اور انجیل دونوں کے ذریعے خطاب کرتا ہے۔
- تورات کے احکامات پر عمل کرنے کے بعد ہی عیسائی کفارے کے عقیدے کی حقیقت پا سکتا ہے۔
- کتبِ مقدسہ کا پڑھنا اور سمجھنا ہر عیسائی کا حق ہے۔
- عیسائیت میں بپتسمہ، عشائیہ ء ربانی اور چند رسوم کے علاوہ دیگر رسوم بدعت ہیں، جن میں سینٹ (ولی) یا راہب کی قبروں پر جانا اور انھیں وسیلہ بنانا شامل ہے۔

یہی وہ موڑ ہے جہاں یہودیوں کا تاریخی تسلسل دوبارہ ایک نئی شناخت کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کئی حقائق اور وجوہات پروٹسٹنٹ تحریک کے یہودیت سے گہرے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ خود مارٹن لوتھر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نسلاً یہودی تھا، دوسری یہ کہ اس کے بیان کردہ عقائد میں سابقہ کتب اور تورات کی شریعت پر ایمان لانے کا خصوصی ذکر ہے جہاں سے یہودی افکار کو اس کے متبعین بآسانی قبول کر سکتے ہیں، تیسری یہ کہ اس فرقے کی امریکہ میں مطبوعہ کتابِ مقدس (ہولی بائبل) کے آخر میں ضم شدہ تاریخی نقشہ جات میں حضرت ابراہیم عَلَیہِ السَّلَام کے زمانے سے لے کر موجودہ ریاستِ اسرائیل کی تاریخ ظاہر ہوتی ہے، چوتھی یہ کہ یہ فرقہ اپنے طرزِ عمل کے اعتبار سے بھی عیسائیوں میں یہودیت کا سب سے بڑا حامی ہے اور اس پر برطانیہ اور امریکہ کی تاریخ گواہ ہے جہاں اس فرقے نے سیاسی اثر ورسوخ حاصل کیا یہاں تک کہ اس فرقے کے سیاسی زعماء کو صہیونی عیسائی کہا جانے لگا۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مارٹن لوتھر کا بنیادی کردار سینٹ پال کے کردار سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، گو بظاہر اس کی تحریک سینٹ پال کے مقابلے میں کتنی ہی بے ضرر کیوں نہ لگے۔

عیسائیت میں تفرقہ؛فرقہ 'پروٹیسٹنٹزم' کا وجود میں آنا

مارٹن لوتھر کی تحریک سے اگرچہ کافی لوگ متاثر ہوئے مگر کیتھولک فرقے کے سیاسی اور مذہبی اثر ورسوخ کے سبب اس زمانے میں اس کے افکار پر عمل نہ ہو سکا۔ بعد میں آنے والے 'زونگلی' اور 'کال وِن' سمیت کئی اشخاص نے اسے تقویت پہنچائی، یہاں تک کہ یہ تحریک پروٹسٹنٹ فرقے کے نام سے کلیسائے روم کے مد مقابل ایک مستقل شکل اختیار کر گئی۔ اس فرقے کے قیام کو بھی عیسائیت میں 'عظیم افتراق' گردانا جاتا ہے۔ کلیسائے روم نے ان کو دبانے کے لیے پوری ریاستی مشینری استعمال کی اور انھیں بددین قرار دے کر ان پر مظالم کا بازار گرم کیا اور قید و قتل کے علاوہ بے شمار لوگوں کو زندہ بھی جلایا، مگر یورپ کے حالات اس وقت تک اتنے بدل چکے تھے کہ یہ اصلاحی تحریک ختم ہونے کے بجائے مزید تیز ہوگئی۔ ان تحریکوں کو پروٹیسٹنٹ کا لقب ۱۵۲۹ء میں ملا جب کیتھولک چرچ نے ان کے 'لوتھیرین فرقے' (Lutheran) کے ساتھ تین سالہ رواداری ختم کرنے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں 'لوتھیرین فرقے' میں شامل شہزادوں نے احتجاج کیا اور احتجاجی یادداشت پر دستخط بھی کیے۔ 'پروٹیسٹنٹ' کا لغوی مطلب احتجاج کرنے والا ہے۔ اب یہ نام ہر اس فرقے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو نہ مشرقی آرتھوڈکس اور نہ رومن کیتھولک کلیساء کے تابع ہے۔ پروٹیسٹنٹ کے مشہور فرقے چار ہیں؛ پہلا 'لوتھیرین فرقہ' جو یورپ میں 'ایونجلیکل' (Evangelical) کے نام سے مشہور ہے، دوسرا 'کالوِنِسٹ' (Calvinist)، تیسرا 'اینابپٹسٹ' (Anabaptist) اور چوتھا 'اینگلیکین' (Anglican) فرقہ ہے۔ ۱۹۹۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق مجموعی طور پر تمام پروٹیسٹنٹ فرقے کل عیسائیوں کا پانچواں حصہ تھے۔

انگلینڈ میں 'اینگلیکین چرچ' کا قیام (پروٹیسٹنٹ فرقے کا عروج)

پروٹیسٹنٹ فرقے کو اپنا پہلا عروج اس وقت ملا جب انگلستان نے ۱۶۸۸ء میں سرکاری طور پر پروٹیسٹنٹ مذہب کو اپنانے کا اعلان کیا۔ اس کشمکش کا آغاز انگلستان کے بادشاہ 'ہنری ہشتم' (Henry VIII) کے دور سے ہوا۔ ہنری کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، اس لیے وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس طلاق کو نافذ قرار دینے کے لیے اسے پاپائے روم کی اجازت درکار تھی کیونکہ عیسائی مذہب میں قانونی طور پر طلاق دینا تقریباً حرام تھا اور اسی طرح دوسری شادی کرنا بھی حرام تھا۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ یہاں مسئلہ اس ملکہ کو طلاق دینے کا تھا، جو کلیساء کی مرضی سے ملکہ تھی۔

'ہنری ہشتم' نے ۱۵۳۲ء میں کلیساء کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرلی۔ اس شادی کو کلیساء نے کالعدم قرار دے کر ہنری کی بادشاہت کو بھی کالعدم قرار دے دیا اور انگلستان سے تمام مذہبی اختیارات لے لیے۔ ہنری چونکہ ایک مضبوط بادشاہ تھا، اس نے ردِ عمل کے طور پر انگلستان کے بڑے کلیساء کو...... جس کا نام 'کینٹربری کا چرچ' (Church of Canterbury) تھا اور جو رومن کیتھولک چرچ کے تحت کام کرتا تھا...... قانونی طور پر تبدیل کر کے انگلستان کے بادشاہ کے تحت کر دیا اور خود اس کا سربراہ بن کر مذہبی رسومات جاری کر دیں۔ بادشاہ 'ہنری ہشتم' نے اس کلیساء کا ایک علیحدہ بڑا پادری بھی مقرر کر دیا۔ اس نئے کلیساء کا نام 'چرچ آف انگلینڈ' (Church of England) رکھا گیا۔ 'چرچ آف انگلینڈ' کو پاپائے روم کے تحت نہ تھا مگر اس زمانے میں جو رسومات اس میں ادا کی جاتیں تھیں، وہ رومن کیتھولک مذہب کے مطابق تھیں۔ 'چرچ آف انگلینڈ' کا رومن کیتھولک کلیساء سے علیحدہ ہونا یورپ کی تاریخ کا بڑا واقعہ ثابت ہوا۔ اس علیحدگی سے پروٹیسٹنٹ نظریات کو برطانیہ میں پھیلنے کا موقع ملا۔ 'ہنری ہشتم' اور اس کی بڑی بیٹی 'میری اول' (Mary I) نے انگلستان کے کلیساء کو سیاسی وجوہات کے بنیاد پر علیحدہ کیا تھا اور انھوں نے رومن کیتھولک مذہب کو نہیں چھوڑا تھا، لیکن اس کی دوسری بیوی سے ہونے والی بیٹی 'الزبتھ' پروٹیسٹنٹ اصلاحات کی حامی تھی۔

سوال یہ ہے کہ 'الزبتھ' پروٹیسٹنٹ مذہب کی حامی کیوں ہو گئی تھی؟ اس کی وجہ سیاسی تھی اور وہ سیاسی وجہ 'الزبتھ' کی مجبوری بھی تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ 'ہنری ہشتم' نے دوسری شادی کلیساء کی اجازت کے بغیر کی تھی، اس لیے اس شادی کو کلیساء نے کالعدم قرار دے دیا تھا۔ اب چونکہ شادی کالعدم تھی، لہٰذا اس سے پیدا ہونے والی اولاد رومن کیتھولک مذہب کے مطابق ناجائز قرار دی گئی اور اگر بادشاہ کی اولاد ناجائز قرار دی جائے تو وہ بادشاہت کی امیدوار نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طرح 'الزبتھ' رومن کیتھولک مذہب کے مطابق بادشاہت کی امیدوار نہیں ہو سکتی تھی، جبکہ پروٹیسٹنٹ مذہب کے مطابق اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس لیے 'الزبتھ' پروٹیسٹنٹ مذہب کی طرف مائل ہو گئی۔

'ہنری ہشتم' کے بعد اس کی بیٹی 'میری اول' ملکہ بنی تو اس نے 'چرچ آف انگلینڈ' کو واپس رومن کیتھولک کلیساء سے جوڑنے کی کوشش کی۔ رومن کیتھولک مذہب سے جڑنے کا مطلب یہ تھا کہ 'الزبتھ' میری کے مقابلے میں بادشاہت کی امیدوار نہیں رہے گی۔ 'الزبتھ' نے پروٹیسٹنٹ فرقے کو ساتھ ملا کر سازش کی اور 'میری' کو ہٹا کر خود 'الزبتھ اول' (Elizabeth I) کے نام سے ملکہ بن گئی۔ اس نے 'چرچ آف انگلینڈ' کو پھر سے کلیسائے روم سے علیحدہ کر دیا۔ 'الزبتھ اول' ایک مضبوط ملکہ ثابت ہوئی۔ اس کے زمانے میں انگلستان

نے بہت ترقی کی۔ 'الزبتھ اول' ہی وہ ملکہ ہے جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کی غرض سے اجازت نامہ جاری کیا تھا۔ ملکہ کا دورِ حکومت تقریباً پچاس سال پر محیط تھا۔ ان پچاس سالوں میں انگلستان میں پروٹیسٹنٹ فرقے کا نفوذ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ 'الزبتھ اول' کا اقتدار رومن کیتھولک کلیساء کے بنائے ہوئے نظام میں ایک بہت بڑی دراڑ ثابت ہوا۔

۱۶۰۳ء میں 'الزبتھ اول' کے بعد 'جیمز اول' (James I) انگلستان کا بادشاہ بنا۔ 'جیمز اول' خود رومن کیتھولک فرقے کو پسند کرتا تھا مگر 'الزبتھ اول' کے زمانے میں پروٹیسٹنٹ مذہب کے لوگ بااختیار عہدوں پر فائز تھے اور 'جیمز اول' انھیں فوراً نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس لیے 'جیمز اول' نے مذہبی رواداری کی پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ اس پالیسی کا مقصد پروٹیسٹنٹ اور رومن کیتھولک فرقوں کو ساتھ لے کر چلنا تھا۔ مذہبی رواداری کی پالیسی کے تحت 'جیمز اول' نے سینتالیس ممبران پر مشتمل کمیٹی بنائی جس کا کام مذہبی رواداری پر سفارشات مرتب کرنا تھا، لیکن انگلستان کے رومن کیتھولک فرقے نے جیمز کی ان سفارشات کو مذہب میں تبدیلی کے مترادف قرار دیا اور ان سفارشات کے خلاف ہو گئے۔ انھوں نے بادشاہ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ ایک سازش کے تحت رومن کیتھولک فرقے نے برطانیہ کی پارلیمنٹ کو اس وقت بارود سے اڑانا تھا جب بادشاہ پارلیمنٹ سے خطاب کر رہا ہو۔ مگر یہ سازش پکڑی گئی اور بادشاہ رومن کیتھولک فرقے کے خلاف ہو گیا۔ اس سے پروٹیسٹنٹ فرقہ انگلستان میں اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔

'جیمز اول' کے مرنے کے بعد 'چارلس اول' (Charles I) بادشاہ بنا تو اس نے یہ نظریہ تسلیم کرنے کا حکم جاری کیا کہ بادشاہ کے اختیارات اللہ کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ یہ رومن کیتھولک نظریہ تھا، اس کے برعکس پروٹیسٹنٹ فرقہ اللہ کا اختیار پارلیمنٹ کو دینے کا حامی تھا۔ 'چارلس اول' کے دور میں انگلستان میں پروٹیسٹنٹ نظریات زور پکڑ چکے تھے۔ انھوں نے بادشاہ 'چارلس اول' کے ان خیالات کو رومن کیتھولک نظریات کا حامی قرار دیا اور پروٹیسٹنٹ کے فرقے 'پیوریٹین' (Puritans) نے ۱۶۴۸ء میں اپنے قائد 'کرام ویل' (Oliver Cromwell) کی قیادت میں 'چارلس اول' کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کے نتیجے میں 'چارلس اول' قتل ہو گیا اور 'کرام ویل' نے انگلستان سے بادشاہت ختم کر دی۔ 'کرام ویل' کا یہ انقلاب انگلستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ہے۔ اس سے ایک طرف انگلستان میں رومن کیتھولک فرقہ کمزور ہو گیا اور پروٹیسٹنٹ مضبوط ہو گئے تو دوسری طرف بادشاہت کمزور ہو گئی اور پارلیمنٹ مضبوط ہو گئی۔ 'کرام ویل' کا یہ انقلاب زیادہ دیر نہ چل سکا اور ۱۶۶۰ء میں اس کے مرنے کے بعد بادشاہت پھر سے قائم

ہو گئی مگر اس نے تاریخ میں جو اثرات مرتب کرنا تھے، وہ کر دیے۔ ان میں پروٹیسٹنٹ فرقے کی مضبوطی اور پارلیمنٹ کی بادشاہ پر فتح حاصل کرنا تھے۔ بالآخر مکمل طور پر یہ مسئلہ انگلستان میں ۱۶۸۸ء میں ختم ہوا، جسے برطانیہ کی تاریخ میں ۱۶۸۸ء کا 'انقلابِ عظیم' کہتے ہیں۔

انگلستان میں ۱۶۸۸ء کا 'عظیم انقلاب' (صلیبی صہیونی اتحاد کا پہلا قدم)

۱۶۸۵ء میں 'جیمز دوم' (James II) تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ عقیدے کے لحاظ سے رومن کیتھولک تھا اور بادشاہ کے اختیار کو اللہ کی طرف سے تفویض کیے جانے کا عقیدہ رکھتا تھا۔ 'جیمز دوم' انگلستان کو دوبارہ سے رومن کیتھولک مذہب کی طرف لے کر جانا چاہتا تھا، لیکن نہ ہی برطانیہ کی پارلیمنٹ یہ چاہتی تھی اور نہ ہی اس کی بیٹی 'میری' (Mary) اور اس کا داماد 'ولیم' (William) دوبارہ رومن کیتھولک کلیساء کے ساتھ جڑنے پر آمادہ تھے۔ اس وجہ سے 'جیمز دوم' کے خلاف بغاوت ہو گئی اور اس کو بادشاہت سے معزول کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کی بیٹی 'میری' ...جو پروٹیسٹنٹ مذہب سے تعلق رکھتی تھی...اور اس کے داماد 'ولیم' کو مشترکہ طور پر حکومت دے دی گئی۔ انگلستان کی تاریخ میں اسے '۱۶۸۸ء کا انقلابِ عظیم' (Glorious Revolution) کہا جاتا ہے۔ ۱۶۸۸ء کے اس انقلاب نے نہ صرف برطانیہ اور یورپ بلکہ آنے والے دو سو سال میں پوری دنیا کے سیاسی حالات پر بہت گہرے اثرات ڈالے۔ کلیساء اور بادشاہ کے درمیان رسہ کشی اور پروٹیسٹنٹ اور رومن کیتھولک مذاہب کی لڑائیاں جو دراصل قرونِ وسطیٰ میں شروع ہوئی تھیں، اب آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھانے لگیں۔ پھر یہ اثرات اور تبدیلیاں برطانیہ سے نکل کر یورپ میں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات ہم ذیل میں مختصراً درج کرتے ہیں:

انگلستان کے اس انقلاب عظیم کی وجہ سے سرکاری طور پر رومن کیتھولک کلیساء کے اثرات برطانیہ سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے اور 'چرچ آف انگلینڈ' ایک علیحدہ حیثیت میں دنیا کے سامنے آیا۔ یہ واقعہ برطانیہ میں رومن کیتھولک فرقے کی شکست اور پروٹیسٹنٹ نظریات کی جیت تھی۔ گو انگلستان کے اس چرچ نے نہ ہی پوری طرح رومن کیتھولک کو ترک کیا اور نہ ہی پوری طرح پروٹیسٹنٹ ازم کو اپنایا۔ اس چرچ کا اپنے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ 'چرچ آف انگلینڈ' ایک رومن کیتھولک چرچ ہے جس میں پروٹیسٹنٹ اصلاحات نافذ کی گئی ہیں۔

ان پروٹیسٹنٹ نظریات اور اصلاحات کو قبول کرنے کی وجہ سے برطانیہ میں خود بادشاہت کی گرفت اقتدار پر کمزور ہو گئی اور پارلیمنٹ کے اختیارات میں اضافہ ہو گیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ 'مارٹن لوتھر' اور 'کیل وِن' کی اصلاحات میں بادشاہ کا اختیار اللہ کی طرف سے تفویض کردہ ماننے کی بجائے ظاہری اور باطنی بادشاہتوں کا تصور موجود تھا جس کے مطابق یہ ضروری نہیں تھا کہ حکومت اب رومن کیتھولک نظریات کے مطابق اللہ کی حکومت کے نظریے کے مطابق چلائی جائے، بلکہ پروٹیسٹنٹ اصلاحات کے مطابق حکومت سیکولر نظریات کے مطابق بھی چلائی جاسکتی تھی اور عیسائی اس میں زندگی گزار سکتے تھے۔بس شرط یہ تھی کہ یہ سیکولر حکومت کسی عیسائی کو گناہ کی طرف نہ لے کر جائے۔

اس دور میں مکمل طور پر پارلیمنٹ کو اقتدار منتقل نہ ہوا تھا، مگر برطانیہ کے اندر سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں دو پارٹیاں ہو گئیں؛ایک 'ٹوری پارٹی' (Tory Party)اور دوسری 'وگ پارٹی' (Whig Party) کہلائی۔ 'ٹوری پارٹی' کو بادشاہ کی پارٹی بھی کہا جاتا تھا جبکہ 'وگ پارٹی' کو پارلیمنٹ کی بالادستی پر یقین رکھنے والی پارٹی کہا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'وگ پارٹی' کا نام 'لیبر پارٹی' ہو گیا اور 'ٹوری پارٹی' آج کی 'روایت پسند' یا 'کنزرویٹو پارٹی' کہلاتی ہے۔ یہ دونوں پارٹیاں آج بھی برطانیہ کی سیاست کا نوے فیصد حصہ ہیں۔

امریکہ کی دریافت اور پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی پناہ گاہ

امریکہ کی باقاعدہ دریافت ۱۴۹۲ء میں 'کرسٹوفر کولمبس' کے ہاتھوں ہوئی، جس کے بعد سے یورپی ممالک اس 'نئی دنیا' پر ٹوٹ پڑے۔امریکی براعظموں کی زمین کی زرخیزی، سونے اور معدنیات کے ذخائر اور جنگلی وحیوانی وسائل نے یورپ کے 'صنعتی انقلاب' کو ممکن بنایا۔ برطانیہ سے پہلے شمالی امریکہ پر پُرتگالی، ولندیزی اور ہسپانوی ممالک قابض رہے مگر ۱۶۰۷ء میں انگریزوں نے انھیں رفتہ رفتہ برِاعظم شمالی امریکہ سے نکال دیا اور صدی کے اختتام تک بیشتر علاقے پر برطانوی راج نافذ ہو گیا۔تاہم اٹھارویں صدی کے آغاز میں ان آبادیوں میں بڑھنے والی نسل نے برطانوی سامراج سے علیحدگی کی آواز بلند کی اور پھر طویل جنگوں کے بعد بالآخر ۱۷۷۶ء میں شمالی امریکہ کی آبادیوں نے برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کر کے 'متحدہ ولایت ہائے امریکہ' کی نئی ریاست تشکیل دی۔

۱۶۰۷ء میں ریاست 'ورجینیا' میں انگریزوں کی آمد سے ہی امریکہ میں 'اینگلیکین چرچ آف انگلینڈ' نے اپنا نفوذ قائم کیا جو پروٹیسٹنٹ عیسائیت کا علمبردار تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دیگر پروٹیسٹنٹ فرقوں کے عیسائی

بھی یورپ میں پاپائیت کے مظالم اور تنگ نظری سے بھاگ کر وقتاً فوقتاً نئی دنیا کی طرف ہجرت کرتے رہے۔ ان میں سے پروٹیسٹنٹ کا سخت گیر فرقہ 'پیوریٹنز' (Puritans) بھی تھا جو ۱۶۲۰ء میں 'دینی سفر' کرتے ہوئے 'پلیمتھ' اور 'میساچیوسٹس' کے علاقوں میں آباد ہوا۔

امریکہ میں یہودی عیسائی گٹھ جوڑ (صلیبی صہیونی اتحاد کا دوسرا قدم)

یورپ میں کلیساء کے مظالم سے تنگ آکر جہاں پروٹیسٹنٹ فرقے کے افراد نے امریکہ کی طرف اجتماعی ہجرت کی، وہاں یہودیوں نے بھی کی۔ ۱۶۳۵ء میں امریکہ کے جزیرہ 'روہڈ' میں ان کا اولین تذکرہ ملتا ہے۔ البتہ یہودیوں کی طرف سے بڑے پیمانے پر ہجرت انیسویں صدی کے وسط میں ہوئی۔ خاص طور پر ۱۸۸۱ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک مشرقی یورپ سے یہودی مسلسل امریکہ آتے رہے۔ 'ہولوکاسٹ' سے بچے ہوئے یہودی ان کے علاوہ تھے۔ یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ امریکہ کی حکمرانی پروٹیسٹنٹ عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھوں میں ہی آج تک چلی آرہی ہے۔

اگر تاریخ کے اس دور کا تجزیہ کرتے ہوئے یورپ اور امریکہ کا موازنہ کریں تو کئی نتائج واضح طور پر سامنے آتے ہیں:

- اول یہ کہ امریکہ میں وہ نظریات جو یورپ میں جنم لے رہے تھے، زیادہ خالص انداز میں لاگو کیے جاتے رہے، کیونکہ وہاں روایتی رومن کیتھولک عیسائیت کا وجود خاطر خواہ نہ تھا اور وہاں یورپ کے وہ تمام افراد جمع ہوئے جو رومن کیتھولک کلیساء کی تنگ نظری اور تشدد سے بھاگے تھے۔
- دوم یہ کہ امریکہ میں پروٹیسٹنٹ عیسائیوں اور یہودیوں کو آپس میں فکری، سیاسی اور معاشی سطح پر تعلقات استوار کرنے کا کھلا موقع ملا جس کے نتیجے میں امریکہ میں صلیبی صہیونی مکتبۂ فکر ایجاد ہوا جنھیں 'نیو کنزرویٹوز' (Neo Conservatives) یا 'نیو کونز' (Neo Cons) کہا جاتا ہے۔
- سوم یہ کہ امریکہ میں یورپ کی بنسبت لادین سیکولر رنگ غالب نظر آتا ہے جبکہ یورپ میں اب بھی روایتی مذہبیت کی جھلک نظر آتی ہے۔
- چہارم یہ کہ امریکہ میں پہلے ہی دن سے بادشاہت قائم نہیں ہوئی۔

ویسٹ فیلیا کا معاہدہ اور وطنی ریاستوں کا قیام (۱۶۱۸ء تا ۱۶۴۸ء)

یورپ میں ایک جانب سیکولر فکری انقلاب لوگوں کے ذہن تبدیل کر رہا تھا، دوسری جانب تحریکِ اصلاح کلیساء کو داخلی طور پر کمزور کر رہی تھی اور تیسری طرف برطانیہ پروٹیسٹنٹ اصلاحات سے متاثر ہو کر بادشاہت سے پارلیمنٹ کی بالادستی کی طرف جارہا تھا۔ برطانیہ کے جزیرے کے دوسری طرف یورپ میں ایک اور انقلاب رونما ہوا جس نے آنے والے دور میں دنیا کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ 'ہولی رومن ایمپائر' کی ریاستوں کے درمیان ہونے والی تیس سالہ جنگ اور اس کے نتیجے میں ہونے والا 'ویسٹ فیلیا کا معاہدہ' (Peace of Westphalia Treaty) ہے۔ یہ نشاۃ ثانیہ کے دور کا تیسرا اہم واقعہ ہے۔ اس تیس سالہ جنگ کے نتیجے میں جدید وطنی ریاست کا نظریہ ابھر کر سامنے آیا۔ اسی نظریے کی کوکھ سے آج کے نظریہء 'حب الوطنی' اور جدید قومی فوجوں کے 'وطنی نظریہء جنگ' نے جنم لیا ہے۔

جیسا کہ ہم قرونِ وسطیٰ کے باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ عیسائیت کا یورپ میں عروج 'ہولی رومن ایمپائر' کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بادشاہت ۹۶۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ 'ہولی رومن ایمپائر' کا جغرافیہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا مگر اس میں آج کے جرمنی کا تمام علاقہ، آسٹریا، فرانس، اٹلی، ہنگری، چیکوسلواکیہ، سویڈن، بوہیمیا اور سپین کا بہت سا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے شہر اور ریاستیں بھی آزاد حیثیت سے اس میں شامل تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'ہولی رومن ایمپائر' کمزور ہوتی چلی گئی اور اس کی ریاستیں نیم خود مختار ہو گئیں۔

۱۶۱۸ء میں 'ہولی رومن ایمپائر' کی ان ریاستوں کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کو یورپ کی تاریخ میں 'تیس سالہ جنگ' (Thirty Years' War) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک انتہائی پیچیدہ وجوہات کی جنگ تھی اور اس میں 'ہولی رومن ایمپائر' میں شامل تقریباً تمام ہی ریاستیں شامل تھیں اور بعد میں اس سے باہر کی ریاستیں بھی شامل ہو گئیں۔ اس جنگ کی وجوہات گو بہت پیچیدہ تھیں، لیکن مؤرخین نے ان میں سے دو بڑی وجوہات؛ 'مذہبی' اور 'جغرافیائی توسیع' کی نشاندہی کی ہے۔ مذہبی اس لیے تھی کہ یہ جنگ رومن کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ ریاستوں کے درمیان تھی اور پھر ان ریاستوں کے پیشِ نظر اپنی اپنی ریاستوں کی جغرافیائی حدود کو بڑھانا بھی تھا۔ اس جنگ کا اختتام ۱۶۴۸ء میں 'ویسٹ فیلیا' کے مشہور معاہدے کے تحت ہوا تھا۔

ویسٹ فیلیا معاہدے کے تحت بہت سی پروٹیسٹنٹ ریاستوں کو اپنے مذہبی طریقے پر عمل کرنے کی آزادی مل گئی۔ یہ پروٹیسٹنٹ فرقے کی ایک اور جیت تھی۔ دوسری طرف اس معاہدے کے تحت ہالینڈ، سویزرلینڈ،

ملان، سوائے، گینوا، مینٹوا، ٹسکنی، لوکا، موڈینا اور پارمہ کی ریاستوں کو آزادی ملی۔ یہ نہ صرف جدید یورپ بلکہ جدید دنیا کی تقسیم کی بنیاد تھی اور اسی معاہدے سے جدید ریاست، شہریت، جغرافیائی حد بندی، حب الوطنی، قومیت، وطنیت اور قومی افواج کے نظریات ابھر کر سامنے آئے۔ پھر جب خلافتِ عثمانیہ ختم ہوئی تو یہی عرب قومیت اور ترک قومیت کے نظریات مسلمانوں میں پیدا کیے گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب سامراجی ریاستوں کو آزادی ملی تو انھی نظریات کی بنیاد پر نئے مسلمان ممالک وجود میں آئے۔ آج امتِ مسلمہ ستاون مملکتوں میں تقسیم ہے، ستاون قومی فوجیں ہیں، ستاون قسم کی شہریتیں ہیں۔ ان سب کا کوئی تصور اسلام میں موجود نہیں ہے۔ آج کی جدید وطنی ریاست کی تعریف جو اقوامِ متحدہ کے یہاں مقبول ہے، اس کی چار شرائط ہیں؛ اقتدارِ اعلیٰ، آبادی، جغرافیائی حدود اور گورنمنٹ، اور اس سب کی بنیاد یہی منحوس معاہدہ ہے۔

برطانیہ میں پارلیمنٹ کا ارتقاء اور عروج

یورپ میں سب سے پہلے برطانیہ میں تبدیلیاں نمودار ہونا شروع ہوئیں۔ میگنا کارٹا کے معاہدے نے برطانیہ میں پارلیمانی نظام کی بنیاد رکھی۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں یہ نظام اور زیادہ مضبوط ہو گیا، جس کی کچھ وجوہات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ۱۲۱۵ء میں بادشاہ 'جون اول' کے زمانے میں معاہدہ میگنا کارٹا ہوا تھا جس کے نتیجے میں عوام کی ایک مشاورتی کونسل کی تشکیل ہوئی تھی۔ لیکن جب اس کا بیٹا 'ہنری سوم' تخت نشین ہوا تو اس کے خلاف ایک فرانسیسی نژاد جاگیر دار 'سائمن ڈی مونٹفورٹ' (Simon de Montfort) نے بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کے نتیجے میں 'سائمن' نے انگلستان کے ایک علاقے میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اپنی حکومت کا نظام چلانے کے لیے اس نے عوامی نمائندوں پر مشتمل ایک پارلیمنٹ قائم کی۔ 'ہنری سوم' نے اس کے خلاف فوج کشی کی اور 'سائمن' ایک جنگ میں مارا گیا۔ تاہم اس نے انگلستان میں ایک ایسی نئی روایت بنا دی جس کو نظر انداز کرنا ممکن نہ رہا۔ اس روایت نے بعد میں 'ایڈورڈ اول' کو ۱۲۹۵ء میں ایک پارلیمنٹ بنانے پر مجبور کر دیا۔ سرکاری سطح پر یہ انگلستان کی پہلی پارلیمنٹ تھی۔

۱۳۴۱ء میں اس پارلیمنٹ کے دو حصے کر دیے گئے؛ نواب اور جاگیر داروں والا حصہ 'ایوانِ بالا' کہلاتا تھا اور جہاں عوامی فیصلے ہوتے، اسے 'ایوانِ زیریں' کہا جاتا تھا۔ ۱۵۴۴ء میں 'ایوانِ بالا' کا نام 'نوابوں کا ایوان' (House of Lords) رکھ دیا گیا جبکہ 'ایوانِ زیریں' 'عامیوں کا ایوان' (House of Commons) کہلایا۔ آج بھی برطانیہ کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے یہی نام ہیں۔ 'ایڈورڈ سوم' کے زمانے میں پارلیمنٹ کی طاقت میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب پارلیمنٹ نے بادشاہ پر اپنی اجازت کے بغیر

عوام پر کوئی ٹیکس لگانے کی پابندی عائد کر دی۔ پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان رسہ کشی کئی صدیوں تک چلتی رہی۔ اگر بادشاہ کمزور ہوتا تو اس دور میں پارلیمنٹ مضبوط ہو جاتی اور اگر بادشاہ مضبوط ہوتا تو وہ پالیمنٹ کو بے اختیار کر دیتا۔ بادشاہ اور پارلیمنٹ کی اس کشمکش میں فیصلہ کن موڑ اس وقت آیا جب 'کروم ویل' نے بادشاہت کو ختم کر کے پارلیمانی نظام نافذ کر دیا تھا اور پارلیمنٹ کے اختیارات میں اضافہ بھی کر دیا۔ پھر جب انگلستان میں ۱۶۸۸ء کا عظیم انقلاب آیا تو پارلیمنٹ کے اختیارات میں مزید اضافہ ہو گیا۔

یہاں پر ہم یہ ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ برطانیہ کی اس قدیم پارلیمنٹ اور برطانیہ کی آج کی جمہوری پارلیمنٹ میں بہت فرق ہے۔ قدیم پارلیمنٹ مذہب سے آزاد نہ تھی اور سربرآوردگی کے اصول پر چلتی تھی یعنی اس کا ممبر بننے کا معیار آج کی طرح کثرتِ رائے نہیں تھی بلکہ اس کی قابلیت تھی۔ اسی طرح ممبر کا انتخاب 'ایک آدمی ایک ووٹ' کے اصول پر نہیں ہوتا تھا بلکہ قوم کے بڑے اس کا انتخاب کرتے تھے۔ انقلابِ فرانس کے بعد اس پارلیمنٹ نے مکمل طور پر جدید سیکولر جمہوری نظام کی شکل اختیار کر لی۔ اس پر آگے چل کر ہم مزید روشنی ڈالیں گے ان شاء اللہ۔

یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام کا ارتقاء اور عروج

نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں ایک اہم تبدیلی جو یورپ میں پیدا ہوئی، وہ معاشی نظام کے اصولوں کے اندر تھی۔ ان معاشی اصولوں کے تبدیل ہونے کی بنیادی وجوہات میں سے پہلی وجہ (دوسری تبدیلیوں ہی کی طرح) یورپ میں کلیساء، بادشاہ اور جاگیردارنہ نظام کے خلاف ایک ردِ عمل تھا۔ کلیساء کی تعلیمات کی بنیاد صلہ رحمی اور معاشرے میں صدقہ اور خیرات کی تلقین تھی۔ جبکہ عملی طور پر کلیساء کے پادری، بادشاہ اور جاگیر دار خود عوام کی دولت لوٹنے اور جمع کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی زندگیوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہی نہ تھا کہ ان کا اللہ سے کوئی تعلق ہے۔ کلیساء کے قول اور فعل کے تضاد نے ان کا دینی وقار ختم کر دیا اور اسی سے ردِ عمل پیدا ہوا جس کی بدولت نشاۃ ثانیہ کے دور میں یورپ کے عوام نے ہر اس چیز کو قبول کیا جو کلیساء اور اس کے نظام کے خلاف تھی۔

اس تبدیلی کی دوسری وجہ یورپ میں چودہویں صدی کی 'طاعون کی وباء' تھی جسے 'کالی موت' بھی کہا جاتا ہے۔ اس وباء کی وجہ سے یورپ میں مزدوروں، خریداروں اور پیداوار کی شدید کمی واقع ہوئی جس کی وجہ سے دیہاتی آبادی شہروں کی طرف منتقل ہونے لگی اور شہری آبادیاں نئی منڈیوں کی تلاش میں یورپ، ہندوستان اور

امریکہ کا رخ کرنا شروع ہو گئیں۔ اس وباء کے اثرات سے متاثر ہو کر اس وقت کی یورپ کی حکومتوں نے ہندوستان کی طرف اپنی اپنی تجارتی کمپنیاں بھیجنا شروع کر دیں۔

یورپ کے معاشی اصولوں میں تبدیلی کی تیسری وجہ پروٹیسٹنٹ تحریکِ اصلاح کی یورپ میں کامیابی تھی، جس نے عیسائیت میں دنیا پرستی کا جواز فراہم کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہوں کو دولت جمع کرنے کے جواز دیے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی فلسفہ

سرمایہ دارانہ افکار کو مکمل طور پر بیان کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہم یہاں محض اس کا بنیادی فلسفہ ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ انسان ہر کام اپنے مادی فائدے اور خواہشات کی تکمیل کے لیے کرتا ہے۔ اسی فائدے کے لیے وہ تجارت میں مختلف پیشے اور کام اپناتا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے کام کرے۔ انسان کے اپنے مفاد(self interest) کے لیے زیادہ کام کرنے سے معاشرے کو زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ انسان کا سب سے زیادہ فائدہ سرمائے کو بڑھانا اور جمع کرنا ہے۔ یہ سرمایہ اس وقت زیادہ ہو سکتا ہے جب انسان کو زیادہ سے زیادہ پیداوار یا تجارت کرنے اور اس کو فروغ دینے کے مواقع ملیں۔

پیداوار اور تجارت کا عمل یہ ہے کہ کوئی انسان پیداوار اور تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کرتا ہے اور کوئی اس کام کو چلانے کے لیے مزدوری کرتا ہے اور کوئی پیداوار اور تجارت کے لیے زمین فراہم کرتا ہے۔ پھر پیداوار اور تجارتی اشیاء فروخت کرنے سے منافع پیدا ہوتا ہے۔ اس منافع سے مزدور، سرمایہ دار، زمیندار اور تاجر سب کو فائدہ ہوتا ہے۔

اس لیے ایک ایسا معاشی نظام ہونا چاہیے جس میں گورنمنٹ کا اثر کم سے کم ہو یعنی گورنمنٹ کے لگائے ہوئے ٹیکس کم ہوں اور تمام ادارے پرائیویٹ کام کریں۔ اس نظام سے انسان کو آزادی سے کام کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے گا اور ایک مقابلے کی فضاء قائم ہوگی۔ اس مقابلے میں انسان اپنا زیادہ سے زیادہ منافع کما سکتا ہے اور سرمائے میں اضافہ کر سکتا ہے۔ اسی نظام کو آج کے دور میں 'آزاد معیشت' (Free Economy) کا نام دیا گیا ہے۔

اسی فلسفے اور فکر پر یورپ میں کمپنیوں کی تجارت کا نظام، بینکوں کی تجارت کا نظام اور کرنسی نوٹوں کا اجراء ہوا جسے آج 'پیپر کرنسی' کہا جاتا ہے۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم ایک نظر کمپنیوں، بینکوں اور کرنسی نوٹ کی تاریخ پر ڈالیں۔

عالمی کمپنیوں کی تاریخ

سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں طاعون کی وباء پھیلنے سے یورپ کی تقریباً ایک تہائی آبادی مر گئی، جس نے یورپ کے روایتی جاگیردارانہ نظام پر منفی اثر ڈالا۔ مزدور طبقہ کم ہو جانے سے جہاں جاگیرداروں کی پیداوار میں کمی آئی، وہیں انھیں مزدوروں کی اجرت میں بھی اضافہ کرنا پڑا اور پھر عوام کے کم ہو جانے سے طلب اور کھپت میں بھی کمی آئی۔ اس طرح یورپ کساد بازاری کا شکار ہو گیا۔ اس تناظر میں یورپ کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے مال کی کھپت کے لیے نئی منڈیاں اور اپنی ضروریاتِ زندگی کو حاصل کرنے کے لیے سستی منڈیاں تلاش کرے۔ چنانچہ یورپی جاگیردار سمندری راستوں کے ذریعے نئی منڈیوں کی تلاش میں نکلے کیونکہ زمینی راستوں میں خلافتِ عثمانیہ کا قبضہ تھا۔ یورپی جاگیردار سمندری سفر کے دوران تجارت سے زیادہ قزاقی کرتے تھے۔ ان میں پرتگالی، جرمن، فرانسیسی، ولندیزی، ہسپانوی اور انگریز سب شامل تھے۔ ان کی مثال بھوکے بھیڑیوں کی سی تھی جو نہ صرف اپنے شکار کو غافل دیکھ کر اسے کھا جاتے تھے بلکہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔

یہیں سے کمپنیوں کا آغاز ہوا، جو ان یورپی جاگیرداروں نے اس وقت تجارت کی غرض سے تشکیل دی تھیں۔ انھی میں سے ایک کمپنی برصغیر پاک وہند میں 'ایسٹ انڈیا کمپنی' (East India Company) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس مرحلے کو اقتصادی تجزیہ نگار یورپ میں 'ارتکازِ دولت' کا نام دیتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جس میں دولت دنیا بھر سے آکر مغرب میں جمع ہو گئی۔ نئی منڈیوں کی تلاش میں یورپی ممالک کے تاجروں نے تین علاقوں کا رخ کیا؛ ایک براِعظم افریقہ، دوسرا براِعظم شمالی و جنوبی امریکہ اور تیسرا برِصغیر پاک وہند۔ آغاز میں ان کی توجہ افریقہ کی طرف خاص نہ تھی کیونکہ اس وقت تک افریقی باشندوں کو بھی افریقہ کے قدرتی ذخائر کا علم نہ تھا۔ البتہ تیل، ہیرے، سونا، چاندی اور دیگر معدنیات کے دریافت ہونے کے بعد مغربی کمپنیوں کا وہاں اتنا شدید تسلط قائم ہوا کہ آج بھی وہاں کی حکومتوں کو بنانے اور گرانے میں انہی کا ہاتھ ہوتا ہے جبکہ عوام پہلے کی طرح محروم ہیں۔ افریقہ کی طرح امریکہ بھی ان کا مطمحِ نظر نہ تھا۔ امریکہ تو ہندوستان کے مختصر راستے کی جستجو میں اچانک دریافت ہوا تھا۔ اسی لیے وہاں کے اصلی باشندوں کو 'سرخ ہندی' (Red

(Indians) کہا جاتا ہے۔ اگرچہ افریقہ اور امریکہ کو بھی یورپی اقوام نے کچھ کم نہیں لوٹا مگر ان کا بنیادی اصل ہدف ہندوستان تھا جہاں کی دولت اور زرخیزی کا انھیں بخوبی علم تھا۔

یورپ سے ہندوستان کے سفر کے دو راستے تھے۔ پہلا اور مختصر ترین راستہ 'بحیرۂ روم' سے ہو کر مصر اور مصر سے ہوتے ہوئے 'بحیرۂ احمر' (قزوین) اور بحیرۂ عرب کے ذریعے ہندوستان پہنچتا تھا، اور یہ تمام راستہ سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ تسلط تھا۔ دوسرا راستہ جنوبی افریقہ کے شہر 'کیپ ٹاؤن' (Cape Town) کے گرد گھوم کر بحیرۂ عرب اور پھر ہندوستان پہنچتا تھا۔ پہلا راستہ دو ماہ میں طے ہوتا تھا جبکہ دوسرے راستے میں آٹھ ماہ سے زیادہ عرصہ لگ جاتا تھا۔ ثانی الذکر راستے کو 'امید کا راستہ' اور 'کیپ ٹاون' کو 'شہرِ امید' (Cape of Good Hope) یا 'رأس رجاء الصالح' کہا جانے لگا، کیونکہ اس راستے سے یورپی ممالک نے اپنی اپنی انڈین کمپنیاں بنا کر سمندری بیڑے روانہ کیے تھے۔ اس سفر کی انوکھی بات یہ تھی کہ وہ ملاح جس نے سب سے پہلے بیڑے کو ہندوستان پہنچنے میں مدد دی، وہ مسلمان عرب تھا۔ اس طرح سب سے پہلے پرتگالی، پھر ولندیزوی، پھر فرانسیسی اور آخر میں انگریز آتے رہے مگر مؤخر الذکر نے باقیوں کو بھگا کر اکیلے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان پر قبضے نے مغرب کو پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں اور اس کے بعد پوری دنیا پر غلبہ حاصل کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

امتِ مسلمہ (خاص طور پر مسلمانانِ برصغیر) سے لوٹی ہوئی دولت کے بل بوتے پر اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں یورپ اور امریکہ میں صنعتی انقلاب آیا تھا۔ اس دولت سے کمپنیوں نے یورپ میں نئے نئے کارخانے لگانا شروع کیے۔ ان کارخانوں میں سستی مزدوری حاصل کرنے کے لیے انھوں نے افریقہ کے ساحلی علاقوں پر حملے کر کے لاکھوں انسانوں کو غلام بنایا اور ان سے مفت کام لیا۔ گویا مغرب کی مادی ترقی برصغیر کی دولت، افریقہ کی محنت اور امریکہ کی زمین پر ناجائز قبضہ کی مرہونِ منت ہے۔ اس پیداوار کو عالمی منڈیوں تک پہنچانے کے لیے خلافتِ عثمانیہ کی شکل میں اب بھی ایک بڑی رکاوٹ باقی تھی کیونکہ صرف اہم بحری اور بری راستے ہی نہیں بلکہ سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ اثر پورے عالمِ اسلام کی ایک بڑی منڈی تھی۔ بالآخر مغرب ہی کی سازش سے ۱۹۲۴ء میں خلافت کے خاتمے سے یہ رکاوٹ بھی دور ہو گئی اور نوآبادیاتی نظام کے تحت امتِ مسلمہ کو پچاس سے زائد چھوٹی قومی ریاستوں میں تبدیل کر دیا گیا اور ان ممالک کی منڈیوں تک رسائی حاصل کر لی۔ اس طرح یورپ عالمی منڈیوں پر قبضے کے دور میں داخل ہو گیا۔

اس دور میں بھی مغرب کو کئی مشکلات کا سامنا تھا۔ پہلی مشکل یہ تھی کہ مغرب کی اصطلاح کے مطابق 'تیسری دنیا' کے ان ممالک نے اپنی منڈیوں میں بیرونی درآمدات پر سخت پابندیاں اور بھاری ٹیکس عائد کر دیے تھے۔اس کے نتیجے میں ۱۹۲۹ء میں پیداوار کی زیادتی سے مغرب میں کرنسی کی قیمت ختم ہو کر رہ گئی۔ابھی سرمایہ دار ممالک اس بحران سے نکلنے نہ پائے تھے کہ ایشیا میں روس کے 'سوشلسٹ انقلاب' اور یورپ میں جرمنی کے (فاشزم) 'نازی انقلاب' نے سرمایہ دارانہ نظام کو للکارا۔اس تکرار میں دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں جہاں جرمنی کو شکست ہوئی، وہاں یورپ بھی عالمی قیادت کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا، جبکہ امریکہ اور روس دنیا کی دو عظیم طاقتوں کے طور پر ابھرے۔

روس اور امریکہ کی سرد جنگ بھی ایک قسم کی معاشی جنگ تھی۔ اس معاشی جنگ میں بھی سرمایہ دار مغرب کی کمپنیوں نے سبقت حاصل کر لی۔ گزشتہ سو سال میں ان کمپنیوں نے اپنے آپ کو اتنا مضبوط کیا ہے کہ وہ اس وقت عالمی پیداوار کو منڈی تک پہنچانے کے کاروبار پر مکمل قبضہ کر چکی ہیں۔ اس سو سال کے دوران کمپنیوں کے اس کاروبار کے طریقوں اور ہئیت نے کئی شکلیں تبدیل کی ہیں۔ان میں ملکی اور مقامی کمپنیاں، عالمی کمپنیاں، سرکاری کمپنیاں شامل ہیں۔ آج نیو ورلڈ آرڈر کے دور میں عالمی کمپنیاں ملکوں سے زیادہ بڑی ہو چکی ہیں۔ان کی تفصیل ہم کتاب کے دوسرے حصے 'نیو ورلڈ آرڈر' میں ذکر کریں گے ان شاء اللہ۔

بینک کی تاریخ

جوں جوں یورپ میں عالمی کاروبار ترقی کرتا گیا توں توں ان کمپنیوں کو سرمائے کی فراہمی کے لیے ایک منظم نظام کی ضرورت پیدا ہو گئی۔ اس ضرورت نے بینکوں اور کرنسی کے جدید نظام کو جنم دیا۔ یورپ میں بینکوں کی تاریخ 'صلیبی جنگوں' سے شروع ہوتی ہے جب صلیبی فوج کو رقم پہنچانے کے لیے کلیساء کی طرف سے نائٹ مقرر کیے گئے تھے جنھیں 'نائٹ ٹمپلر' کہا جاتا تھا۔ یہ نظام محدود پیمانے پر ہی قائم رہا۔ جدید یورپ کے بینکوں اور کرنسی کا آغاز ان یہودی صرّافوں سے ہوا جنھیں تجارت کے علاوہ کوئی اور پیشہ اپنانے کی اجازت نہ تھی۔ تاجر اپنا سونا، چاندی اور قیمتی چیزیں ان صرّافوں کے پاس رکھواتے اور ان سے ایک رسید لے لیتے تھے۔ جب یہ تاجر تجارت کے لیے باہر جاتے تو کسی چیز کو خریدنے کی بجائے صرّاف کی رسید پیش کر دیتے تھے۔ بیچنے والا تاجر اس رسید کو لے کر صرّاف کے پاس جاتا اور صرّاف اس کو اس کی قیمت کے مطابق سونا ادا کر دیتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان یہودی صرّافوں کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ بہت کم لوگ اپنا سونا طلب

کرنے کے لیے آتے ہیں، بلکہ وہ اشیاء کی تجارت کرتے وقت ان صرّافوں سے حاصل شدہ رسید آگے چلا دیتے ہیں۔ اسی طرح رسید حاصل کرنے والا اس رسید کو مزید آگے چلا دیتا ہے۔

اس مشاہدے کے تحت بتدریج صرّافوں کے پاس بہت زیادہ سونا جمع ہونے لگا کیونکہ صرف بیس فیصد یا اس سے بھی کم افراد ایسے تھے جو سونے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس پر صرّافوں نے وقتی ادائیگی کے لیے کچھ سونا چھوڑ کر باقی کو سودی قرض کی صورت میں کاروبار میں لگانا شروع کر دیا۔ اس طرح صرّافہ باقاعدہ اداروں کی شکل اختیار کرتے گئے اور یہ موجودہ بینکوں کی ابتدائی شکل تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حکومتوں نے بھی اس نظام کو اپنانا شروع کر دیا۔ حکومتیں اپنی دولت ان بینکوں میں جمع کرنے لگیں اور اس کے بدلے ضرورت پڑنے پر اصل سے زیادہ قرض لے لیتیں۔ اس طرح ان اداروں کو حکومتی سطح پر قانونی اجازت مل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یورپ کے تمام ممالک میں بینکوں کی شاخیں کھل گئیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ چونکہ یہ ادارے صرّافہ سے بینک میں تبدیل ہوئے اور صرّافہ کی اکثریت یہودیوں کے ہاتھ میں تھی، اس لیے آج دنیا کے اسی فیصد سے زیادہ بینک بھی یہودیوں کی ملکیت ہیں۔ ان بینکوں کا تمام اقوامِ عالم اور خاص طور پر امتِ مسلمہ کو غلام بنانے میں اہم کردار رہا ہے۔ ۱۶۰۹ء میں سب سے پہلا بینک ہالینڈ میں کھلا۔ ۱۶۹۵ء میں انگلستان کا بینک بنا۔ اس کے بعد بتدریج اس کاروبار میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور فرانس، جرمنی، آسٹریا اور روس وغیرہ میں بھی بینکوں کا کاروبار شروع ہو گیا۔

کرنسی کی تاریخ

اہلِ فن کے نزدیک کرنسی اشیاء کی خرید و فروخت کے آلہ کو کہتے ہیں۔ اسے شریعت کی اصطلاح میں 'ثمن' کہا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم سے سونا اور چاندی کرنسی یا ثمن کے طور پہ استعمال ہوتے چلے آرہے ہیں اور اسلام کی رو سے فقہاء نے بھی انھی دو کو 'ثمنِ حقیقی' کہا ہے۔ یعنی کسی بھی شے کی قیمت سونے یا چاندی کی مقدار سے متعین ہوتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں ثمنِ حقیقی کے طور پر سونے اور چاندی کے سکے درہم اور دینار کی شکل میں رائج رہے۔ مختلف اقوام میں سونے اور چاندی کو جمع کرنے کے لیے مختلف ذرائع استعمال ہوتے رہے۔ بنی اسرائیل نے مصر سے نکلتے ہوئے سونے اور چاندی کو زیوارت کی شکل میں جمع کیا اور اب بھی انھیں محفوظ کرنے کے لیے زیورات یا اینٹوں کی شکل دی جاتی ہے۔

یورپ میں سونے کا کاروبار کرنے والے صرّافہ عام طور پر یہودی تھے۔ اپنی فطرت کی وجہ سے یہودی زیادہ تر تجارت کے پیشے سے منسلک ہوئے جس کے ذریعے وہ دوسری اقوام کو ساہوکاری کے نظام میں بآسانی جکڑ سکتے

تھے۔ صرافہ اور ساہوکاری کا گہرا تعلق تھا اور عام لوگ اپنی جمع پونجی کو محفوظ کرنے کے لیے ان صرافوں کے پاس اضافی سونا رکھواتے تھے جس کے ثبوت کے طور پر صرافہ انھیں رسید جاری کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ تاجروں نے قیمت ادا کرتے ہوئے سونے کی بجائے رسیدیں پیش کرنا شروع کر دیں۔ رسید حاصل کرنے والے کا حق ہوتا تھا کہ وہ صرافہ کے یہاں جا کر رسید کے بدلے سونا لے لے، تاہم تجارت پیشہ لوگ آسانی کی خاطر اسی رسید کو اپنے کاروبار میں آگے چلا دیتے تھے۔ اس طرح رسیدیں 'ثمنِ حقیقی' کے بجائے 'ثمنِ عرفی' کی حیثیت سے بازاروں میں استعمال ہونا شروع ہو گئیں۔ یہی رسیدیں موجودہ زمانے کی 'کرنسی نوٹ' کی ابتدائی شکل تھی اور اسے صرافہ اور تاجر کے درمیان نوٹ یا یادداشت ہونے کی بنا پر نوٹ کہا جانے لگا۔ اس کرنسی کے عوض سونے کی موجودگی لازم تھی۔ اسی لیے آج بھی آپ دنیا کے بیشتر نوٹوں کی طرح پاکستانی نوٹ پر بھی یہ عبارت درج پائیں گے کہ 'بینک دولتِ پاکستان روپیہ حاملِ ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا'، حکومتِ پاکستان کی ضمانت سے جاری ہوا، دستخط گورنر بینک دولتِ پاکستان۔ یہاں ہذا سے مراد نوٹ ہے اور روپیہ سے مراد سونے یا چاندی کے سکے ہیں۔

دورِ تنویریت (۱۶۷۵ء تا ۱۷۸۹ء)

یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں شروع ہونے والی حقوق انسانی کی جنگ اور سائنس اور مذہب کی جنگ نے عقل کو علمِ وحی کے مقابلے میں دلیل مان لیا تھا۔ اب یورپ کے فلسفیوں نے اپنی ناقص عقلوں کی بنیاد پر یہ فیصلہ دیا کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا، جبکہ مذہب اور بادشاہ نے اس کو قید کر رکھا ہے۔ مذہب ایک تاریکی ہے جس نے انسان کو گناہ اور ثواب، حرام اور حلال اور آخرت میں جواب دہی کی قید میں جکڑ رکھا ہے۔ اس تاریکی کا انکار ہی 'تنویریت' یا 'روشن خیالی' ہے۔ کتاب American History (by James A. Henretta and others 1993) میں ص۱۱۳ پر مصنف 'روشن خیالی' (Enlightenment) کی تحریک کے متعلق لکھتا ہے:

''روشن خیالی کی تحریک ایک پیچیدہ تحریک تھی مگر اس کے تمام فلسفیوں میں چار اصولوں پر اتفاق پایا جاتا تھا جو مندرجہ ذیل ہیں:

- پہلا اصول اس بات پر ایمان رکھنا کہ انسانی عقل دلیل ہے۔
- دوسرا اصول یہ کہ اس بات پر ایمان رکھنا کہ یہ دنیا فطری طبعی قوانین پر چل رہی ہے۔
- تیسرا اصول حکومت میں کسی الوہی اختیار سے انکار کرنا ہے۔

- چوتھا اصول معاشرے کی مسلسل ترقی ہے''۔

روشن خیال تحریک سے مراد وہ فکری اور ادبی رجحانات ہیں جو انقلابِ فرانس سے قبل اٹھارویں صدی میں یورپ اور امریکہ میں فروغ پائے تھے۔ یہ اصطلاح اس زمانے کے مفکرین نے خود وضع کی تھی جن کے یہاں وہ جہالت اور تاریکی کے دور سے عقل، سائنس اور انسانیت کے احترام کے روشن دور کی طرف جارہے تھے۔ تنویریت کی ابتداء سترہویں صدی میں 'ڈیکارٹس' (Descartes) اور 'سپینوزا' (Spinoza) جیسے عقل پرست مفکرین، 'تھامس ہابس' (Thomas Hobbes) اور 'جان لاک' (John Locke) جیسے سیاسی فلسفی اور 'پییئر بیلی' (Pierre Bayle) جیسے شکی نظریے کا پرچار کرنے والے مفکرین سے ہوئی تھی۔ ان تمام مفکرین کے درمیان مشترکہ قدر 'انسانی عقل' کی طاقت پر پکا ایمان تھا۔ اس دور کے مفکرین 'نیوٹن' (Isaac Newton) کے 'قانونِ جاذبیت' کی دریافت سے نہایت متاثر تھے۔ ان کے خیال میں اگر انسان اللہ کے تخلیق کردہ کائنات کے قوانین کا کھوج لگا سکتا ہے تو وہ تمام کائنات اور انسانی معاشرے کے قوانین بھی دریافت کر سکتا ہے۔ عقل کو احتیاط سے استعمال کرتے ہوئے علم، سائنس حتیٰ کہ اخلاقی اقدار کے بھید جانے جاسکتے ہیں۔ البتہ 'لاک' کے فلسفے سے عقلیت میں یہ اضافہ ہوا کہ علمی حقائق بدیہی نہیں ہیں بلکہ عقل کی سرپرستی میں مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتے ہیں اور ان اصولوں کے تحت حاصل کی گئی صحیح تعلیم سے خود انسانی فطرت بہتر سے بہترین میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ یعنی دینی کتب کے بجائے براہِ راست فطرت کے مطالعے سے حقیقت تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

ان فلسفیوں کی نظر میں کلیساء اور خاص طور پر رومن کیتھولک کلیساء وہ بنیادی طاقت تھی جس نے ماضی میں انسانی عقل کو غلام بنائے رکھا۔ ان فلسفیوں میں سے کسی نے مذہب کو اختیار بھی کیا اور خدا یا آخرت پر ایمان بھی لایا تو اس بنیاد پر نہیں کہ یہ عیسائی علمِ الٰہیات کا کہنا ہے بلکہ جو کچھ اس کی عقل کو اپیل کرنے میں کامیاب ہو گیا اسی پر ایمان لایا۔ اور اس میں بھی ایسے خدا پر ایمان لایا جس نے کائنات کو شروع تو کردیا ہے مگر اب وہ از خود انسانیت کو کسی چیز کا پابند نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آخرت بھی ایسی کہ انسان کی توقعات اس سے وابستہ نہیں ہونی چاہییں بلکہ اسے اس دنیا کو بہتر بنانے کے لیے وسائل تلاش کرنے چاہییں اور دنیوی سعادت مذہبی سکون پر مقدم ہے۔

درحقیقت 'تنویریت' کوئی مخصوص افکار کا نام نہیں بلکہ ایک طرزِ فکر کا نام ہے اور وہ طرزِ فکر یہ ہے کہ تمام عقائد، افکار اور اقدار کا دوبارہ جائزہ لیا جائے، ہر شے پر سوال اٹھائے جائیں تاکہ مختلف جہات میں نئی نئی سوچیں پیدا ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تصنیفات میں نہایت تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ

'تنویریت' کے بہت سے علمبردار فلسفی بھی نہ تھے بلکہ وہ محض اپنی ذات کے گرد عوام کو جمع کرنے کے لیے بکنے والے افراد تھے۔ وہ اپنے آپ کو 'ہیومنسٹ فرقے' کے افراد گردانتے تھے۔ انھوں نے رائے عامہ کو اپنے افکار کی طرف متوجہ کرنے کے لیے پمفلٹ، غیر معروف لکھاریوں کے کتابچے اور کثیر تعداد میں نکلنے والے اداریے اور اخبارات کا بھرپور استعمال کیا تھا۔

ان فلسفیوں میں سے زیادہ تر کا تعلق فرانس سے تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں فرانس رومن کیتھولک عیسائی مذہب کا سب سے مضبوط مرکز تھا۔ یہیں سیاسی مفکر اور قانون دان 'چارلس ڈی مونٹسکی' (Charles de Montesquieu) نے اپنے مقالے شائع کرنا شروع کیے جن میں موجودہ شہنشاہیت اور پاپائیت کے اداروں کی برائیوں اور بدعنوانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سیاسی اداروں کا وسیع مطالعہ پیش کیا جو ''قوانین کی روح'' (The Spirit of Laws) نامی کتاب میں جمع ہوئے۔ اسی طرح پیرس میں ہی مختلف فلسفیانہ مقالوں کے مصنف 'ڈینیس ڈیڈیروٹ' (Denis Diderot) نے دیگر مفکرین کے ساتھ مل کر ایک انسائیکلوپیڈیا شائع کرنا شروع کیا جس میں 'تنویریت' کا موقف بیان کرنے کے لیے تمام علوم کے مختصر مجموعوں کے ساتھ ساتھ اس کے مخالفین پر حملے کرنے کے لیے تنقیدی حربے بھی تھے۔

اس میدان میں مؤثر کن کردار کا حامل فرانسیسی ناول نویس اور شاعر 'والتیئر' (Voltaire) تھا۔ وہ اپنے زمانے کے تنویری فلسفے کو اپنے مقالوں، جارحانہ تنقید، تحقیر آمیز مضامین، مختصر ناولوں اور مصنفین اور حکمرانوں کے نام بے شمار خطوط کے ذریعے پھیلانے کی وجہ سے مشہور ہے۔ پھر اس سے زیادہ مستند تصنیفات ایک اور فلسفی 'جین جاک روسو' (Jean Jacques Rousseau) کی ہیں۔ 'روسو' فرانس کا وہ فلسفی ہے جس کے فلسفے کی بنیاد پر آج کی 'جمہوریت' قائم ہے۔ یہ ایسے مفکرین تھے جنھوں نے تنویری فلسفے کے ساتھ اپنی آزاد خیالی، بدکرداری اور بدکاریوں کا تذکرہ خود اپنی تحریروں میں کھل کر کیا ہے۔ 'والتیئر' کا ناول ''کاندید'' (Candide) اور ''فلسفیانہ لغات'' (Dictionnaire Philosophique) اور روسو کی کتاب ''معاہدۂ عمرانی'' (Social Contract) نے یورپ میں ہلچل مچادی۔ ان فلسفیوں کے افکار نے گلڈ معاشرے، مارٹن لوتھر کی تحریکِ اصلاح اور پاپائیت و شہنشاہیت کے پس منظر میں انقلاب کی راہ ہموار کردی۔

'تنویریت' نہایت وسیع تحریک تھی جس کے نمائندے پورے مغرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ 'کانٹ' جرمنی میں، 'ڈیوڈ ہیوم' برطانیہ میں، 'سیزیر بیکاریا' (Cesare Beccaria) اٹلی میں اور امریکی نوآبادیوں میں 'تھامس جیفرسن' (Thomas Jefferson) موجود تھے۔

اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں تنویریت کے قائدین کو مختلف قسم کے نظریات کے خلاف مشکل جد وجہد کا سامنا تھا۔ اپنی تصانیف کی وجہ سے بہت سوں نے قید وبند کا سامنا کیا۔ حکومتوں کی جانب سے بہت سی تصانیف پر پابندیاں عائد کی جاتی رہیں اور چرچ کی طرف سے بھی تنقید ہوتی رہی۔ تاہم اسی صدی کے آخری وسط میں کامیابی تنویریت کی طرف بڑھ رہی تھی، یہاں تک کہ ۱۷۷۰ء کی دہائی میں تنویریت کی دوسری نسل کے فلسفیوں کو حکومتوں کی جانب سے مراعات ملنے لگیں اور ان کے ہاتھوں میں فکری اداروں کی باگ ڈور دے دی گئی۔ کتابوں، اخبارات اور تصانیف کی وسیع پیمانے پر اشاعت نے ان کے افکار کو مزید پھیلا دیا۔ حتیٰ کہ حکمران طبقہ، مذہبی علماء اور راہب بھی ان کے نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کم از کم ان کی اصطلاحات کو تو ہر طبقے نے اپنایا۔ مزید یہ کہ 'والٹیئر' کے 'فلسفی بادشاہ' کے نظریے نے حکمران طبقوں میں خوب رواج پایا۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں تنویریت کے نظریات میں کچھ تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ 'روسو' کے افکار کے مطابق انسانی جذبات اور احساسات کو بھی انسانی عقل کی طرح تعظیم واحترام کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ایک اور تبدیلی یہ آئی کہ مفکرین نے تنقیدی روش کو سیاست اور اقتصاد کے میدانوں تک وسیع کر دیا۔ رفتہ رفتہ تحریکِ تنویر کے اثرات امریکہ تک پہنچنا شروع ہو گئے اور بالآخر یہی تحریکِ تنویریت ۱۷۷۶ء میں 'انقلابِ امریکہ' کا باعث بنی۔ دوسری جانب امریکہ میں 'آزادی کی قرارداد' (Declaration of Independence) اور جنگِ انقلاب کو یورپ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا کیونکہ اس سے ثابت ہو گیا کہ امریکہ میں 'تنویریت' بحث مباحثوں کی حدوں کو پھلانگ کر عملی میدان میں اتر چکی ہے۔ اس طرح یورپ میں موجود نظاموں کے خلاف تنقید تیز ہو گئی۔ 'تحریکِ تنویریت' کی امریکہ میں کامیابی فرانس میں انقلاب کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔

'تنویریت' کا دور اگرچہ ۱۷۸۹ء میں 'انقلابِ فرانس' پر ختم ہو جاتا ہے مگر انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران بھی اسی میراث کو آگے بڑھایا گیا۔ 'تنویریت' کو کلیساء کے سقوط، جدید سیکولرزم کے فروغ، سیاسی آزادی کے حصول، اقتصادی تبدیلیوں اور انسانی اصلاحات کے نفاذ میں کلیدی کردار حاصل رہا۔ اور اس طرح 'ترقی' کے عقیدہ پر ایمان مزید پختہ ہو گیا۔

تحریکِ تنویریت اور انقلابِ امریکہ

'تحریک تنویریت' کے اثرات یورپ سے امریکہ میں کتابوں کی شکل میں پہنچے تھے۔امریکہ کی تحریکِ آزادی کے تقریباً تمام ہی راہنما اس فکر کے حامی تھے جن میں 'بنجامن فرنکلن' (Benjamin Franklin)اور 'جیفرسن' شامل ہیں۔۱۷۶۲ء تا۱۷۷۴ء برطانیہ نے امریکہ میں موجود اپنی ریاستوں پر دس نئے ٹیکس لگادیے۔ان ٹیکسوں میں چائے، چینی اور مالیات پر ٹیکس وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ان ٹیکسوں کو عوام نے تنویری قیادت کے تحت اٹھنے والے احتجاج میں ظالمانہ قرار دے دیا۔ یہ پر امن احتجاج رفتہ رفتہ 'جنگِ آزادی' میں تبدیل ہو گیا اور ایک بر اعظمی فوج منظم کی گئی جس کی قیادت امریکہ کے پہلے صدر 'جارج واشنگٹن' (George Washington)نے کی۔اس تحریک میں برطانیہ سے امریکہ کی آزادی چاہنے والے رضاکار بھرتی کیے گئے۔اس فوج اور دوسرے امریکیوں نے 'جارج واشنگٹن' کی قیادت میں برطانیہ سے آزادی کا اعلان کر دیا۔امریکہ کے آزادی کا اعلان کے لیے با قاعدہ ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جسے 'امریکہ کی آزادی کااعلامیہ' (Declaration of Independence)کہتے ہیں۔ اس آزادی کے اعلامیہ کو امریکہ کے تیسرے صدر 'جیفرسن' نے تحریر کیا۔'جیفرسن' نے اس اعلامیہ کے بارے میں کہا کہ اس نے یہ اعلامیہ لکھنے کے لیے کوئی بہت زیادہ کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ اس نے 'تحریکِ تنویریت' کے مفکرین کی فکر کو لکھا ہے۔یوں دنیا میں پہلی لادین مملکت وجود میں آگئی۔

تحریکِ تنویریت اور انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء)؛یورپ میں اولڈ ورلڈ آرڈر کا زوال

'انقلابِ انگلستان' اور 'انقلابِ امریکہ' کے بعد 'انقلابِ فرانس' نشاۃ ثانیہ کے دور کا آخری واقعہ تھا جس کے بعد مغرب کی ساخت یکسر تبدیل ہوگئی اور مغرب اپنی جدید شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ 'انقلابِ فرانس' 'اولڈ ورلڈ آرڈر' کا زوال اور 'نیو ورلڈ آرڈر' کا آغاز تھا۔ ۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو 'انقلابِ فرانس' دینی اور شاہی حکمرانی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ اب پاپائیت اور شہنشاہیت کی جگہ لادینیت، وطنی ریاست، جمہوری دستور اور سرمایہ دارانہ نظام جیسے نظریات نے لے لی تھی۔ اگرچہ انقلاب کی فوری وجوہات تو طبقۂ خواص کے عوام پر مظالم تھے مگر اس کے پسِ منظر میں قرونِ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کی پوری تاریخ تھی۔ فرانس میں 'لوئی شازدہم' (Louis XVI)کی حکومت تھی۔ ۱۷۸۸ء میں فرانس میں قحط پڑا،لوگوں نے اس قحط سے ہونے والے نقصانات کو پورا کرنے اور ٹیکس میں کمی کا مطالبہ کیا جس پر بادشاہ نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس

کے ساتھ ساتھ بادشاہ اور اس کے حواریوں کی پر تعیش زندگیاں بھی جاری رہیں۔ فرانس ان دنوں 'تحریکِ تنویریت' کا مرکز تھا اور اس تحریک کے روح رواں فلسفیوں 'روسو' اور 'والتیئر' کی تحریروں نے بھی آگ لگا رکھی تھی۔ لوگ بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے 'باسٹل' (Bastille) نامی قلعہ جو ایک جیل کے طور پر استعمال ہو رہا تھا، پر قبضہ کر لیا اور اپنے قیدی آزاد کرا لیے۔ اس کے بعد مظاہروں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو مظاہرین نے حقوقِ انسانی کے نام سے ایک اعلامیہ جاری کیا۔ اس اعلامیہ میں انسا ن کو آزاد اور قانون کو انسان کی آزادی کا مظہر تسلیم کیا گیا۔ حاکمیتِ اعلیٰ پر عوام کا اختیار تسلیم کیا گیا۔ اس انقلاب سے نہ صرف یورپ بلکہ دنیا بھر کا فکری، سیاسی، سماجی اور عسکری نقشہ تبدیل ہو گیا۔ پھر دنیا کے بیشتر علاقوں پر فرانس اور انگلستان کے عسکری تسلط نے اس انقلاب کو عالمی سطح پر پہنچا دیا۔ اس طرح جو بھی تبدیلیاں یورپ میں رونما ہوتی تھیں، ان کا اثر فوراً نوآبادیاتی ممالک میں نظر آنے لگتا تھا۔

انقلابِ فرانس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تین خلاء

انقلابِ فرانس کے نتیجے میں انسانی معاشرے میں تین خلاء پیدا ہوئے:

- پہلا خلاء کلیساء کی پسپائی اور خدائی اختیارات کے خاتمے سے تصورِ حاکمیت میں پیدا ہوا۔
- دوسرا خلاء بادشاہت کے خاتمے سے نظامِ حکومت میں پیدا ہوا۔
- تیسرا خلاء دین کے ختم ہو جانے سے معاشرے کی اخلاقی اقدار میں پیدا ہوا۔

ان تینوں خلاؤں کو پر کرنے کے لیے سیکولرزم آگے بڑھا اور اپنی سابقہ چار سو سالہ محنت کی بدولت اس نے دنیا کو نئے انداز سے ترتیب دیا۔ تصورِ حاکمیت کے لیے ہیومنزم کے نظریات کو رائج کیا، سیاست کے انتظام کے لیے جمہوریت کا نظام قائم کیا، اخلاقی اقدار کے تعیین کے لیے عقلِ انسانی کو معیار بنایا اور اجتماعیت چلانے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام متعارف کروایا۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر اولڈ ورلڈ آرڈر کی تاریخ کا خاتمہ ہو رہا ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جس پر عصرِ حاضر کی تفہیم کا دار و مدار ہے۔

تاریخِ مغرب کا تجزیہ

جس طرح ہم نے پہلے باب کے آخر میں تاریخِ یہود کا تجزیہ پیش کیا تھا، اسی طرح یہاں تاریخِ مغرب کا تجزیہ پیش کر رہے ہیں۔ تاریخِ مغرب کی بابت ہمارے تجزیہ کی بنیاد یہ ہے کہ 'دنیا کی قدیم ترتیب' (اولڈ ورلڈ آرڈر) کیسے 'دنیا کی جدید ترتیب' (نیو ورلڈ آرڈر) میں تبدیل ہوئی۔

عیسائیت کی حقیقت

'عیسائیت' درحقیقت دینِ مداہنت اور درباری دین تھا۔ اس نے یہودیوں کی سازش سے تثلیث کا عقیدہ اپنالیا جس کے مطابق ان کا ایمان ٹھہرا کہ حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام خدا کے بیٹے ہیں جنھوں نے انسانیت کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو صلیب پر چڑھایا تھا۔اب انسان کی نجات اس میں ہے کہ وہ ان پر ایمان لے آئے اور اسی سے وہ اللہ کے نزدیک جنت کا مستحق ٹھہرے گا۔انسانیت کو اس کے گناہوں سے خلاصی دلانے کے لیے انھوں نے مشنری اداروں کے ذریعے دنیا بھر میں تبلیغ شروع کی۔افریقہ اور امریکہ سمیت کئی براعظموں میں انھوں نے یہ عقیدہ وہاں کے باشندوں پر زبردستی مسلط کیا۔ ان کے بقول جب زمین تیار ہو جائے گی تو حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام دوبارہ نازل ہو کر تمام بے ایمان لوگوں کا خاتمہ کر دیں گے اور یوں خدائی حکومت قائم ہو جائے گی۔

عیسائیت کی پروٹیسٹنٹ ازم میں تبدیلی اور اس کا کردار

تاریخ میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہودیوں کی سازش سے 'عیسائیت' نے ایک دفعہ پھر اپنے عقائد بدلے۔ 'جدید عیسائیت' ...جسے 'پروٹیسٹنٹ ازم' کہا جاتا ہے...کی افزائش نے مغرب میں نئی تبدیلیوں کی راہ ہموار کی۔ اس نے ایک طرف عیسائی یورپ کے لیے 'سیکولرزم' (لادینیت) کا دروازہ کھولا اور دوسری طرف یہودیوں کے عقائد کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے منصوبوں میں مدد دینا لازمی سمجھا۔انھوں نے عیسائیوں میں یہ عقیدہ عام کیا کہ یہودی منصوبے پورے ہونے کے بعد ہی حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام تشریف لائیں گے۔ گویا ان جدت پسند عیسائیوں کے یہاں یہودی اور عیسائی عقائد دونوں یکجا ہو گئے تھے۔

مغرب میں سیکولرزم کا ارتقاء اور اس کے عوامل

مغرب میں سیکولرزم کے ارتقاء میں درجِ ذیل عوامل نے کردار ادا کیا:

ا۔ حقوقِ انسانی کی جنگ

حقوقِ انسانی آج کل معاشرے کا سب سے زیادہ مقبول نعرہ ہے۔ حقوقِ انسانی کی جنگ کا آغاز 'میگنا کارٹا' سے ہوا مگر پانچ سو سالہ تاریخ میں اس نے کئی شکلیں اختیار کیں۔ کبھی اس جنگ میں محاذ کلیساء کے خلاف اور کبھی شاہی جبر کے خلاف رہا۔ یہ جنگ کبھی یورپ میں انسانی معاشروں میں تبدیلی اور کبھی یہودیوں کی آزادی

کے لیے چھڑی۔ اسی جنگ کے نتیجے میں دنیا میں 'جمہوریت' کا نظام قائم کیا گیا۔ پھر اسی جنگ کو 'خلافتِ عثمانیہ' اور اسلام کے خلاف بھی خوب بھڑکایا گیا۔ اس لحاظ سے حقوقِ انسانی جدید مغرب کا موثر ترین آلہ ثابت ہوا۔

۲۔ مذہب اور سائنس کی جنگ

تعلیمی اداروں سے جنم لے کر گلڈ معاشروں میں شروع ہونے والی مذہب اور سائنس کے درمیان محاذ آرائی 'لادینیت' کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ آگے رونما ہونے والے 'انقلابِ فرانس' میں عیسائی مذہب کو سائنس نے ہی شکست دی تھی۔ پھر برطانوی اور فرانسیسی استعمار نے سائنس ہی کو امتِ مسلمہ میں مصنوعی خلفشار پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ واضح رہے کہ یہ جنگ دراصل عیسائی مذہب اور سائنس کے درمیان تھی جس کا دینِ اسلام سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

۳۔ عیسائی مذہب کے مصادر میں تبدیلی

اسی دور میں اصلاحی تحریکوں کا آغاز ہوا جن کا مقصد بظاہر کلیساء کی اصلاح تھا مگر ان کے نتیجے میں عیسائیت کے مصادر میں بنیادی تبدیلی آئی۔ کتبِ مقدسہ کی تشریح کا اختیار پادریوں کے ہاتھ سے چھین کر عوام الناس کی عقل کے سپرد کر دیا گیا۔ یہی عیسائیت میں ایک نئے افتراق کا موجب بنا اور یہی دورِ عقلیت کا اہم سنگ میل ثابت ہوا۔

۴۔ جدید معیشت کا ارتقاء

اسی طرح 'طاعون' کی وباء سے پیدا ہونے والے حالات کے نتیجے میں استعماری مقاصد کی خاطر عالمی کمپنیوں، کرنسی اور بینکوں کو ترقی ملی جس نے آگے جا کر جدید 'سرمایہ دارانہ نظام' کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ پھر جب 'لادینیت' نے 'انقلابِ فرانس' میں عیسائیت کو شکست دے دی تو اسی سرمایہ دارانہ نظام کو انسان کے مقصدِ زندگی کے طور پر پیش کیا گیا اور اسی سرمایہ دارانہ نظام کو چلانے کے لیے 'جمہوریت' کو سیاسی نظام بنا کر پیش کیا گیا۔

صلیبی صہیونی اتحاد

یہودیوں نے اپنے مزعومہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے عیسائی دنیا میں ایسی تحریکیں برپا کیں جن سے نہ صرف عیسائی مذہب میں نئے گروہ پیدا ہوئے بلکہ پرانے گروہوں کے نظریات بھی تبدیل ہو کر رہ گئے۔ پرانے

اور نئے عیسائی گروہوں نے مختلف طریقوں سے یہودیوں کی حمایت کی۔ یہاں ہم ان گروہوں کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں جن کی تاریخ ہم تفصیلی طور پر پہلے بیان کر چکے ہیں۔

پروٹیسٹنٹ 'صیہونی' عیسائی

پہلا قدم یہودیوں نے یہ اٹھایا کہ اپنے ہی دشمن سے کچھ افراد کو توڑ کر اپنے اہداف میں شریکِ کار بنا دیا۔ کلیسائی نظام کے خلاف آواز بلند کرنے والی 'مارٹن لوتھر' کی 'پروٹیسٹنٹ تحریک' کا یہودیوں سے گہرا تعلق ہے جو آج تک قائم ہے۔اس تحریک کے سبب 'رومن کیتھولک' عیسائی دو فرقوں میں بٹ گئے؛ایک روایتی اور دوسرا تجدد پسند فرقہ تھا۔ 'تجدد پسند' طبقے کی ایک خاص سوچ یہ رہی ہے کہ پرانی آسمانی کتابوں اور شریعت کو تسلیم کیا جائے۔اس سوچ نے پروٹیسٹنٹ فرقوں میں بالعموم یہودیت سے قربت کا دروازہ کھولا، یہاں تک کہ پروٹیسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد عقیدے کی حد تک اس بات کو مانتے ہیں کہ یہودیوں کو ارضِ فلسطین میں بالادستی حاصل کرنے کا مکمل حق اور اختیار ہے۔جب 'کیتھولک چرچ' نے ان فرقوں کے خلاف مزاحمت کی تو ان فرقوں کے بہت سے گروہ کلیساء کے مظالم سے تنگ آکر امریکہ ہجرت کر گئے اور وہاں ان کی برتری قائم ہوگئی۔ رفتہ رفتہ اس فرقے کی یہودیوں کے ساتھ قربت اتنی بڑھ گئی کہ ان کے مخالفین انھیں 'صہیونی عیسائی' کہنے لگے۔

لادین عیسائی

اس تجدد پسند فرقے نے 'کتابِ مقدس' کی تشریح کا حق ہر عام و خاص کو دے کر عیسائیوں میں 'لادین' طبقہ پیدا کیا جو دین کے احکامات پر تنقید کرتا اور ان کا مذاق اڑاتا تھا۔اس طرح مداہنت پسند روایتی عیسائیت کی خاصی تعداد علیحدہ ہوگئی اور باقی ماندہ تنقید و تضحیک کا نشانہ بنی، جو بالآخر 'لادینیت' کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکی اور شکست کھا گئی۔انقلابِ فرانس کے بعد بہت سے افراد ایسے تھے جن کو مذہب سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر پھر بھی روایتی طور پر اپنے آپ کو عیسائی گردانتے تھے۔اس طبقے نے اگلے آنے والے ایک سو سال میں یورپ کے پارلیمانوں میں یہودیوں کے لیے 'حقوقِ انسانی' کی بنیاد پر قرار دادیں منظور کروائیں اور انھیں برابری کے حقوق دلوائے۔اس طرح صدیوں سے رومن کلیساء کے باڑے میں بند یہودی دنیا میں واپس آگئے۔ باڑے سے نکلنے کے بعد یہودیوں کو اپنے مقصدِ عظمیٰ حاصل کرنے میں کوئی بڑی رکاوٹ نہ رہی۔

رومن کیتھولک عیسائی

اگرچہ یہی فرقہ یہودیوں کا سب سے بڑا دشمن گردانا جاتا ہے لیکن اس فرقے اور عام عیسائیوں میں دوری اور یورپ میں یہودیوں کو سیاسی اقدامات کی بناء پر آزادی کے حصول نے انھیں بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنے موقف میں تبدیلی لائیں۔ تاہم مؤقف صرف تبدیل نہ ہوا بلکہ یکسر الٹ گیا۔ اس میں سب سے بڑا کردار گزشتہ پاپائے روم 'جان پال دوم' (John Paul II) نے ادا کیا۔ اس نے یہودی نسل سے نفرت کرنے کو خدا سے نفرت کرنے کے مترادف ٹھہرایا اور انھیں ایمان میں اپنا بڑا بھائی قرار دیا۔ ۱۹۹۳ء میں اس نے کلیسائے روم کے تمام تر تحفظات کے باوجود اسے مجبور کیا کہ وہ ریاستِ اسرائیل کو تسلیم کرے، اور بعد میں خود بھی اسرائیل گیا جہاں اس نے یہودیوں کی مقدس 'دیوارِ گریہ' کے نیچے جا کر یہودیوں کے لیے مغفرت کی دعا کی اور ایک تحریری مغفرت نامہ دیوار کی دراڑ میں بھی رکھا۔ یہ دیوار مسجدِ اقصیٰ کے مغربی جانب ہے جہاں یہودی آکر عبادت کرتے اور تورات کی تلاوت کرتے ہیں اور جہاں ان کا خیال ہے کہ ہیکلِ سلیمانی تھا اور دوبارہ بنے گا۔

اس طرح یہودیوں کو عیسائیت میں اپنے ہمنوا مل گئے اور وہ کم و بیش تمام عیسائیوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ کم از کم اس مرحلے میں فلسطین پر حکومت کا حق ان کا ہے، یہاں تک کہ عیسائی یہودیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف غیر اعلانیہ اتحاد میں بھی شامل ہو گئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح یہودیوں نے عیسائیت میں تفریق پیدا کی، اسی طرح کے حربے اب نئی شکل میں وہ مسلمانوں کے خلاف بھی استعمال کر رہے ہیں۔

انقلابِ فرانس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تین خلاء اور ہیومن کا ارادۂ کل (جدید شرک)

تاریخِ مغرب کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ تحریکِ تنویریت نے پورے یورپ پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان اللہ کا بندہ نہیں ہے بلکہ اپنی خواہش اور ارادے سے زندگی گزارنے والا 'ہیومن' ہے۔ اسے مذہب کی تاریک سوچ سے نکل کر ایک 'روشن خیال' سوچ کو اپنانا چاہیے۔ 'روشن خیال' سوچ نے انسان کو یہ باور کرایا کہ اسے امن و خوشحالی چاہیے اور اس امن و خوشحالی کے لیے اسے مادی ترقی کرنی ہے اور اس مادی ترقی کی راہ میں مذہب کی حرام و حلال کی قید ہے جسے ختم کرنا ہے۔ پھر بادشاہ بھی اس کی راہ میں رکاوٹ ہے جس سے

اسے آزادی چاہیے اور یہ آزادی مرد اور عورت میں برابری اور مساوات کی بنیاد پر ہو گی۔ یہ روشن خیالی مغرب میں غالب آگئی اور انقلابِ فرانس آ گیا۔

انقلابِ فرانس کے ضمن میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس کے نتیجے میں معاشرے میں تین خلاء پیدا ہوئے۔ ایک طرف کلیساء تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے دنیا بھر کے لیے نمائندہ ہے اور جس نے یورپ کے بادشاہوں کو عیسائیت اپنانے پر 'ظل اللہ' قرار دیا تھا، اس کلیساء کے اختیارات ختم ہو جانے سے اچانک حاکمیتِ اعلیٰ کا منصب خالی ہو گیا۔ دوسری طرف قدیم زمانے سے قائم شاہی نظام کے منہدم ہو جانے سے سیاسی نظام میں خلاء پیدا ہوا۔ اور تیسری طرف معاشرے میں دین ختم ہو جانے سے اخلاقی اور معاشرتی اقدار میں خلاء پیدا ہو گیا۔ ان خلاؤں کو کیسے پُر کیا گیا؟ اس کے لیے 'دینِ لادینیت' نے انسان کو 'دینِ جمہوریت' اور 'دینِ سرمایہ دارانہ معیشت' عطا کیا جس کی تفصیل حصہ دوم میں آئے گی ان شاء اللہ۔

حصہ دوم

نیو ورلڈ آرڈر

انقلابِ فرانس کے بعد یورپ بظاہر تبدیل ہو گیا، تاہم کوئی معمولی سی عقل رکھنے والا انسان بھی یورپ کے پسِ منظر میں یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ 'نیو ورلڈ آرڈر' انسان کے بنائے ہوئے ایک دین سے انسان ہی کے بنائے ہو دوسرے دین کی طرف جانے کا نام تھا، یعنی 'عیسائیت' سے 'دینِ انسانی' (سیکولرزم) کی طرف۔ عیسائیت بھی 'سینٹ پال' کا بنایا ہوا دین تھا جس کا سیاسی نظام 'سینٹ آگسٹین' کے نظریہ 'خدا کی حکومت اور انسان کی حکومت' کے مطابق ایک ہزار سال سے چل رہا تھا۔ اب یورپ کی سیاسی اور مذہبی گاڑی کے ڈرائیور تبدیل ہو گئے تھے۔ اب رومن کیتھولک عیسائیوں اور بادشاہوں کی جگہ پروٹیسٹنٹ عیسائی، یہودی اور لادین عیسائی یورپ پر قابض ہو گئے تھے۔ ۱۶۸۸ء میں انگلستان پہلے ہی پروٹیسٹنٹ بن چکا تھا۔ ۱۷۷۶ء میں انقلابِ امریکہ کے بعد امریکہ میں پروٹیسٹنٹ، یہودی اور لادین عیسائی غالب آ گئے۔ انقلابِ فرانس کے نتیجے میں آخری با اثر ملک نے بھی رومن کیتھولک کلیساء اور بادشاہ سے جان چھڑا لی۔ پروٹیسٹنٹ فکر نہ ہی بادشاہ کا خدائی اختیار مانتی تھی اور نہ ہی دنیوی کام کو مادی کام سمجھ کر اس کے کرنے سے منع کرتی تھی۔ پروٹیسٹنٹ فکر یہودیت، لادینیت اور عیسائیت کے درمیان ایک پل کا کام دے رہی تھی۔ اس پل نے 'نیو ورلڈ آرڈر'[34] کی تشکیل میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا۔

جیسا کہ ہم پہلے باب کے آغاز میں عرض کر چکے ہیں کہ اعمال کی بنیاد پر دنیا میں دو طرح کے انسان ہیں؛ ایک وہ جو اللہ سے اجر کی امید اور توقع رکھتے ہوئے عمل کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو اللہ سے اجر کی توقع کے بغیر عمل کرتے ہیں۔ پروٹیسٹنٹ فکر نے ان دونوں کو ایک ہی راہ پر چلا دیا۔ جو لوگ اللہ سے توقع کی بنیاد پر عمل نہیں کرتے تھے، وہ لادین اور مشرک طبقہ تھا۔ اس کے لیے لادین نظریات کو قبول کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس کے لیے

---

[34] یہاں ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ نیو ورلڈ آرڈر کی اصطلاح جو آج بہت عام ہو چکی ہے اور جسے بہت سے حضرات مختلف زاویوں سے بیان کرتے پھرتے ہیں، اس کا آغاز انقلابِ فرانس کے بعد ہو گیا تھا، اس نیو ورلڈ آرڈر نے پہلے مغرب کو اپنی لپیٹ میں لیا اور پھر خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد پوری دنیا پر غالب آ گیا، اور یہی آج ہمارے سروں پر جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام کی صورت میں مسلط ہے۔ اس نکتے کی وضاحت اس لیے ضروری ہے کیونکہ آج بعض حضرات خصوصاً وہ لوگ جو (حقیقت سے زائد) خفیہ سازشوں کے دلدادہ ہیں، نیو ورلڈ آرڈر کی اصطلاح تو استعمال کرتے ہیں لیکن اسے آئندہ آنے والی تبدیلی سمجھتے ہیں اور وہ کیا ہو گی، خود بھی اس کی وضاحت نہیں کر سکتے۔ یہ سب محض توہمات ہیں۔ حقیقت کی دنیا میں اہلِ مغرب نے نیو ورلڈ آرڈر رائج کر دیا ہے اور یہ عمل انقلابِ فرانس سے شروع ہو گیا تھا اور اس کی وضاحت ہم حصہ اول میں کر آئے ہیں۔

دنیوی ترقی ہی زندگی کا قابلِ قبول نصب العین تھا۔ مگر جو لوگ اللہ سے اجر کی توقع اور یقین رکھ کر عمل کرتے تھے... جیسے راسخ العقیدہ عیسائی... تو پروٹیسٹنٹ فکر نے ان کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا۔اب دنیوی کام نہ صرف عین دین کا حصہ بن گیا بلکہ دنیا میں ترقی کر کے مادی کامیابی حاصل کرنا زندگی کا اساسی مقصد ٹھہرااور دنیا کی دولت اور ثروت مل جانااللہ کی رضاء کی نشانی بن گئی۔(معاذ اللہ)

امتِ مسلمہ کے لیے کوئی چیز تبدیل نہ ہوئی تھی۔ ایک دشمن کی جگہ دوسرے دشمن نے لے لی تھی۔یہ سب پرانے شکاری تھے؛عیسائی، یہودی اور لادین مشرک، تاہم اس دفعہ یہ ایک نئے جال کے ساتھ آئے۔ اس نئے جال کے کئی نام ہیں؛اسے 'ہیومن ازم' بھی کہا جاتا ہے اور 'آزاد دنیا' (Free World) بھی کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ 'جمہوریت' اور 'سرمایہ دارانہ نظام' بھی اسی جال کے نام ہیں۔اس نظام کو چلانے کے لیے اصطلاحات بھی نئی استعمال کی گئیں۔ 'شرک' کو 'ہیومن ازم' یا 'دینِ انسانی' کہا گیا، 'سود' کو 'تجارت' کا نام دیا گیا، حرام اور حلال کو 'آزادئ گفتار' اور 'مفادات کے حصول میں سب جائز ہے' کے نظریے سے تبدیل کر دیا گیا، 'فحاشی اور عریانی' کو 'آرٹ' اور 'فن' قرار دیا گیا، 'جمہوریت' کو 'خلافت' کے مترادف ٹھہرایا گیا، مادہ پرستی اور خود غرضی کو 'ترقی' اور کامیابی گردانا گیا۔البتہ یہ نظام تھا وہی پرانا شرک، وہی سودی نظام، وہی فحاشی اور عریانی، وہی مادہ پرستی، وہی اللہ کی نافرمانی اور خواہشِ نفس کی پیروی جس نے صدیوں سے یورپ میں بسنے والے انسان کو جہالت کے اندھیروں اور اللہ سے بغاوت میں مبتلا رکھا تھا۔پہلے یہ رومن کیتھولک کلیساء اور پاپائے روم کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق چلتے تھے اور اب یہ ہیومن ازم کے بنائے ہوئے دین پر چل رہے تھے۔ اس نظام میں وہی عیسائی تھے، وہی یہودی، وہی لادین اور مشرک تھے جو صدیوں سے چلتے آرہے تھے۔ یہودی، عیسائی، لادین اور مشرکین سب پہلے بھی گمراہ رہے اور اس نظام کے آنے کے بعد بھی گمراہ رہے، لیکن سب سے بڑی بد قسمتی امتِ مسلمہ کی تھی جو ہدایت یافتہ ہونے اور اللہ کی کتاب کے موجود و محفوظ ہونے کے باوجود ان باطل اور گھٹیا نظریات سے متاثر ہو گئی۔ **'نیو ورلڈ آرڈر' کی کامیابی دراصل امتِ مسلمہ کے زوال کی کہانی ہے۔** جوں جوں 'نیو ورلڈ آرڈر' غالب آتا گیا، توں توں امتِ مسلمہ زوال پذیر ہوتی گئی، اور یہ 'نیو ورلڈ آرڈر' ایک دو دن میں غالب نہیں آیا بلکہ اس میں صدیاں بیتی ہیں۔کتاب کے حصہ دوم میں ہم اسی بات کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ کیسے غالب آیا اور امتِ مسلمہ کیسے زوال پذیر ہوئی؟

نیو ورلڈ آرڈر کی تشکیل

جب اللہ کی حکومت اور انسان کی حکومت کا رشتہ انقلابِ فرانس کے بعد ٹوٹ گیا تو یورپی انسان کی زندگی میں متعدد بڑے خلاء پیدا ہوئے۔

- جب انسان کی حکومت کے لیے اللہ تعالیٰ حاکمِ اعلیٰ نہیں ہے تو پھر اب حاکمِ اعلیٰ کون ہے؟
- اگر بادشاہ خدائی اختیار سے لوگوں پر حکومت نہیں کر رہا تو اب کون حکومت کر رہا ہے؟
- اللہ کی حکومت میں تو انسان اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے زندگی بسر کرتا تھا، جنت حاصل کرنا چاہتا تھا اور دوزخ سے بچنا چاہتا تھا، اب جبکہ اللہ کی حکومت نہیں رہی تو انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہو گا؟

ان سوالات کے جوابات ہی 'نیو ورلڈ آرڈر' کی تشکیل ہیں اور اس کی فکری بنیادیں ہیں۔ آج کا 'نیو ورلڈ آرڈر' تحریکِ تنویریت کی پیداوار ہے۔ یہ ایک مکمل اور علیحدہ دین ہے۔ اس نظام نے حاکمیتِ اعلیٰ اور بادشاہ کے اختیارات کے خلاء کو پر کرنے کے لیے 'جمہوریت' کا نظریہ پیش کیا۔ دوسری طرف انسان کے مقصدِ زندگی کا خلاء پر کرنے کے لیے اس نے 'سرمایہ دارانہ نظام' پیش کیا جس میں انسان خدا کی رضا کے حصول کی بجائے مسلسل مادی ترقی کر سکے۔ تیسری طرف اس نظام نے شاہی فوجوں کے عسکری نظریات میں تبدیلیاں کیں اور ان کی تنظیمِ نو کر کے قومی فوجیں بنا دیں۔ یہ تمام نظریات اور نظام، یورپ میں انقلابِ فرانس کے بعد ایک دو دن میں نہیں بنے بلکہ ان کی تشکیل میں کئی دہائیاں صرف ہوئیں اور کئی انقلابات آئے۔ اس لیے 'نیو ورلڈ آرڈر' کو ہم چار بڑے ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

- نیو ورلڈ آرڈر کا پہلا دور: انقلابِ فرانس سے جنگِ عظیم اول تک
- نیو ورلڈ آرڈر کا دوسرا دور: جنگِ عظیم اول کے اختتام سے جنگِ عظیم دوم کے اختتام تک
- نیو ورلڈ آرڈر کا تیسرا دور: روس اور امریکہ کی سرد جنگ
- نیو ورلڈ آرڈر کا چوتھا دور: خلیج کی پہلی جنگ سے تا حال

پہلا دور: انقلابِ فرانس سے جنگِ عظیم اول تک (۱۷۸۹ء تا ۱۹۲۳ء)

نیو ورلڈ آرڈر کے پہلے دور کو مغرب کے مؤرخین 'آزاد دنیا کی بادشاہتوں کے ساتھ جنگ' کے دور سے تعبیر کرتے ہیں اور مسلمان مؤرخین اس دور کو 'امتِ مسلمہ کے زوال کے آغاز' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک طرف انقلابِ فرانس کی وجہ سے یورپ کی تمام بادشاہتوں کو اپنی اپنی سلطنتوں کی فکر پڑ گئی جن میں ہالینڈ، آسٹریا، ہنگری، جرمنی، روس اور اٹلی وغیرہ شامل ہیں۔ ان ممالک نے اس انقلاب کے اثرات کو روکنے اور فرانس کے بادشاہ کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسری طرف امریکہ کی دریافت اور ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ سے یورپ میں خام مال کی ترسیل بہت بڑھ گئی۔ اس خام مال کی بہتات نے یورپ میں اور خاص طور پر برطانیہ میں صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے ان شاءاللہ۔ اس 'صنعتی انقلاب' نے یورپ میں نئی منڈیوں کی تلاش کی خواہش کو دوچند کر دیا۔ اب ہر ملک امتِ مسلمہ پر قبضہ کر کے نہ صرف اس کے وسائل کو لوٹنے کی دوڑ میں شامل ہو رہا تھا، بلکہ ایک دوسرے کو اس کے مقبوضات سے محروم کرنے کی کوشش میں یہ ممالک آپس میں بھی لڑ رہے تھے۔

اُدھر سلطنتِ عثمانیہ پر جمود کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ یورپی ممالک اور روس نے اس کمزوری کو تاڑ لیا۔ اس لیے وہ ہر وقت سلطنتِ عثمانیہ کے مقبوضات پر نظر لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ روس کی نظر وسطی ایشیا، قوقاف اور بلقان کی ریاستوں پر تھی جبکہ برطانیہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر سے ہندوستان کے راستے پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ فرانس کی للچائی نگاہ الجزائر اور تیونس سمیت سلطنتِ عثمانیہ کے مغربی اور شمالی افریقہ کے ممالک پر جمی ہوئی تھی۔ ان تمام ممالک نے جمود کا شکار سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف سازشوں کا ایک جال بنانا شروع کر دیا۔ ایک سو سال کی مختلف سازشوں اور جنگوں کی شکل میں یہ ممالک ایک ایک کر کے امتِ مسلمہ کے مختلف علاقوں پر قبضہ کرتے چلے گئے۔ آخر کار یہ سلسلہ جنگِ عظیم اول کے نتیجے میں سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط اور امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھرنے پر ختم ہوا۔ ان جنگوں اور سازشوں کو مغربی مؤرخ 'گریٹ گیم' (Great Game) یا 'عظیم کھیل' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ برطانیہ نے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنایا اور ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان کے اس قبضے سے اسے وہ مادی وسائل اور افرادی قوت میسر آ گئی جو سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کر کے برطانیہ کو ایک سپر طاقت بنانے میں مدد دے سکتی تھی۔

انیسویں صدی عیسوی کو یہودیوں کے عروج کی صدی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انقلابِ فرانس کے بعد جس جس ملک میں بھی آئینی حکومت بنتی گئی، وہاں یہودیوں کو یورپ میں برابر کے حقوق ملتے گئے۔ برابری

کے ان حقوق کے ساتھ ہی یہودیوں نے 'صہیونی تحریک' کی بنیاد رکھی جو ریاستِ اسرائیل کے قیام میں مددگار ثابت ہوئی۔ لہٰذا ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے پروٹیسٹنٹ عیسائیوں نے یہودیوں کو فلسطین فتح کر کے دیا۔ اسی صدی میں یہودی یورپ میں بینکوں کے بے تاج بادشاہ بن گئے اور یہ قوم یورپ کی اقتصادیات پر مکمل غالب آ گئی۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ انقلابِ فرانس سے یورپ کے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔اس دور کو 'نیو ورلڈ آرڈر' کا آغاز کہنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے عروج اور امتِ مسلمہ کے زوال کا آغاز بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ سب ایک ہی دور میں ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہاں ہم انقلابِ فرانس اور جنگِ عظیم اول کے درمیانی ایک سو تیس سالہ دور کو دو حصوں میں بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔پہلے حصے میں اس انقلاب سے یورپ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور دوسرے حصے میں اسی دور میں یورپ کی داخلی تبدیلیوں کے زیرِ اثر بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں ...یعنی گریٹ گیم... پر بات کریں گے۔

یورپ میں انقلابات کا دور (۱۷۸۹ء تا ۱۸۷۵ء)

۱۷۸۹ء میں ایک طرف تو انقلابِ فرانس کی شکل میں یورپ میں بڑی تبدیلیاں نمودار ہونا شروع ہوئیں تو دوسری طرف ہندوستان میں ۱۷۶۴ء کی 'جنگِ بکسر' کے بعد برطانیہ بنگال پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان دو تبدیلیوں کے اثرات سے یورپ میں تین طرح کے انقلابات نمودار ہوئے۔ ایک سیاسی انقلاب، دوسرا صنعتی انقلاب جسے 'سرمایہ داری کا انقلاب' بھی کہہ سکتے ہیں اور تیسرا 'عسکری انقلاب'۔ ان انقلابات نے سب سے پہلے یورپ کی مکمل تنظیمِ نو کی اور پھر جوں جوں یورپی قوتیں اسلامی دنیا پر قبضہ کرتی گئیں، ان انقلابات کے اثرات اسلامی دنیا میں بھی پھیلتے چلے گئے۔

یورپ میں سیاسی انقلابات

انقلابِ فرانس کے نتیجے میں خود فرانس اندرونی اور بیرونی انتشار کا شکار ہو گیا۔انقلابی لوگ فرانس میں آئینی حکومت بنا کر پارلیمنٹ بنانا چاہتے تھے جبکہ بادشاہ اپنا قدیم اختیار برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ انقلاب کا زور دیکھ کر ابتداءً فرانس کا بادشاہ 'لوئی شانزدہم' (Louis XVI) آئین کے تحت اپنے اختیارات محدود کرنے پر تیار ہو گیا، مگر اندر ہی اندر وہ یورپ کی دوسری بادشاہتوں کے ساتھ مل کر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بیوی 'ملکہ فرانس' آسٹریا کے بادشاہ 'فریڈرک' کی بہن تھی۔ فریڈرک اپنے بہنوئی کی مدد کے لیے

تیار تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کے دوسرے حکمران بھی اس انقلاب کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے۔ اس انقلاب کی کامیابی سے ان کی اپنی حکومتوں کو خطرہ تھا، اس لیے اس انقلاب کا تدارک ان کی نظر میں ضروری تھا۔ اس سب کے باوجود انقلابِ فرانس کے اثرات بتدریج پورے یورپ میں پھیلنے لگے اور یورپی عوام جدید نظریات کو قبول کرنے لگے۔ نتیجتاً ہالینڈ، جرمنی، بیلجیم اور آسٹریا میں حقوقِ انسانی کی جنگیں شروع ہو گئیں۔ اس خطرناک صورتحال کے پیشِ نظر آسٹریا اور جرمنی نے فرانس پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگیں تاریخ میں 'انقلابی جنگوں' (French Revolutionary Wars) کے نام سے مشہور ہوئیں اور انھی میں فرانس کے جنرل 'نپولین بوناپارٹ' کو شہرت حاصل ہوئی۔ ان جنگوں میں فرانس فاتح کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا اور 'نپولین بوناپارٹ' کی قیادت میں فرانس نے تقریباً تمام یورپ پر قبضہ کر لیا۔ نپولین کی ان فتوحات سے انقلابِ فرانس سے پیدا ہونے والے جدید نظریات یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی پھیل گئے۔

اس دور میں فرانس کا سب سے اہم دشمن انگلستان تھا۔ نپولین نے انگلستان کو شکست دینے کے لیے ۱۷۹۸ء میں مصر پر حملہ کر دیا۔ مصر ان دنوں سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ تسلط تھا۔ مصر پر فرانس کے قبضے سے برطانیہ کے ہندوستان کے مقبوضات خطرے میں پڑ گئے۔ یہ بات برطانیہ کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔ چنانچہ برطانوی امیر البحر 'نیلسن' (Admiral Horatio Nelson) کی قیادت میں برطانیہ کے ہاتھوں فرانسیسی بحری بیڑے کو شکست ہوئی، مجبور ہو کر نپولین کو فرانس واپس آنا پڑا۔

مصر سے واپس آکر نپولین نے برطانیہ کی ناکہ بندی شروع کر دی اور برطانیہ کی مصنوعات کو پورے یورپی براعظم میں بند کر دیا۔ اس ناکہ بندی کو 'براعظمی نظام' (Continental System) کہا جاتا ہے۔ اس ناکہ بندی میں پرتگال نے فرانس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ نے اپنے جنرل 'لارڈ ولنگٹن' (Lord Wellington) کی قیادت میں اپنی فوج سپین میں اتار دی۔ اس طرح نپولین اور برطانیہ کی فوجوں کا سپین میں آمنا سامنا ہوا۔ روس پہلے فرانس کے ساتھ تھا مگر بعد میں وہ اس اتحاد سے نکل گیا جس کی وجہ سے نپولین نے روس پر حملہ کر دیا۔ یہ نپولین کے زوال کا آغاز تھا۔ روس کے موسم نے نپولین کی فوج کو شکست دے دی۔ اس کی تقریباً ۵۰۰۰۰۰ فوج مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ دوسری طرف برطانوی جنرل ولنگٹن اور نپولین کی فوجوں میں جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۶ سے ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کو بیلجیم کے نزدیک 'واٹرلو' (Waterloo) کے مقام پر برطانیہ کے جنرل ولنگٹن نے نپولین کی فوجوں کو شکست دی اور نپولین کو گرفتار

کر کے 'جزیرہ سینٹ ہیلینا' (Island of Saint Helena) میں جلاوطن کر دیا، جہاں وہ ۱۸۲۱ء میں مر گیا۔

۱۸۳۰ء میں بیلجیم میں انقلاب آیا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں بیلجیم ہالینڈ سے علیحدہ ایک آزاد آئینی ملک بن گیا۔ ۱۸۴۸ء میں فرانس، جرمنی، اٹلی، بوہیمیا، ہنگری اور آسٹریا میں آئینی حکومتیں بننا شروع ہو گئیں۔ ۱۸۷۱ء میں وسطی یورپ میں ایک اور انقلاب آیا جس نے آج کے جدید یورپ کی شکل کو مکمل کیا۔ یہی سیاسی انقلابات کا دور مستقبل کی جنگِ عظیم کا پیش خیمہ بنا۔

یورپ کا جمہوری آئینی نظام

انقلابِ فرانس کے بعد پاپائیت اور شہنشاہیت کے خاتمے سے حاکمیتِ اعلیٰ اور ظل اللہ کا تصور ختم ہوتے ہی اجتماعی نظام میں ایک خلاء پیدا ہو گیا۔ اس خلاء کو پر کرنے کے لیے ایسے نظام کی ضرورت تھی جو اس وقت حقوقِ انسانی کی جنگ میں 'ہیومن' کے قرار دیے گئے مقاصد امن، خوشحالی، ترقی، آزادی اور مساوات کو پورا کرے۔ پھر دوسری جانب قرونِ وسطیٰ میں 'رومن ایمپائر' کے ممالک کی باہمی تیس سالہ جنگ اور اس کے نتیجے میں ہونے والے 'ویسٹ فیلیا' کے معاہدے سے یورپی اقوام میں اپنے علاقوں کی تقسیم اور قومی عصبیت نے جڑ پکڑ لی۔ اس معاہدے کا اثر یہ ہوا کہ پورے یورپ میں وطنیت ایک عقیدے کے طور پر معروف ہو گئی۔ ویسٹ فیلیا کے اس معاہدے کی وجہ سے یورپ میں 'جدید وطنی ریاستوں' (Nation States) کے تصور نے جنم لیا۔ ان جدید وطنی ریاستوں کی تشکیل میں چار عناصر کو بنیادی قرار دیا گیا۔ ایک وہ علاقہ جہاں اس ریاست کو کام کرنے کا اختیار ہو، دوسرا عنصر وہ عوام جو اس ریاست کو تسلیم کریں، تیسرا عنصر وہ حکومت جو ریاست کو چلائے اور چوتھا عنصر حاکمیتِ اعلیٰ جو ریاست کو علاقے اور باشندوں پر اقتدار بخشے۔ یورپ کی تاریخ میں ویسٹ فیلیا کے معاہدے نے مذکورہ بالا عناصر میں سے علاقہ یعنی جغرافیائی سرحدوں اور عوام کا تعین تو کر دیا، لیکن حکومت کی تشکیل اور حاکمیت کا تصور ایسے سوال تھے جن کا جواب آسان نہ تھا۔ خاص طور پر وہ حاکمیتِ اعلیٰ جو انقلابِ فرانس سے پہلے تک پاپائیت کے ناطے خدا کو حاصل تھی۔ اس کے جواب کے لیے ایسا پیچیدہ فلسفہ اختیار کیا گیا جسے واضح کرنے والے روزِ اول سے اس کی پیچیدگی کا اظہار کرتے چلے آ رہے ہیں اور یہ فلسفہ مشکل سے سمجھ میں آنے کے باوجود بھی پورا سمجھ نہیں آتا۔ اسی لیے ہم اسے نظامِ دجل و فریب قرار دیتے ہیں اور یہی فلسفہ ہماری نظر میں امتِ مسلمہ کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔

بہر حال یورپ کو حاکمیت کا ایسا تصور درکار تھا جو رومن کیتھولک عیسائیوں کے نظریہ 'اللہ کی حکومت' کا مترادف ثابت ہو اور 'ہیومن' کے ان بنیادی مقاصد کی حفاظت بھی کرے جنھیں دورِ عقلیت کے مفکرین نے حقوقِ انسانی کی جنگ میں مقدس ترین اصولوں کے طور پر متعارف کروایا، یعنی امن، خوشحالی، ترقی، مساوات اور آزادی۔ ان کا یہ مسئلہ تحریکِ تنویریت کے فلسفیوں 'جان لاک' اور 'روسو' نے پہلے ہی حل کر دیا تھا، اور 'جان لاک' کی نسبت انقلابِ فرانس میں 'روسو' کے بیان کردہ فلسفہءِ جمہوریت نے زیادہ اثرات مرتب کیے۔ اس لیے یہاں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ روسو کے اس فلسفے کو اختصار سے بیان کر دیں جو آج کی جدید جمہوریت کی بنیاد ہے۔

روسو کے نظریے کی روشنی میں یورپ نے جو تصورِ حاکمیت اپنایا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنیادی مقاصد اور اصولوں (امن، خوشحالی، ترقی، آزادی، مساوات) کے اظہار نے انقلابِ فرانس کے بعد تمام ہیومنز کا مشترکہ ارادہ تشکیل دیا جسے 'ارادۂ کل' کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر تمام ہیومنز نے ان اصولوں کو اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور جب کوئی ریاست اپنے آئین میں ان اصولوں کو اپناتے ہوئے 'ارادۂ کل' کا اظہار کرے تو وہ ریاست بذاتِ خود حاکمیتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو جاتی ہے۔

اس کی مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں 'روسو' کا نظریہ پیش کرتے ہیں جو اس تصور کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

جمہوری ریاست کا فلسفہ

جمہوریت کا سب سے بڑا کارنامہ جمہوری ریاست کی تخلیق ہے اور اس کی بنیاد جمہوریت کے نبی سمجھے جانے والے 'روسو' کا فلسفہ ہے۔ 'روسو' اٹھارویں صدی عیسوی میں سویزرلینڈ میں پیدا ہوا اور انقلابِ فرانس سے چند سال پہلے فرانس میں مر گیا۔ اس کی کتاب 'معاہدۂ عمرانی' (Social Contract) نے تحریکِ تنویریت میں ایک نئی جدت پیدا کر دی تھی۔ اس کتاب میں 'روسو' نے جدید جمہوریت کا مکمل نقشہ پیش کیا۔ اس کتاب کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا مگر وہ ہر جگہ زنجیروں میں قید ہے۔ 'روسو' نے انسان کو ایک مکمل آزاد اور خود مختار شخصیت کے طور پر پیش کیا۔ اس نے کہا کہ انسان کا ارادہ آزادی، خود مختاری، مساوات سے رہنا اور زندگی میں خوشحالی حاصل کرنے کے لیے ترقی کرنا ہے۔ یہ تمام انسانوں کی خواہش ہے۔ اس کو 'روسو' نے 'ارادۂ کل' (Will of All) کا نام دیا۔ البتہ اس 'ارادۂ کل' کے علاوہ بھی ہر انسان کے اپنے اپنے انفرادی ارادے ہیں جن کو 'روسو' نے 'ارادۂ عمومی' (General Will) کا نام

دیا۔ ’ارادۂ کل‘ اور ’ارادۂ عمومی‘ کے درمیان توازن قائم کرنے کے لیے ’روسو‘ نے ایک جامع نقشہ دیا جسے آج کی ’جدید جمہوریت‘ کہا جاتا ہے۔

روسو کے فلسفے کے مطابق انسان کسی زمانے میں حسین فطری زندگی گزار رہا تھا جس میں وہ باہمی امداد وتعاون اور صلہ رحمی کے اصولوں پر کاربند تھا۔ اس معاشرے میں انسان خوشحال، پرامن اور آزاد زندگی گزار رہا تھا۔ مگر مختلف علاقوں میں آباد ہونے سے انسانوں کے درمیان ملکیتِ زمین کا مسئلہ پیدا ہوا جس سے ان کے درمیان تنازعات پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ ان تنازعات سے نکلنے اور باہمی بقا کی خاطر انسان ایک دوسرے کے ساتھ معاہدات کرنے لگا۔ پھر جیسے جیسے انسانی آبادی بڑھتی گئی، اسی تناسب سے معاہدات کی متعلقہ اطراف زیادہ ہوگئیں جس سے دوبارہ تنازعات پیدا ہونے کا خدشہ ابھرا۔ چنانچہ انسانوں نے ضرورت محسوس کی کہ آپس میں کیے گئے باہمی معاہدوں کو کسی اجتماعی نظم کے سپرد کیا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان آزادی اور مساوات کو قائم رکھے۔ تاہم اجتماعی نظم قائم کرنے کے لیے لازمی تھا کہ اسے حاکمیت اور اقتدار کا ایسا حق حاصل ہو جسے تمام انسان تسلیم کریں۔ یہاں سے حاکمیتِ اعلیٰ طے کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

روسو کے مطابق انسان کو ایسی حاکمیت درکار تھی جو تمام انسانوں کے امن، خوشحالی، مساوات، ترقی اور آزادی کے اصولوں کی پاسداری کرے۔ ان اصولوں کے مطابق اجتماعی زندگی گزارنا تمام انسانوں کا ارادہ بن گیا جسے ’روسو‘ ’ارادۂ کل‘ اور ’حقیقی ارادہ‘ (Real Will) کا نام دیتا ہے۔ پھر اس ارادے کے اظہار کا تقاضا یہ تھا کہ انسانوں میں سے ہر فرد اپنے ذاتی ارادے کو اس اصل ’ارادۂ کل‘ کے تابع کردے۔ ان ذاتی ارادوں کے مجموعے کو روسو (General Will) کا نام دیتا ہے یعنی ’ارادۂ عمومی‘۔ گویا ’ارادۂ عمومی‘ کو ’ارادۂ کل‘ کے تابع کرنا درکار تھا۔ ’ارادۂ عمومی‘ کو ’ارادۂ کل‘ کے سپرد کرنے کے لیے پہلے قدم پر انسان حقِ انتخاب کے ذریعے اپنے نمائندے منتخب کرتا ہے۔ اس انتخاب سے ’ارادۂ عمومی‘ عوام سے ان کے نمائندوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ نمائندے ایک مجلس تشکیل دیتے ہیں جسے ’پارلیمنٹ‘ کا نام دیا گیا۔ پھر ’پارلیمنٹ‘ ایسا آئین مرتب کرتی ہے جو ’ارادۂ کل‘ کے مطابق ہو۔ گویا ’ارادۂ کل‘ کا اظہار ’آئین‘ سے ہوتا ہے اور ’ارادۂ عمومی‘ کا اظہار ’پارلیمنٹ‘ سے۔ پھر جب پارلیمنٹ آئین کی توثیق کردیتی ہے تو گویا ’ارادۂ عمومی‘ نے ’ارادۂ کل‘ کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا۔

’ارادۂ عمومی‘ جب ’ارادۂ کل‘ کے تابع ہوکر اس سے متحد ہو جاتا ہے تو اجتماعی نظم یعنی ریاست کو حاکمیتِ اعلیٰ کا حق مل جاتا ہے، ایسی حاکمیت جسے تمام افراد نے انتخاب کے عمل سے تسلیم کرلیا تھا۔ حاکمیتِ اعلیٰ قائم ہونے کے بعد عوام کے لیے آئین کی پاسداری اس لیے لازم ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اسے خود ہی تشکیل دے کر تسلیم

کیا ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کے لیے آئین کی اطاعت دراصل خود اپنے آپ کی ہی اطاعت کرنا ہے اور اس کی نافرمانی دراصل اپنی ہی نافرمانی ہے۔ گویا انسان اس طرح کسی اور شے کا غلام نہیں بنتا بلکہ الٹا اسے حقیقی آزادی مل جاتی ہے کیونکہ درحقیقت وہ اپنی ہی بات مان رہا ہوتا ہے اور اپنے ہی ارادوں کی تکمیل کر رہا ہوتا ہے۔ ایسی حاکمیتِ اعلیٰ تسلیم کرنا ہی انسان کو روشن خیالی، ترقی، آزادی، خودمختاری اور مساوات کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ ہے وہ فارمولا جس نے حاکمیتِ اعلیٰ کو (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی طرف منتقل کر دیا۔ یوں جمہوریت کے طفیل جدید وطنی ریاستوں میں اب اللہ کی بجائے انسان کی حاکمیت قائم ہوگئی۔ گویا انسان خود اپنا خدا بن گیا۔[35]

یہی وجہ ہے کہ روسو کی نظر میں دین کی بنیاد پر یا شاہی نظام پر قائم معاشرے یکسر غلط اور ظالم معاشرے تھے جن میں ہیومنز کے بیان کردہ اصولوں کی پامالی ہوتی رہی۔ گویا اس طرح یورپ میں پاپائیت اور شہنشاہیت پر تو سرخ قلم پھر ہی جاتا ہے مگر اس سے بڑھ کر بلا استثناء تمام انبیاء علیہم السلام کی متفقہ دعوت (نعوذ باللہ) باطل ٹھہرتی ہے اور تمام اسلامی خلافتیں (نعوذ باللہ) تاریخ کے تاریک ترین ادوار میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

'روسو' کے نظریات بیان کرنے کے بعد ہم قارئین کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کراتے ہیں کہ 'روسو' کے فلسفے میں 'ارسطو' کے فلسفے کی طرح مثالی معاشرے کا ذکر ہے جس کا حصول ان کے زعم میں انسان کا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ 'روسو' کے مطابق انسانیت کی ابتداء میں کہیں ایسا مثالی معاشرہ وجود میں آیا تھا جہاں سے موجودہ جمہوری ریاست کے نظریے کا آغاز ہوتا ہے، لیکن جدید مغربی مفکرین، مؤرخین اور جغرافیہ کے ماہرین اس مثالی معاشرے اور ریاست کا بہت کھوج لگانے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ انسانی تاریخ میں ایسے معاشرے یا ریاست کے وجود پر کوئی شواہد نہیں ملتے۔ گویا ان کا بیان کردہ یہ مثالی معاشرہ اور ریاست 'خیالی و افسانوی معاشرہ اور ریاست' تھی اور رہے۔ ان کھوکھلی بنیادوں کے باوجود مغرب نے ان نظریات پر ریاستوں کا پورا محل تعمیر کر لیا۔ لامحالہ ایسی کچی عمارت کو قائم رکھنے کے لیے انھیں جھوٹ و فریب کے ساتھ ساتھ ایسی قوت کی بھی

---

[35] یہی وہ نظریہ ہے جس کی کوکھ سے نظامِ جمہوریت نے جنم لیا۔ آج دنیا بھر میں، بشمول اسلامی ممالک میں رائج نظامِ جمہوریت اسی قبیح فلسفے کی بنیاد پر چل رہا ہے جس کے بانی دین سے عاری جاہل لوگ تھے۔ ہم پر تو رب تعالیٰ کا بے شمار احسان ہے کہ اس نے ہمیں ایسی جامع ہدایات عطا فرمائیں جس کے بعد ہمیں انسانوں کے تخلیق کردہ نظریات کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاہم افسوس کا مقام ہے کہ آج اپنے معاشروں میں اپنے ہی لوگ اس بات کا ادراک کرنے کو تیار نہیں اور مغرب کے مسلط کردہ اس نظامِ جمہوریت سے مطمئن بیٹھے ہیں۔ (م ح)

ضرورت تھی جو اس کھو کھلے نظام جمہوریت کو تحفظ فراہم کرے۔ اس قوت کا ذکر ہم آگے چل کر 'جدید عسکریت' کے تحت کریں گے۔

جمہوری ریاستوں کا قیام

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ 'ارادۂ کل' اور 'ارادۂ عمومی' سے مل کر بننے والی حاکمیتِ اعلیٰ کے حصول سے ریاست کا چوتھا اہم رکن پورا ہو گیا۔ چنانچہ انقلابِ فرانس کے بعد سابقہ شاہی ریاستیں آئینی اور جمہوری ریاستوں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئیں۔ انتخابات کے ذریعے پارلیمانوں کی تشکیل ہوئی۔ ان پارلیمانوں نے ایسے دساتیر اور آئین کی توثیق کی جو 'ارادۂ کل' کا اظہار کرتے تھے۔ گویا حاکمیتِ اعلیٰ کے اس فارمولے سے جمہوری ریاستوں نے جنم لیا جس میں ریاست کے باشندوں نے ریاست کے سامنے سر ٹیک دیا اور اس سجدے کو ہی انھوں نے انسان کی حقیقی آزادی تصور کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی مفکرین نے خدا کا لفظ استعمال کیے بغیر جمہوری دستوری ریاست کی اس قدر تقدیس و تعظیم بیان کی اور عملاً قائم کی کہ گویا فی الحقیقت وہ خدا ہی ہو۔

چونکہ حاکمیت زندہ ہستی کا وصف ہے، لہٰذا ریاست کو حاکمیت سپرد کرنے کا منطقی نتیجہ تھا کہ اسے 'قانونی شخصیت' (Legal Personality) قرار دیا جائے۔ دیگر مشرکین تو زندہ یا حقیقی بتوں کی پوجا کرتے ہیں مگر ان جدید مشرکین نے تو انسانی ذہن کی تخلیق کردہ اور حقیقت میں نہ پائے جانی والی ریاست میں حاکمیت کی روح پھونک کر اس کی پوجا شروع کر دی، اور وہ بھی خدا کا ولی یا مقرب جانتے ہوئے نہیں بلکہ خود خدا جانتے ہوئے۔ مزید یہ کہ ایسی ریاست کو ارسطو، روسو، ہیگل اور دیگر مغربی مفکرین خدا کی طرح 'معصوم عن الخطاء' بھی قرار دیتے ہیں، یعنی ان کی نظر میں ریاست غلطی سے پاک ہے، وہ غلطی کر ہی نہیں سکتی۔ گویا ریاست انسان کی طرح ایک ہستی ہے مگر فرضی اور سب سے اعلیٰ ہے۔ ریاست کے خدوخال ظاہر کرنے کے لیے مفکرین اسے جسم سے تشبیہ دیتے ہیں جس کا سر، دماغ اور ہاتھ پاؤں ہوں۔ پھر تمام اشخاص کی طرح اس شخص کے بھی حقوق اور فرائض مقرر کیے گئے۔ فرض سے مراد ریاست کا بنیادی طور پر عوام کو حاکمیتِ اعلیٰ عطا کرنا ہے جس کی حفاظت اور تشریح کی حق دار بھی ریاست خود ہے اور اس کے بدلے عوام کو اب اس ریاست کے حقوق ادا کرنے ہیں۔ اگر وہ حقوق ادا کریں گے تو انہیں ریاست کا معزز شہری (غلام) تصور کیا جائے گا اور اگر وہ ان کی پامالی کریں گے تو وہ ریاست کے مجرم قرار پائیں گے جن کے لیے ریاست سخت ترین سزائیں تجویز کرتی ہے۔ مثلاً ریاستِ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایسے مجرموں کی سزا 'موت' ہے۔

سوال یہ ہے کہ حاکمیتِ اعلیٰ کے اس فارمولے کو اپنا کر انسان نے ریاست کی فرضی ہستی کی غلامی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال کر آخر کس سے آزادی حاصل کی؟؟اس کا جواب قارئین کی سمجھ میں از خود آگیا ہو گا کہ انسان نے اس طرح اللہ سے، انبیاء کی اطاعت سے، دین سے، حرام اور حلال کے معیار سے، گناہ اور ثواب کے عقیدے سے آزادی حاصل کی۔ حاکمیتِ اعلیٰ اور ریاست کا یہی نظریہ عقیدۂ الحاد کی انتہاء ہے۔ اس نظام کی حقیقت بیان کرنے کے بعد اس سے جنم لینے والے سوالات کا جواب قابلِ احترام مفتیانِ کرام اور معزز علمائے شرعِ متین کے ذمہ ہے۔ مثلاً کیا ایسی ریاست کے کفر اور شرک میں کسی شک کی گنجائش ہے؟ کیا یہ ریاست کسی صورت اسلامی ریاست بن سکتی ہے؟ اگر کوئی فوج اس ریاست کے دفاع میں جنگ کرے تو اس فوج اور اس کی جنگ کا کیا حکم ہو گا؟ اگر کوئی مسلمان ریاست کی حاکمیتِ اعلیٰ کے مذکورہ تصور کو درست مانتا ہو تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہو گی؟ اس ریاست کا خاتمہ کس طرح ہونا چاہیے؟ کیا اس ریاستی نظام کی گندگی میں رہتے ہوئے اس کی اصلاح میں اپنے آپ کو تختۂ دار کے لیے تیار کرنا ہے یا اس سے بغاوت کرتے ہوئے اس کے علمبرداروں کو تختۂ دار پر لا کھڑا کرنا ہے؟

بہر حال انقلابِ فرانس کے بعد یورپ کے عوام نے اس فکر کی بنیاد پر ووٹ ڈال کر اپنا ارادہ پارلیمنٹ کے سامنے تسلیم کر دیا۔ اب پارلیمنٹ نے آئین بنا کر انسان کو اس کا ارادۂ کل یعنی اس بہترین زمانے کی طرف جانے کا راستہ فراہم کر دیا جو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ افسوس کہ آنے والے سالوں میں امتِ مسلمہ نے بھی اس نظام سے متاثر ہو کر خلافت کی خلعت اتار کر جمہوریت کا قلادہ گلے میں ڈال لیا، جس کا ذکر ہم آگے کریں گے ان شاء اللہ۔

انسان کی ترقی اور یورپ کا صنعتی انقلاب (سرمایہ دارانہ نظام کا عروج)

جدید دنیا یعنی نیو ورلڈ آرڈر کی تشکیلِ نو میں کارفرما دوسرا انقلاب 'صنعتی انقلاب' تھا جس نے یورپ کی تنظیمِ نو میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس انقلاب میں یورپی ممالک نے مادی ترقی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ بھاپ سے چلنے والے انجن، پٹرول سے چلنے والے انجنوں کی ایجاد، مواصلات میں ٹیلی گراف اور پھر ٹیلی فون کی ایجاد، ریلوے اور موٹر کار کی ایجادات نے یورپ میں پیداوار کی رفتار کو اس قدر بڑھا دیا کہ پوری دنیا کی منڈیاں اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہو گئیں۔ دوسری طرف بہتر اور جدید اسلحہ بنانے کی صنعت میں ترقی سے مغرب بڑی طاقت بن کر اٹھا۔ یہ انقلاب انگلستان سے شروع ہوا۔ اس انقلاب کے دو ادوار ہیں۔ پہلا صنعتی انقلاب جو ۱۷۸۰ء سے ۱۸۵۰ء کے درمیان رونما ہوا۔ اس دور میں کپڑے کی صنعت نے بہت ترقی کی اور اس کی بنیادی وجہ برطانیہ کا

بنگال پر قبضہ تھا۔ اس ستر سالہ دور میں برطانیہ نے کپڑے کی صنعت میں ہندوستان کو پیچھے چھوڑ دیا۔ صنعتی انقلاب کا دوسرا دور ۱۸۵۰ء میں شروع ہوا۔اس انقلاب میں بنیادی کردار امریکہ کا تھااور اس دور میں ان صنعتوں نے جدید مشینوں اور جدید طریقوں کی مدد سے پیداوار میں بے انتہاء اضافہ کر دیا جس کے اثرات پوری دنیا کی معیشت پر پڑے۔

صنعتی انقلاب کی وجوہات

مغربی موٴرخین صنعتی انقلاب کی جو وجوہات بیان کرتے ہیں،ان میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

انگلستان کا عظیم انقلاب (۱۶۸۸ء)

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ۱۶۸۸ء میں انگلستان کے عظیم انقلاب کے نتیجے میں برطانیہ نے پروٹیسٹنٹ طرزِ فکر اپنالی تھی۔پروٹیسٹنٹ تعلیمات کے مطابق انسان اپنی دنیاداری اور تجارت کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتا ہے، جبکہ رومن کیتھولک ترکِ دنیا کا سبق دیتے تھے۔ چنانچہ پروٹیسٹنٹ فکر کے مطابق دنیاپرستی کے سارے کام بھی مذہبی کام ہی ٹھہرے۔ موٴرخین کے نزدیک اس فکر نے صنعتی انقلاب میں اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ اس نے انگلستان میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کی اور اس قوم نے منظم ہو کر کام کرنا شروع کر دیا۔

سرمایہ دارانہ فکر

صنعتی انقلاب میں دوسرا اور شاید سب سے اہم کردار برطانیہ کے ماہرِ معیشت 'ایڈم سمتھ' کے سرمایہ دارانہ معاشی نظریات ہیں جس میں آزاد تجارت، انفرادی مفاد، تجارت میں حکومت کے کم سے کم دخل اور مزدوروں کی تخصیص کے نظریات شامل ہیں۔ 'ایڈم سمتھ' کے مطابق ہر انسان اپنی ذات کے لیے کماتا ہے۔ اس لیے اسے چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اس کے عوض اسے زیادہ سے زیادہ معاوضہ ملنا چاہیے۔ اسی فکر کے خلاف 'کارل مارکس' نے 'سوشلزم' کا نظریہ پیش کیا تھا۔

برطانیہ کے مقبوضات میں اضافہ

برطانیہ میں صنعتی انقلاب کی تیسری وجہ برطانیہ کے مقبوضات میں اضافہ تھا جن میں ہندوستان اور امریکہ کی اہم زرخیز زمین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس انقلاب میں ہندوستان پر برطانیہ کے قبضے کا فیصلہ کن کردار

ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ان علاقوں سے بڑی مقدار میں خام مال برطانیہ کے ہاتھ آیا جسے پیداوار میں تبدیل کرنے کے لیے تیزرفتاری درکار تھی تاکہ خام مال ضائع نہ ہو۔

پیٹنٹ کی رجسٹریشن

صنعتی انقلاب کی چوتھی وجہ 'پیٹنٹ کی رجسٹریشن' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''اگر کوئی شخص کوئی خاص چیز بنائے یا ایجاد کرے تو وہ اس کو اپنے نام کے ساتھ گورنمنٹ کے پاس رجسٹر کرا دیتا ہے۔ پھر اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اس کو نہیں بنا سکتا۔ اگر کوئی تاجر یا کمپنی اسے لینا یا بنانا چاہے تو اسے اصلی بانی یا موجد کو معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے''۔اس عمل نے عام لوگوں میں ایجادات کی حوصلہ افزائی کی۔

سرمائے کی فراہمی کا جدید معاشی نظام

صنعتی انقلاب کی کامیابی کی ایک اور اہم وجہ یورپ میں تجارت کرنے کی نئی ترتیب تھی۔سادہ اصول یہ ہے کہ تجارت یا پیداوار کے لیے خام مال اور مزدور چاہیے اور مال اور مزدور کو دینے کے لیے سرمایہ چاہیے۔ صنعتی انقلاب نے یورپ کی حکومتوں کو مجبور کر دیا کہ وہ تجارت اور سرمائے کی فراہمی میں آسانی کے لیے نئے قانون بنائیں۔اس کے نتیجے میں کمپنیوں، بینکوں اور سٹاک مارکیٹوں کا نظام پوری دنیا میں برپا کیا گیا۔کرنسی کے نظام میں بہت سا ردوبدل کیا گیا۔ اس پورے نظام کے قائم ہونے سے یورپ کی زندگی مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔ اس نظام کی تنظیم کی وجہ سے تین طرح کی آسانیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔کمپنیوں کے لیے یہ آسان ہو گیا کہ وہ ایسے ملک میں جہاں سے خام مال نکلتا ہو، کسی بھی یورپی بینک سے سرمایہ لے کر کانوں کے ٹھیکے لے سکیں۔ دوسرا اس خام مال کو یورپ میں اپنے اپنے ملکوں میں پہنچانے کے لیے بھی بینکوں کی بدولت سرمایہ میسر آ گیا۔ تیسرا اپنے ملکوں میں اس خام مال کو پیداوار میں تبدیل کرنے کے لیے صنعتیں لگانے کا سرمایہ بھی میسر آ گیا۔

خام مال کی فراہمی، صنعت، مال اور تجارت کی اس نئی تنظیم نے یورپ میں انفرادی زندگیوں پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ انفرادی طور پر اب ہر شخص اپنا مال بیچ کر کمپنیوں میں لگانے لگا۔ لوگ کاروبار اور روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کرنے لگے، جس کی وجہ سے شہری آبادی بڑھنے لگی۔یورپ کی پیداوار میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ وہ برآمدات میں پوری دنیا کی مارکیٹوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور اس کا مزید ذکر ہم مناسب موقع پر کریں گے ان شاء اللہ۔

غلاموں کی تجارت

صنعتی انقلاب میں غلاموں کی تجارت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ یہ غلام اس معنی میں غلام نہ تھے کہ یہ کسی علاقے کو فتح کر کے حاصل کیے گئے تھے یا یہ کسی جنگ میں فتح حاصل کر کے لائے گئے تھے۔ بلکہ برطانیہ اور امریکہ کو اپنی صنعتوں میں بغیر تنخواہ کے مزدور درکار تھے جس کے لیے انھوں نے مشرقی، مغربی اور جنوبی افریقہ کے ساحلوں کے لیے خاص کمپنیاں بنائیں۔ ان کمپنیوں کے ساتھ اپنی فوج ہوا کرتی تھی۔ ان کمپنیوں کا کام یہ تھا کہ یہ موریطانیہ، انگولا، نمیبیا، کونگو، مڈگاسکر، موزنبیق، کینیا اور صومالیہ کے ساحلی دیہاتوں پر اچانک حملہ آور ہوتیں اور ہزاروں لوگوں کو گرفتار کر کے بحری جہازوں کے ذریعے اپنے ساتھ یورپ اور امریکہ کی منڈیوں میں بیچ دیتیں۔ انیسویں صدی کے نصف میں مغربی اقوام نے لاکھوں انسانوں کو غلام بنایا، جن میں سے ہزاروں لاکھوں راستے میں بیماریوں سے مر گئے جنھیں سمندر میں پھینک دیا گیا اور جو خیریت سے پہنچے انھیں صنعتوں، کانوں اور کھیتوں میں کام پر لگا دیا گیا۔ یہ لوگ کبھی بھی اپنے وطن واپس نہ جا سکے۔ ان میں نصف تعداد مسلمانوں کی تھی جنھیں زبردستی عیسائی بنایا گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون!)۔ امریکہ میں آباد تمام کالی نسلیں، انھی غلاموں کی نسلوں میں سے ہیں جنھیں صنعتی انقلاب کے زمانے میں اغواء کر کے امریکہ اور برطانیہ منتقل کیا گیا تھا۔ یہ نسلیں اب مکمل طور پر عیسائی ہو چکی ہیں۔ غلاموں کی اس تجارت کی المناک کہانیاں خود مغربی مؤرخین کی کتابوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔

جاگیردارانہ نظام کا زوال

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی جاگیردارانہ نظام کا ردِعمل تھا۔ اس نظام کی ترقی سے جاگیردارانہ نظام کا زوال شروع ہو گیا۔ اب جاگیردار اپنی زمینوں کو بیچ کر صنعتوں اور تجارت میں لگانے لگے۔

صنعتی انقلاب کے اثرات

صنعتی انقلاب نے نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا پر اپنے اثرات مرتب کیے، مثلاً:

عالمی منڈی پر مغرب کی اجارہ داری

اس انقلاب کی بدولت یورپ مادی ترقی میں اتنا آگے نکل گیا کہ اس نے پوری دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس ترقی کی وجہ یہ تھی کہ یورپ نے پیداوار میں بہت زیادہ اور بہت تیزی سے اضافہ کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی۔ زیادہ اور تیزی سے پیداوار کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے ان کا مال عالمی منڈیوں میں دوسرے پیداوار کرنے

والے ممالک سے جلدی پہنچنے لگا۔ اس طرح عالمی منڈیوں پر مغربی ممالک کا اجارہ قائم ہو گیا جو اب تک قائم ہے۔

امتِ مسلمہ کا استیصال

چونکہ یہ وہی وقت تھا جب اکثر مسلم علاقے مغربی استبداد کے زیرِ تسلط تھے اور وہاں مغرب کا نوآبادیاتی نظام قائم تھا، ان مغربی اقوام نے ان علاقوں کے وسائل بے دریغ استعمال کیے اور انھیں اپنے ممالک میں منتقل کیا، جس کی وجہ سے مسلم علاقوں کی معیشت تباہ ہو گئی اور مسلمانوں کے وسائل بھی ان کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ نے ۱۷۵۷ء میں بنگال پر قبضہ کر لیا۔ بنگال کی فتح سے اسے کپاس اور سوت کی ایک بڑی منڈی ہاتھ آگئی۔ زمانہ قدیم سے یہ اصول نافذ ہے کہ خام مال کو برآمد کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی بلکہ اس خام مال سے پیداوار کی جاتی ہے۔ اس زمانے میں ہندوستان پوری دنیا کو کپڑا فراہم کرنے والا واحد اور سب سے بڑا ملک تھا۔ جب انگریزوں نے بنگال پر قبضہ کیا تو انھوں نے سب سے پہلے بنگال میں ایسے قوانین نافذ کیے جس سے کاشتکار کو کمپنی کے ہاتھ خام مال بیچنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال اور ہندوستان کی کپڑے کی صنعت تباہ ہونا شروع ہو گئی اور کپاس اور سوت اب سیدھا برطانیہ کی طرف جانے لگا۔ اب برطانیہ میں خام مال زیادہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ دوسری طرف برطانیہ میں ایسی مشینیں تیار ہو گئیں جو کم وقت میں زیادہ سوت کاتتی اور کپڑا بنا سکتی تھیں، جبکہ ہندوستان میں اس سے زیادہ وقت لگتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً ستر سال کے عرصے میں ہندوستان میں کپڑے کی پیداوار برطانیہ کی پیداوار کے مقابلے میں بہت کم ہو گئی اور خود برطانیہ سے بنا ہوا کپڑا ہندوستان کی مارکیٹوں میں بکنے لگا۔

اسلحہ سازی اور جنگی صلاحیت میں اضافہ

یورپ میں اس صنعتی انقلاب نے عسکری صنعت پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ لوہے کی صنعت میں ترقی نے بہتر اسلحہ بنانے کی صلاحیت میں اضافہ کر دیا۔ اب بہتر بندوقیں، توپ خانہ اور مشین گن نے مغرب کی قوتِ ضرب میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ دوسری طرف ریل گاڑیوں اور بحری جہاز کے انجن کی ایجاد سے زیادہ سے زیادہ فوجی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔ گاڑیوں، ٹرکوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی ایجاد سے فوجوں کو متحرک کرنے کی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

نئے شہروں کا قیام

صنعتی انقلاب کا ایک عمرانی اثر یہ ہوا کہ نئے شہر بننے لگے۔ وہ علاقے جہاں صنعتیں قائم تھیں، وہ شہروں میں تبدیل ہونے لگے۔ دور دراز سے لوگ ان شہروں کا رخ کرتے جس سے ان شہروں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ اس کا ایک منفی اثر یہ ہوا کہ قبیلے، برادریاں اور خاندان ٹوٹنے لگے اور معاشرے کمزور ہو گئے۔

سوشل ازم کا انقلاب (صنعتی انقلاب کا ردِ عمل)

سرمایہ دارانہ نظام اور صنعتی انقلاب کے ردِ عمل میں 'سوشل ازم' (اشتراکیت) کا فلسفہ سامنے آیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کا موجد 'ایڈم سمتھ' تھا جبکہ سوشلزم کے موجد 'کارل مارکس' اور 'فریڈرک انجیل' (Friedrich Engels) تھے۔ 'کارل مارکس' جرمن یہودی فلسفی تھا۔ اس نے سرمایہ دارانہ نظام اور صنعتی انقلاب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد 'سوشلزم' کا نظریہ پیش کیا۔ سوشلزم سرمایہ دارانہ نظام کا ردِ عمل تھا۔ کارل مارکس کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام صرف ایک طبقے کو نوازتا ہے اور تمام سرمایہ جمع ہو کر ایک ہی طبقے کی طرف جاتا ہے۔ اس نظام کی بدولت غریب غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور امیر امیر تر ہوتا جاتا ہے۔ کارل مارکس کے مطابق جو نفع سرمایہ دار کماتا ہے وہ دراصل مزدور کی محنت کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، جبکہ سرمایہ دار مزدور کو مزدوری دے کر ٹال دیتا ہے اور سارا منافع خود لے جاتا ہے حالانکہ اس نفع میں اس مزدور کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو سرمایہ دار پوری دنیا پر اس طرح غالب آ جائے گا جیسے بادشاہ بھی غالب نہ تھے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں غریب اور مزدور طبقے کی زندگی ایک غلام سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ کارل مارکس نے اس کا علاج یہ دیا کہ دنیا بھر کا مزدور طبقہ اٹھے اور ان سرمایہ داروں سے حکومت چھین لے۔ اس کے بعد سرمائے اور پیداوار کی ریاستی کنٹرول کے ذریعے پوری دنیا میں منصفانہ تقسیم کرے۔

کارل مارکس کے یہ نظریات پورے یورپ میں مقبول ہونا شروع ہو گئے۔ ۱۸۶۴ء میں لندن میں پہلی سوشلسٹ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کے بعد اس جدوجہد کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ ۱۸۹۵ء میں دوسری کانفرنس منعقد ہوئی۔

اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا موازنہ

مزید آگے بڑھنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ قارئین کے سامنے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے درمیان موازنہ پیش کریں اور اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے مابین فرق کو واضح کریں تاکہ اسے ملحوظ رکھتے ہوئے برسرِپیکار سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے کے لیے درست حکمتِ عملی اپنائی جائے۔

فکری لحاظ سے اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا منبع ایک ہی ہے۔ چنانچہ ہیومن کے بنیادی اصولوں اور مقاصد کے حوالے سے ان دونوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں نظام اللہ سے باغی ہیں، انسان کو مذہب سے آزاد سمجھتے ہیں اور اس کی زندگی کا مقصد مادی 'ترقی' گردانتے ہیں۔ اس طرح دونوں نظام بنیادی طور پر نشاۃ ثانیہ کے دور کی فکری تبدیلیوں، تحریکِ تنویریت اور انقلابِ فرانس کے اثرات کو قبول کرتے ہیں۔ البتہ ان مقاصد کے حصول کے سلسلے میں عملی اعتبار سے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، لہٰذا ان دونوں نظاموں کے خلاف منصوبہ بندی کے دوران اسے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہ واضح ہونا چاہیے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جہاد میں روس کے خلاف جہاد کے دوران اختیار کی گئی حکمت عملیاں نہیں چل سکتیں۔

اب فکری اور عملی سطح پر علیحدہ علیحدہ موازنہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام فکری سطح پر

اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں تحریکِ تنویریت اور سیکولرزم کے مطابق انسان کو ہیومن بنانے، روشن خیالی کو تسلیم کرتے ہوئے عقل کو دلیل ماننے اور انسانی ترقی اور سرمایہ کی بڑھوتری کو مقصدِ زندگی بنانے میں ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ تاریخی اعتبار سے تحریکِ تنویریت کے تسلسل میں سرمایہ دارانہ نظام اشتراکیت سے پہلے شروع ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام انقلابِ فرانس کے نتیجے میں مقصدِ زندگی میں پیدا ہونے والے خلاء کو پر کرنے کے لیے پیش کیا گیا جبکہ سوشلزم سرمایہ دارانہ نظام کا ردِ عمل تھا۔

- پہلا بنیادی فرق ان دونوں میں ہیومن کے تصور میں واقع ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ہیومن آزاد اور خود مختار انسان ہے، جبکہ سوشلزم کا ہیومن غریب اور مجبور انسان ہے جس کا حق سرمایہ دار مار رہا ہے۔ اس انسان کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے سرمایہ دار طبقے سے جنگ لڑنی تھی۔ اس بنیادی فرق کی بنا پر ہی باقی فرق واقع ہوئے۔

- دوسرا فرق سرمائے کی بڑھوتری میں اضافی رقم یعنی 'منافع' (Surplus Value) میں واقع ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام اسے سرمایہ دار کا حق سمجھتا ہے جبکہ سوشلزم اسے مزدور طبقے کا حق سمجھتا ہے جسے معاشرے میں مساوی طریقے سے تقسیم کیا جانا چاہیے۔
- تیسرا فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت کا اختیار تمام ہیومنز کا مشترکہ اختیار ہے، چاہے وہ سرمایہ دار ہوں یا مزدور، اور اسی کی خاطر جمہوری نظام اپنایا گیا۔ اس کے بالعکس اشتراکیت میں حکومت کرنا مزدور طبقے کا حق ہے جس کی خاطر وہ جنگ لڑتا ہے۔
- چوتھا فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معاشرے میں حقِ ملکیت، معیشت کی آزادی اور معاشی ترقی میں مقابلے کی فضا چاہتا ہے، جبکہ سوشلزم مزدوروں کی حکومت کے ذریعے معاشرے میں معاش کی مساویانہ تقسیم کا قائل ہے۔

اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام عملی سطح پر

ان فکری اختلافات کی بنیاد پر عملی میدان میں مندرجہ ذیل فرق واقع ہوئے:

- سرمایہ دارانہ نظام اداروں کی نجکاری (Privatization) کا قائل ہے[36]، جبکہ اشتراکیت اداروں کے قومیانے (Nationalization) کی قائل ہے۔
- سرمایہ دارانہ نظام آزاد معیشت کا قائل ہے جس میں ریاست کم سے کم مداخلت کرے، جبکہ اشتراکیت صارف کی (Non Commercial) منڈی کی پرواہ کیے بغیر تجارت کی قائل ہے جس کی نگرانی حکومت کرے۔
- سرمایہ دارانہ نظام پیشہ ور (Professional) انسان کی پرورش کرتا ہے، جبکہ اشتراکیت مزدور طبقے کی حمایت کرتی ہے۔
- سرمایہ دارانہ معاشرہ 'کارپوریٹ معاشرے' (Corporate Society) کی شکل اختیار کرتا

[36] اداروں کی نجکاری سے مراد یہ ہے کہ معاشی اداروں کو حکومتی تحویل وملکیت سے ہٹا کر افراد کی ذاتی ملکیت میں دیا جائے۔ اس کے بالعکس دوسرا عمل 'نیشنلائزیشن' (قومیانے) کا ہے جس میں معاشی اداروں کو افرادی ملکیت سے نکال کر قومی وحکومتی ملکیت میں لایا جاتا ہے۔ اس پر مزید گفتگو عنوان: 'منڈی کی معیشت کا تجارتی نظام' کے تحت کریں گے۔

ہے[37]، جبکہ اشتراکیت میں 'آئرن کرٹن معاشرہ' (Iron Curtain Society) ہوتا ہے۔ 'آئرن کرٹن' سے مراد آہنی دیواروں میں بند معاشرہ ہوتا ہے۔[38]

- سرمایہ دارانہ نظام' جمہوریت' کے ذریعے حکومت چلاتا ہے جس میں ضابطوں (Controls) کے ذریعے نظام کو قابو کیا جاتا ہے، جبکہ اشتراکیت میں حکومت مزدور طبقے کی مطلق العنانیت (Dictatorship) پر قائم ہوتی ہے جس میں اوامر (Commands) کے ذریعے نظام چلایا جاتا ہے۔[39]
- دونوں عالمی (Global) حکومت کے قائل ہیں مگر سرمایہ دارانہ نظام اس کے لیے سفارتی اور ریاستی (Statesman) طریق کار اپناتا ہے جس کی نظر مقاصد پر ہوتی ہے خواہ وہ جس طرح بھی حاصل ہوں، جبکہ اشتراکیت جنگجوانہ طرزِ عمل سے اپنے مقاصد کی تکمیل کرتی ہے۔

ان فرقوں کو ملحوظ رکھنے سے ایک بات واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں مضبوط مرکزیت کی قائل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام غیر مرکزیت کے سبب ہر جگہ اتحادی یا شراکت دار کا

---

[37] کارپوریٹ معاشرے سے مراد ایسا معاشرہ ہے جہاں ہر فرد اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور یوں افراد کا باہمی تعلق اپنے کاموں (professions) کی حد تک رہتا ہے۔ ایسے معاشرے میں اخوت وبھائی چارگی کا کوئی تصور نہیں ہوتا، نہ ہی خاندان برادری کا تعلق کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ امریکہ ویورپ کے معاشرے ایسی ہی معاشرے ہیں جہاں انسانوں کا تعلق محض اپنے پیشوں کی حد تک ہے، گویا جانور ہوں جن کا صرف ضرورت کے تحت آپس میں تعلق ہو۔ افسوس ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے عالمی تسلط کی بدولت اب مسلمان معاشرے بھی اسی نہج پر چل پڑے ہیں۔ فیا للأسف! (م ح)

[38] یہ ایک دوسری انتہاء ہے جس میں معاشرے کے افراد اجتماعی نظم (حکومت) کے تحت جکڑے ہوتے ہیں اور انفرادی اختیارات میں بھی حکومت کی مداخلت ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال جنگ عظیم دوم کے بعد کا روس ہے۔ اللہ تعالیٰ کا امتِ مسلمہ پر احسانِ عظیم ہے کہ اس نے ہمیں افراط و تفریط سے پاک اعتدال پر مبنی تعلیمات عطا فرمائیں جن پر امت تیرہ صدیوں تک عمل پیرا رہی، یہاں تک کہ خلافتِ عثمانیہ کا سقوط ہو گیا۔ اس کے بعد کا حال آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (م ح)

[39] امر اور ضابطے (Command and Control) کی اصطلاح دراصل فنِ اداریات (Management) کی مشہور اصطلاح ہے۔ اب یہ اصطلاح خاص طور فوجی نظم وضبط کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ 'کمانڈ' ... جیسا کہ نام سے ظاہر ہے... کسی صاحبِ اختیار (Authority) کے حکم کو کہتے ہیں، جبکہ 'کنٹرول' اس ضابطے کو کہتے ہیں جو کاموں کے انتظام وانصرام کے لیے بطور معیار متعین کر دیا جاتا ہے، جس کے بعد کام خود بخود اس کنٹرول کے مطابق چلتا رہتا ہے۔ ان دونوں اصطلاحات کے فرق کو جمہوریت اور آمریت کے پسِ منظر میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ (م ح)

متلاشی ہوتا ہے جس کے حصول کے بعد اس کا حجم بہت بڑا لگنے لگتا ہے۔ جبکہ اشتراکیت ظاہری اتحادیوں کے باوجود سارا کام اپنے بل بوتے پر چلاتی ہے۔

عسکری نظریات میں انقلاب

انقلابِ فرانس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی خلاء میں ایک بڑا مسئلہ شاہی افواج کا تھا۔ شاہی سپاہی بادشاہ کو 'ظل اللہ' سمجھ کر لڑتے تھے۔ اس کی شکست کو وہ اپنی شکست گردانتے تھے اور اس کی خاطر جان دینا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ لادین انقلاب میں اس قسم کے نظریات کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ افواج کو یقین کی حد تک پختہ نظریے اور باہمی مضبوط جتھہ بندی کے بغیر جنگ پر نہیں ابھارا جا سکتا۔ ایسی حالت میں یورپی ریاستوں کو اپنی افواج کے لیے ایسے نظریے کی ضرورت تھی جو انھیں متحد اور زندہ رکھ سکے۔ مغرب کو در پیش سوال کا جواب پروشیا (Prussia) کے 'کلازوٹ' (Karl von Clausewitz) نامی ایک جرنیل نے دیا۔ 'کلازوٹ' کے نظریۂ جنگ کو قومی فوجوں کی تشکیل کے تمام نظریات میں بائبل کی سی حیثیت حاصل ہے۔ کلازوٹ کو جدید عسکریت کا نبی مانا جاتا ہے۔ ۱۷۹۲ء میں کلازوٹ فرانس کے خلاف جنگوں میں برسرِ پیکار پروشی جرنیل تھا جو بعد میں روسی فوج میں شامل ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ انقلابِ فرانس کے نتیجے میں پاپائیت اور بادشاہت دونوں سے ہی جان چھڑا چکا تھا۔ اسی دور میں 'کانٹ' (Kant) نے سرمایہ دارانہ اور 'کارل مارکس' نے اشتراکی نظریہ پیش کیا تھا۔ کلازوٹ اگرچہ خود کارل مارکس کے نظریات سے متاثر تھا مگر کلازوٹ کی فکر کو اس کے مرنے کے بعد سرمایہ دار مغرب نے اغواء کر لیا۔ کلازوٹ کے نظریات اس کی زندگی میں منظرِ عام پر نہ آسکے اور ۱۸۳۲ء میں وہ بیمار ہو کر مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ نے ان نظریات کو کتابی شکل دے کر شائع کیا۔ آغاز میں اسے کوئی خاطر خواہ شہرت نہ ملی۔ ۱۸۷۱ء میں فرانس کے بادشاہ 'نپولین ثالث' (Napoleon III) نے پروشیا پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں پروشیائی فوج کی کمان کلازوٹ کے لائق شاگرد 'جنرل مولٹکی' (General Moltke) کے ہاتھ میں تھی جس نے پروشیا کی فوج کو کلازوٹ کے نظریات کے مطابق منظم کیا تھا۔ فرانس کو اس جنگ میں عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پروشیا کی کامیابی سے سارا یورپ چونک گیا اور جب معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ کلازوٹ کے نظریات کا کمال ہے تو پورے یورپ نے ان نظریات کے مطابق اپنی افواج کی تنظیمِ نو شروع کر دی۔

اس وقت تک امتِ مسلمہ اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ ان نظریات سے متاثر ہو کر سلطنتِ عثمانیہ نے 'جنرل مولٹکی' کواپنی افواج کی تنظیمِ نو کے لیے مقرر کر دیا۔ دوسری طرف استعماری طاقتوں نے نوآبادیاتی علاقوں میں افواج کوانھی نظریات پر منظم کیا۔یوں ہندوستان پر قابض برطانیہ اور مصر پر قابض فرانس نے بھی وہاں کی افواج کوانھی نظریات کے مطابق ڈھال لیا۔اس طرح ستر سال سے کم عرصہ میں تمام ممالک کی افواج کی تشکیلِ جدید کلازوٹ کے نظریات کے مطابق ہوگئی، یہاں تک کہ ان جدید قومی افواج کانام ہی افواجِ کلازوٹ پڑ گیا۔ ہمارے لیےاخذ کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ روسی طاقت کے خاتمہ کے بعداب ہمارامقابلہ افواجِ کلازوٹ سے ہے۔کلازوٹ کے نظریات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں۔

کلازوٹ کے بیان کردہ مقاصد

افواج کی تنظیمِ نو کے دوران کلازوٹ کے سامنے درج ذیل مقاصد تھے:

1. شاہی فوج کو وطنی فوج میں ڈھالنا۔
2. شاہی سپاہی سے وطنی سولجر بنانا۔
3. نظریہ ء جنگ تبدیل کرنا۔
4. انتظامی ڈھانچے کو نئے نظریے کے مطابق بنانا۔

کلازوٹ کے نظریات

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کلازوٹ نے درج ذیل اہم نظریات پیش کیے۔

- **جائز قوت**

کلازوٹ کے نزدیک جمہوری ریاست واحد جائز قوت ہے جو جنگ کا حکم دے سکتی ہے اس کے علاوہ کوئی اور جائز قوت نہیں جو جنگ کا حکم دینے کا حق رکھتی ہو۔ نہ رب، نہ دین، نہ شریعت، نہ علماء... نعوذ باللہ ان میں سے کوئی بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ جنگ کرنے کا حکم دے۔

- **مہذب اور غیر مہذب جنگ**

کلازوٹ کے مطابق جنگ دو طرح کی ہوتی ہے؛ ایک مہذب اور دوسری غیر مہذب۔ مہذب جنگ وطنی ریاست کے ساتھ مربوط ہے کیونکہ ریاست ہی جدید تہذیب کی محافظ ہے۔ لہٰذا جو جنگ ریاست لڑے گی وہی مہذب ہوگی، بلکہ جنگ لڑنے کا اختیار ہی ریاست کو ہے۔اس کے علاوہ ہر جنگ غیر مہذب شمار ہوگی۔

• مسلح اور غیر مسلح معاشرہ

اسی بناپر وہ معاشرے کو قانونی مسلح اور غیر قانونی مسلح افراد میں تقسیم کرتا ہے۔ فوج کا سپاہی معاشرے کا قانونی مسلح فرد ہے جبکہ باقی معاشرہ اگر اسلحہ اٹھائے یا اپنے پاس رکھے تو وہ غیر قانونی کہلائے گا۔ مزید یہ کہ کلازوٹ کے مطابق انسان کو اسلحہ اٹھانے کی اجازت صرف ایک جمہوری ریاست ہی دے سکتی ہے۔ اس کے سوا کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی انسان یا گروہ کو مسلح کرے۔

• جنگ، ریاستی پالیسی کا تسلسل

سابقہ نظریات کی بناپر کلازوٹ کے نزدیک جنگ ریاستی سیاست یا پالیسی کے تسلسل کا نام ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تین نظریات کی وجہ سے امتِ مسلمہ کی تمام افواج باوجود قابلیت رکھنے کے اللہ کے حکمِ جہاد کو پورا کرنے کے بجائے ریاست کے حکمِ سیاست کی منتظر رہتی ہیں۔

• رجمنٹ اور اس کی تاریخ، جنگ کا محرک

کلازوٹ کے یہاں فوج کی اکائی رجمنٹ ہے۔ بہت ساری رجمنٹیں مل کر ڈویژن بن جاتی ہیں۔ پھر ڈویژن عسکری قوت کی ایک اکائی کہلاتی ہے۔ کلازوٹ کے مطابق فوج کی اکائی یعنی رجمنٹ ایک معاشرے کا نام ہے۔ کلازوٹ کا نظریہ ہے کہ انسان جنگ کے لیے دو وجوہات کی بناپر تیار ہوتا ہے ایک اجتماعی وجہ اور وہ ہے جذبۂ حب الوطنی اور دوسری انفرادی وجہ جو اس کے یہاں رجمنٹ کی تاریخ ہے۔ اس طرح وہ شاہی سپاہی کو جو اس سے قبل بادشاہ کو ظل اللہ سمجھتا تھا، اپنی رجمنٹ کی تاریخ سے جوڑ کر وطنی سپاہی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر تجربے سے بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ گو حب الوطنی ایک سپاہی کو میدان میں کھڑا کرنے کے لیے ایک اہم عنصر ہے لیکن دورانِ لڑائی وہ اپنی جان کو اپنی رجمنٹ کی عزت اور آبرو کے لیے ہی قربان کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کے یہاں دورانِ جنگ رجمنٹ کی تاریخ حب الوطنی سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ اگر رجمنٹ کے سپاہی کے سامنے اس کی تاریخ کو غلط ثابت کر دیا جائے تو اس کے لڑنے کے جذبہ کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

• فوج کے لیے سپاہی کا چناؤ

وطنی سپاہی کے چناؤ کے لیے معاشرے کے افراد پر خاص توجہ دی گئی۔ اس حوالے سے 'مارشل یا عسکری نسل' اور 'عسکری ذہن' کا نظریہ پیش کیا گیا۔ اس نظریے کے مطابق دنیا کے ہر ملک و قوم میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو کمزور اور منجمد فکر مگر جارحانہ عزائم رکھتے ہیں۔ ایسی شخصیت کے حامل افراد میں وطنی سپاہی بننے کی

صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ کمزور اور منجمد فکر کی بدولت ایسا شخص اپنے ملک اور فوج سے بغاوت نہیں کر پاتا اور جارحانہ عزائم کی بدولت وہ دشمن کی فوج کو نقصان پہنچانے میں پیش پیش رہتا ہے۔

وطنی فوجوں کی تشکیل

کلازوٹ کے نظریات کو سمجھنے کے بعد اب ہم باآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ کلازوٹ نے شاہی فوج کو جمہوری ریاست کے ساتھ کیسے جوڑا۔ سب سے پہلے ایک کمزور شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر اس شخصیت کو وطنیت اور رجمنٹ کی تاریخ سے جوڑا جاتا ہے۔ پھر اس رجمنٹ کو بریگیڈ، ڈویژن اور فوج کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ اس سپاہی کو دورانِ تربیت یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جنگ کا حکم دینے والی جائز قوت صرف اور صرف جمہوری ریاست ہے، اس کے علاوہ کوئی اور قوت جنگ کرنے کا حکم نہیں دے سکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ریاست کے حکم سے اسلحہ اٹھانے والا، باوردی سپاہی مہذب اور جائز جنگ کر سکتا ہے، اس کے علاوہ جو کوئی جنگ کے لیے اسلحہ اٹھائے وہ غیر مہذب اور غیر قانونی ہے۔

اس وقت پوری دنیا کی قومی افواج...چاہے وہ مغرب کی ہوں یا مسلم ممالک کی...اسی کلازوٹ کے نظریات کے تحت منظم کی گئی ہیں۔ اسی لیے خلافت کے قیام اور جہاد کے لیے ان قومی فوجوں کا کوئی کردار نہیں بلکہ یہ اس کی نظریاتی مخالف ہیں اور مخالف ہی رہیں گی۔

یہودیوں کی صدی

یورپ میں انقلابِ فرانس کے بعد سے ستر سال تک مختلف ممالک میں انقلابات آتے رہے۔ صنعتی انقلاب نے سیاسی انقلاب کے ساتھ مل کر پورے یورپ کے معاشرے کی تنظیمِ نو کر دی۔ یورپ میں ہر شخص نے مذہب سے آزاد ہو کر صرف مادی ترقی کی راہ کو اپنانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف یورپ کے ان انقلابات کا فائدہ یہودیوں کو ہوا۔ یہودی کلیساء کی قید سے آزاد ہو چکے تھے۔ ہر یورپی ملک کا آئین یہودیوں کو برابر کا انسان تسلیم کر چکا تھا۔ تیسری طرف صنعتی انقلاب میں یہودی سب سے بڑے سرمایہ کار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔

ان تبدیلیوں کے نتیجے میں یہودی اپنے مقاصدِ عظمیٰ کی طرف ایک قدم آگے بڑھ چکے تھے۔ وہ اپنے بڑے دشمن رومن کیتھولک کلیساء کو شکست دے چکے تھے اور ساتھ ہی وہ پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی شکل میں اپنے لیے ایک مضبوط اتحادی بھی تلاش کر چکے تھے جو ان کے فلسطین پر حق کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ اس کے حصول کے

لیے ان کی مدد کرنے کو بھی تیار تھے۔ ان میں برطانیہ اور امریکہ کی حکومتیں بھی شامل تھیں۔ پھر یہودی یورپ کے بینکوں کی تجارت پر بھی مکمل طور پر قبضہ کر چکے تھے۔ تاہم ابھی بہت کچھ باقی تھا۔ ابھی ان کو فلسطین پر قبضہ کرنا تھا۔ پھر کرنسی کو سونے کی طاقت سے علیحدہ کرنا تھا اور کرنسی کو چلانے کا اختیار بینکوں کے حوالے کرنا تھا۔ یہ عوامل عالمگیر حکومت حاصل کرنے کے لیے ان کی راہ کے اہم سنگِ میل تھے۔

فلسطین کے حصول کے لیے ان کی راہ میں ابھی دو اہم طاقتیں حائل تھیں؛ ایک سلطنتِ عثمانیہ جس کے قبضہ میں فلسطین تھا اور دوسری طاقت روسی بادشاہ جسے 'زار روس' (Tsar) کہا جاتا تھا۔ زار روس قدیم روایتی عیسائی بادشاہت تھی جو کلیسائے روم کی طرح یہودیوں کی بڑی دشمن تھی اور کبھی بھی یہودیوں کے لیے فلسطین میں علیحدہ ریاست کی حمایت نہیں کر سکتی تھی بلکہ وہ خود بھی فلسطین کی دعوے دار تھی۔ یہود کے لیے ان دونوں طاقتوں کو راہ سے ہٹانے کی ضرورت ابھی باقی تھی۔ پھر یہ دونوں طاقتیں ایسی نہ تھیں جن کو آسانی سے ہٹایا جا سکتا ہو۔ خود برطانیہ اور فرانس کے لیے ان دونوں طاقتوں کو راہ سے ہٹانا آسان نہ تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف برطانیہ اور فرانس سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور اس میں زار روس بھی ان کے ساتھ متفق تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ کوئی فریق اپنے اندر اس قدر طاقت نہیں پاتا تھا کہ وہ اکیلا ہی سلطنتِ عثمانیہ کو شکست دے دے (گو اس وقت سلطنتِ عثمانیہ بہت کمزور ہو چکی تھی)۔ دوسری طرف اس صدی کے انقلابات نے مشرقی اور وسطی یورپ کی ریاستوں آسٹریا اور ہنگری کو روس کا مخالف کر دیا تھا۔ اس لیے وہ سلطنتِ عثمانیہ کی حمایت کرتے تھے۔ یہ ساری صورت حال اتنی پیچیدہ تھی کہ یہ ایک جنگِ عظیم کا پیش خیمہ بنتی جا رہی تھی۔ **اس جنگ میں جیتنے کے لیے بے شمار افرادی قوت کی ضرورت تھی اور وہ افرادی قوت صرف برطانیہ ہندوستان پر قبضہ کے بعد ہی فراہم کر سکتا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کی سیاسی بساط پر برطانیہ ہی ایک ایسا ملک تھا جو ہندوستان سے کرائے کے سپاہی فراہم کر کے مسلمانوں کی خلافت کو ختم کرنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ 'جنگِ عظیم اول' میں رائل انڈین آرمی (شاہی ہندی فوج) کے پندرہ لاکھ سپاہیوں نے امتِ مسلمہ کی خلافت کو توڑنے کا اعزاز حاصل کیا!**

انیسویں صدی کی یہ سیاست اتنی پیچیدہ ہے کہ اس کو واضح کرنے اور سمجھنے کے لیے ایک ضخیم کتاب چاہیے۔ اسی لیے مؤرخین اس جنگ کو 'گریٹ گیم' کے نام سے جانتے ہیں۔ یہاں ہم اس صورتِ حال کو آسان انداز میں سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ اس سیاسی کھیل کے اہم کردار سلطنتِ عثمانیہ، زار روس،

سلطنتِ برطانیہ، فرانس اور ہندوستان ہیں۔ لہٰذا ہم ان تمام کرداروں کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کریں گے۔

گریٹ گیم (امتِ مسلمہ کا زوال)

'گریٹ گیم' دراصل مغربی مؤرخین کی خاص اصطلاح ہے جو روس، برطانیہ اور فرانس کی سلطنتِ عثمانیہ کو توڑنے کے لیے کی جانے والی سازشوں اور جنگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ تینوں ممالک ایک طرف تو سلطنتِ عثمانیہ کو کمزور کرنے کی سازش کرتے تھے اور دوسری طرف اس خطرے میں مبتلا رہتے تھے کہ کہیں ہم میں سے کوئی ایک ملک دوسروں سے زیادہ حصے پر قبضہ نہ کرلے۔ اس لیے جب ۱۸۷۷ء میں روس نے سلطنتِ عثمانیہ پر حملہ کر کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تو برطانیہ اور فرانس سلطنتِ عثمانیہ کے حامی ہو گئے اور روس کو نکلنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن جب 'جنگِ بلقان' میں اپنا مفاد سامنے آیا تو ان دونوں ممالک نے خلافتِ عثمانیہ کے مقابلے میں ریاستِ بلقان کی حمایت کی۔ لہٰذا جنگِ عظیم اول میں جب سب طاقتیں آمادہ ہو گئیں تو سب نے مل کر سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف محاذ کھول لیا۔

'گریٹ گیم' کے دو ادوار ہیں؛ پہلے دور کو 'یورپی دور' کہا جا سکتا ہے جو ۱۸۵۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ تک رہا۔ یہ تقریباً ساٹھ سال کا عرصہ ہے جس میں امتِ مسلمہ کے ان تینوں دشمنوں نے اپنے اپنے طور پر خلافتِ عثمانیہ کو کمزور کر کے یورپ سے اس کے اقتدار کو ختم کیا۔ جبکہ 'گریٹ گیم' کا دوسرا دور جنگِ عظیم اول سے سقوطِ خلافتِ عثمانیہ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۳ء) تک ہے۔

گریٹ گیم کا تاریخی پسِ منظر

گریٹ گیم کی اس کہانی کا آغاز انیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کھیل کے چار اہم کردار اور دو اہم عناصر تھے۔ چار کرداروں میں سلطنتِ عثمانیہ، زارِ روس، سلطنتِ برطانیہ اور فرانس تھے، جبکہ دو اہم عناصر میں برطانیہ کا ہندوستان پر قبضہ اور بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر پر قبضہ کی کوشش ہیں۔

یہ وہ وقت تھا جب خلافتِ عثمانیہ کی حکومت دنیا کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کی حیثیت سپر پاور کی سی تھی۔ اس سلطنت کی سرحدیں ایک طرف روس کے ساتھ اور دوسری طرف یورپ میں جرمنی اور فرانس کے ساتھ لگ رہی تھیں۔ دنیا کے تمام اہم تجارتی سمندری راستے سلطنتِ عثمانیہ کے قبضہ میں تھے۔ بحیرۂ روم میں ان کی اجازت کے بغیر کوئی جہاز نہیں چل سکتا تھا۔ بحیرۂ روم زمانہ قدیم سے دنیا کی ایک شہ رگ کی

حیثیت رکھتا ہے۔ بعض مؤرخین کے خیال میں دنیا کی قدیم تاریخ بحیرۂ روم کے ارد گرد گھومتی ہے۔ بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ ہو یا سکندر کے حملے، مشرک رومی بادشاہ ہوں یا عیسائی روم، بنو امیہ ہوں یا بنو عباس، عثمانیوں کی مغربی ممالک سے جنگ ہو یا مغربی ممالک کی گریٹ گیم، برطانیہ کے خلاف نپولین کی جنگ ہو یا ہٹلر کی افریقی مہم، حقیقت یہ ہے کہ ان تمام کے حوالے سے بحیرۂ روم کا کردار فیصلہ کن رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کی سپر طاقت بننے کے لیے بحیرۂ روم پر قبضہ ضروری ہے۔

بحیرۂ روم کا جغرافیہ

'بحیرۂ روم' (Mediterranean Sea) مغرب میں جبلِ طارق (Gibraltar) سے لے کر مشرق میں فلسطین شام اور لبنان تک پھیلا ہوا تقریباً اڑھائی ہزار میل لمبا سمندر ہے۔ مغرب میں یہ جبلِ طارق کے مقام سے 'بحر اوقیانوس' (Atlantic Ocean) کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ جبکہ مشرق میں اس سے دو راستے نکلتے ہیں؛ جنوب مشرق میں مصر کے مقام پر 'نہر سویز' (Suez Canal) کے ذریعے 'بحیرۂ احمر' (Red Sea) سے ملتا ہے، یہ نہر ۱۸۶۹ء میں فرانس کی ایک کمپنی نے بنائی تھی،اور شمال مشرق میں یہ سمندر 'درۂ دانیال' (Dardanelles Strait) سے ہوتا ہوا 'آبنائے باسفورس' (Bosphorus Strait) میں جا نکلتا ہے اور پھر آگے 'بحیرۂ اسود' (Black Sea) میں جا کھلتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے یہ تینوں راستے ہمیشہ سے تجارت اور فوجوں کی اہم گزر گاہ رہے ہیں۔ بحیرۂ روم کی دوسری بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس سمندر کی دونوں اطراف میں دنیا کے تین براعظم ایک دوسرے سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر آ جاتے ہیں۔ جبلِ طارق کے مقام پر یورپ اور افریقہ ایک دوسرے سے محض پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر رہ جاتے ہیں۔ جنوب مشرق میں مصر کے علاقے 'صحرائے سیناء' (Sinai) میں افریقہ اور ایشیاء کی زمینی سرحدیں ملتی ہیں۔ شمال مشرق میں براعظم ایشیاء اور یورپ ترکی کے مقام پر صرف پانچ کلو میٹر کی دوری پر رہ جاتے ہیں۔ بحیرۂ روم پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ہر بڑی طاقت مغرب میں جبل طارق، وسطی بحیرۂ روم کے جزائر سسلی (Sicily)، مالٹا (Malta) اور کریٹ (Crete) پر قبضہ ضروری سمجھتی ہے۔ اس کے علاوہ مصر میں اسکندریہ (Alexandria) کی بندرگاہ اور ترکی میں درۂ دانیال میں گیلی پولی (Gallipoli) کے مقام بھی انتہائی تجارتی اور عسکری اہمیت کے حامل ہیں۔ دورِ جدید کی تمام اہم جنگیں انھیں مقامات پر لڑی گئیں۔

زار روس

اٹھارویں صدی کے آغاز ہی میں روس میں 'زار روس' کی سلطنت ایک سیاسی قوت بن کر ابھر رہی تھی۔ اسے تجارت کے لیے گرم پانیوں کی تلاش تھی، لیکن اس کی بد قسمتی یہ تھی کہ اس کا قریب ترین گرم سمندر بحیرۂ اسود تھا جو سلطنتِ عثمانیہ کے قبضے میں تھا۔ اسی طرح مغرب کی جانب یورپ میں اس کے داخلے کا زمینی راستہ پولینڈ، ہنگری اور آسٹریا سے گزرتا تھا اور وہاں بھی سلطنتِ عثمانیہ اس کی راہ میں حائل تھی۔ روس کے جنوب میں وسطی ایشیاء کی ریاستیں تھیں اور ان پر بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ سلطنتِ عثمانیہ کے اثرات تھے۔ یہ وہ جغرافیائی مشکلات تھیں جن میں روس اٹھاویں صدی کے آغاز میں گھرا ہوا تھا۔

برطانیہ اور فرانس

جیسا کہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ ۱۳۴۰ء میں یورپ کے تمام ممالک میں طاعون کی وباء پھیلی جس کی وجہ سے یورپ کی ایک تہائی آبادی مر گئی اور اس کا پورا معاشی ڈھانچہ تباہ ہو گیا۔ یورپ کو دنیا میں نئی منڈیوں کی تلاش کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یورپ کے تمام ممالک ہی جن میں پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ شامل ہیں، تجارت کی غرض سے نکلے۔ ان ممالک نے اپنی کمپنیاں بنائیں اور ہندوستان کا سفر شروع کیا، اور یہاں مغل بادشاہوں سے اجازت لے کر تجارت کا آغاز کر دیا۔ یورپ سے ہندوستان تک کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ بحیرۂ روم سے بحیرۂ احمر اور پھر بحیرۂ احمر سے بحیرۂ عرب (Arabian Sea) پہنچ کر ہندوستان آجاتا تھا۔ یہ راستہ چھوٹا اور آسان تھا۔ اس زمانے میں اس راستے سے ہندوستان تک دو ماہ میں سفر طے ہوتا تھا۔ جبکہ دوسرا راستہ بحر اوقیانوس میں مغربی افریقہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ جنوبی افریقہ کے شہر 'کیپ ٹاون' تک آتا تھا اور ایک چکر کاٹ کر جنوب سے شمال مشرق کی طرف بحر ہند میں (Indian Ocean) داخل ہو جاتا تھا۔ پھر بحر ہند سے بحیرۂ عرب اور وہاں سے ہندوستان پہنچتا تھا۔ یہ سفر آٹھ ماہ میں طے ہوتا تھا۔ دوسری طرف امریکہ کی دریافت کے بعد یورپ کے تمام ممالک اس پر قبضہ کرنے کی دوڑ شروع کر چکے تھے۔ فرانس اور برطانیہ میں ان نئی منڈیوں پر قبضے کے لیے جنگیں ہو رہی تھیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں برطانیہ کی امریکہ میں موجود منڈیوں کو ایک دھچکا لگا، کیونکہ 'جارج واشنگٹن' کی قیادت میں امریکہ نے برطانیہ سے آزادی حاصل کر لی۔ تاہم اس کے ازالے کے لیے برطانیہ نے فرانس کو ہندوستان کی تجارت میں بہت محدود کر دیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان پر اس کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

گریٹ گیم کے محاذ

ہندوستان پر قبضے کے بعد برطانیہ کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ بحیرۂ روم سے بحیرۂ احمر اور بحیرۂ احمر سے بحیرۂ عرب آنے والے سمندری راستے کو اپنے لیے کھلا رکھے جو اس وقت عثمانیوں کے قبضے میں تھا۔ یہ گریٹ گیم کا پہلا مرحلہ اور پہلا محاذ تھا۔ اس راستے میں اس کے لیے 'عدن' (Aden) اور 'اسکندریہ' کی بندرگاہیں اور 'کریٹ'، 'مالٹا' اور 'سسلی' کے جزیروں پر قبضہ ضروری تھا۔ برطانیہ نے ۱۸۱۴ء میں 'پیرس کانفرس' کی اجازت سے مالٹا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۳۲ء میں اس نے ایک معاہدے کے تحت 'عدن' کو سلطنتِ عثمانیہ سے لے لیا۔ ۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ کر لیا، جبکہ ۱۸۹۸ء میں کریٹ کو سلطنتِ عثمانیہ کے تحت آزاد ریاست مان لیا گیا۔

گریٹ گیم کا دوسرا مرحلہ اور محاذ ۱۸۵۶ء میں روس کے ساتھ کریمیا کی جنگ کے بعد شروع ہوا۔ اس مرحلے میں یورپی ممالک کے پیشِ نظر مشرقی اور جنوبی یورپ سے سلطنتِ عثمانیہ کو نکالنا تھا۔ اس مرحلے میں روس، برطانیہ اور فرانس تینوں اکھٹے تھے مگر تینوں کے طریقے مختلف تھے۔ برطانیہ اور فرانس نے داخلی سازشوں کا ایک بازار گرم کر رکھا تھا، جس میں آئین، جمہوریت، آزادی اور ترقی کے نعرے لگانے والی کئی پارٹیوں کو کھڑا کیا گیا۔ قومی اور نسلی تعصبات پر لوگوں کو شہ دے کر اٹھایا گیا۔ مسلم علاقوں میں ماتحت عیسائیوں کے ذریعے فسادات برپا کرائے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء کی بلقان جنگ میں سلطنتِ عثمانیہ کا یورپ کے علاقوں سے کنٹرول ختم ہو گیا۔

گریٹ گیم کا تیسرا مرحلہ جنگِ عظیم اول (۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۳ء) تھا جب خلافت کا خاتمہ کر کے مصطفی کمال نے ترکی کی قومی حکومت کی بنیاد رکھی۔ گریٹ گیم کا چوتھا محاذ روس کی جنوب کی سمت توسیع کی وجہ سے قائم ہو گیا تھا۔ روس نے ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۷ء تک وسطی ایشیائی ریاستوں پر قبضہ کر لیا اور وہ برطانوی ہندوستان سے صرف چار سو کلو میٹر دور رہ گیا۔ اب برطانیہ اور روس کے درمیان صرف افغانستان رہ گیا تھا۔ اس دور میں افغانستان کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ روس چاہتا تھا کہ افغانستان میں اس کے مطلب کی حکومت ہو اور برطانیہ چاہتا تھا کہ اس کے مطلب کی حکومت ہو۔ اس کشمکش نے ایک نئی جنگ کا آغاز کیا جسے تاریخ میں قبائلی جہاد یا برطانیہ کے خلاف پہلا افغان جہاد کہتے ہیں۔ گریٹ گیم کا پانچواں اور آخری محاذ روس کے قرب میں موجود کریمیا، قوقاف، بلقان، وسطی ایشیائی ریاستیں اور بحیرۂ اسود تھا۔

گریٹ گیم میں ہندوستان کا کردار

گریٹ گیم سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے آغاز سے اس کے سقوط تک (۱۸۲۵ء تا ۱۹۲۳ء) جاری رہی۔ اس پورے دور میں برطانیہ کا کردار فیصلہ کن رہا۔ اس کردار کی بنیادی وجہ برطانیہ کا ہندوستان پر قبضہ تھا۔ ہندوستان نے برطانیہ کو وہ افرادی قوت اور وسائل فراہم کر دیے جس سے برطانیہ میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ وہ گریٹ گیم میں سلطنتِ عثمانیہ کو شکست دے کر امتِ مسلمہ کے ٹکڑے کر دے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ہندوستان کے اس کردار کا جائزہ لیں۔ اس لیے ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم ہندوستان پر برطانیہ کے قبضے اور گریٹ گیم کی تاریخ کو ساتھ ساتھ لے کر چلیں تاکہ قارئین کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجارتی دور

یورپی ممالک میں سب سے آخر میں ہندوستان آنے والا ملک برطانیہ تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں ملکہ برطانیہ 'الزبتھ اول' نے برطانیہ کی 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کو ہندوستان میں تجارت کی منظوری دی۔ ۱۶۱۲ء میں کمپنی نے 'بادشاہ جہانگیر' سے اجازت لے کر ہندوستان میں اپنی تجارت کا آغاز کر دیا۔ کمپنی کے اس دور کو 'تجارت کا دور' بھی کہتے ہیں۔ کمپنی نے بہت معمولی سطح سے تجارت کا آغاز کیا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اس کا یہ کاروبار مدراس، بمبئی اور بنگال تک پھیل گیا۔ ان جگہوں پر کمپنی نے اپنی فیکٹریاں لگائیں اور گودام بنائے۔ ان فیکٹریوں اور گوداموں کی حفاظت کے لیے انگریزوں کو چوکیداروں کی ضرورت تھی، اس لیے بادشاہ کی اجازت سے چوکیداروں کی ایک فوج بھرتی کی گئی جنھیں اس زمانے میں 'سیپوئے' (Sepoy) کہا جاتا تھا، جو سپاہی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ہندوستان کے مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ 'پاکستانی فوج' کی تمام یونٹوں اور رجمنٹوں کا آغاز اسی چوکیداروں کی فوج سے ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب کمپنی کے کام میں اضافہ ہو گیا تو انھوں نے کمپنی کو تین خود مختار حصوں میں تقسیم کر دیا، ہر حصے کا نام 'صدارت' (Presidency) رکھا گیا۔ پہلا حصہ 'مدراس کی صدارت' کہلایا جو ۱۶۴۰ء میں خود مختار ہوا، دوسرا حصہ 'بمبئی کی صدارت' کہلایا جو ۱۶۸۷ء میں خود مختار ہوا اور تیسرا حصہ 'بنگال کی صدارت' کہلایا جو ۱۶۹۰ء میں خود مختار ہوا۔ رفتہ رفتہ ان تینوں صدارتوں نے اپنی اپنی فوجوں میں اضافہ کیا اور اپنے قلعوں کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ جوں ہی مغلیہ حکومت کمزور ہوئی، ان صدارتوں نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان پر قبضے کی سازشیں شروع کر دیں جو بالآخر ہندوستان پر انگریزوں کے مکمل قبضے پر ختم ہوئیں۔

مغل سلطنت کا زوال

مغل سلطنت کے زوال کا آغاز ۱۷۰۷ء میں 'اورنگ زیب عالمگیر' رحمہ اللہ کی وفات سے ہوا۔ 'اورنگ زیب' کی وفات کے بعد اس کے بیٹے نااہل ثابت ہوئے جو اس حکومت کو سنبھال نہ سکے اور مغلیہ حکومت کمزور ہوگئی۔ اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ریاستیں جو اس سے پہلے مغل بادشاہ کے تحت تھیں، آہستہ آہستہ خود مختار ہوگئیں اور ان کے گورنر اور والی بادشاہ سے زیادہ طاقتور ہونا شروع ہوگئے۔ ابتداء میں تین ریاستیں سامنے آئیں۔ ان میں جنوب اور وسطی ہند میں 'نواب حیدر آباد دکن' اور 'مرہٹہ' کی ریاستیں جبکہ شمالی ہند میں 'نواب اودھ سعادت الملک' کی ریاست تھی۔ اس دور میں پورے ہندوستان کے عوام میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ وہی شخص نواب یا گورنر مانا جائے گا جسے مغل بادشاہ مقرر کرے گا۔ اس وجہ سے مغل بادشاہ کی مرکزیت برقرار رہی، البتہ اس طرح ہندوستان کی سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا اور وہ یہ کہ ہر ریاست مغل دربار میں اپنا اپنا اثر بڑھانے میں لگ گئی۔ مغل دربار کا سب سے بڑا عہدہ 'امیر الامراء' کا عہدہ تھا۔ اب اس عہدے کو حاصل کرنے کے لیے ان ریاستوں کے درمیان سیاسی کشمکش شروع ہوگئی۔ امیر الامراء بننے کی کشمکش اور اپنی اپنی ریاست کو بڑھانے کی اس سیاست نے مغل بادشاہ کو مزید کمزور کر دیا۔ اسی دوران اس سیاسی کشمکش میں ایک اور امیدوار کا اضافہ ہوگیا۔ یہ ریاست روہیل کھنڈ کے پٹھان 'نجیب الدولہ' اور 'حافظ رحمت خان' تھے۔ دہلی کے ارد گرد جاٹ قوم نے طاقت پکڑلی اور 'سورج مل' کی قیادت میں دہلی کے آس پاس کے علاقے میں انھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔

۱۷۳۷ء میں مرہٹوں نے دہلی پر حملہ کر دیا، شاہی خزانے کو لوٹا، بادشاہ سے اپنا ٹیکس معاف کرایا اور چلے گئے۔ ابھی دہلی اس حملے سے سنبھل نہ پایا تھا کہ ایران کا بادشاہ 'نادر شاہ' ۱۷۳۸ء میں دہلی پر حملہ آور ہوگیا۔ اس نے لاکھوں افراد کو قتل کیا، شاہی خزانے کو لوٹا اور شاہ جہاں کا تخت اپنے ساتھ لے گیا۔ واپس جاتے جاتے لاہور تک کا ہندوستانی علاقہ ایران میں شامل کر دیا۔ یوں مرہٹوں اور نادر شاہ کے حملوں نے مغل بادشاہ کو بالکل ہی کمزور کر دیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے کارہائے نمایاں

یہ وہ سیاسی حالات تھے جب ۱۷۰۳ء میں اسلام کا وہ بطلِ عظیم پیدا ہوا جسے تاریخ 'شاہ ولی اللہ محدث دہلوی' رحمہ اللہ کے نام سے جانتی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ جوانی میں حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ بچپن سے جوانی تک آپ نے دہلی کے حالات کا خود مشاہدہ کیا۔ ان حالات کو دیکھ کر

کوئی عالمِ ربانی خاموش تماشائی بنا رہے، یہ ممکن نہ تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ہندوستان کے حالات دیکھ کر میدانِ عمل میں اترے اور آپ نے جامع حکمت عملی تجویز کی جس کے دو بنیادی نکات تھے۔ آپ کی حکمت عملی کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی طاقت کمزور نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مغل بادشاہت کو...... گو اس زمانے میں وہ بہت سی غیر شرعی کمزوریوں میں مبتلا تھی مگر مسلمانانِ ہند کی مرکزیت کا نشان ضرور تھی...... کسی نہ کسی طرح اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک کوئی معیاری شرعی قیادت میسر نہ آجائے۔آپ کی حکمتِ عملی کا دوسرا نکتہ یہ تھا کہ ہندوستان کے نظام کو مکمل طور پر تبدیل کیا جائے اور اسے شریعت کے تابع کیا جائے۔ پھر چونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ انقلاب ایک دو دن میں نہیں آئے گا، لہٰذا آپ کی تجویز تھی کہ اس انقلاب کے لیے پہلے مرحلے میں علماء کا ایک ایسا گروہ تیار کیا جائے جو عوام اور مسلمانوں میں جہاد کی روح اجاگر کرے اور پھر اس جہاد کی بدولت معاشرے میں تبدیلی واقع ہو گی۔

اس حکمتِ عملی پر کام کرنے کے لیے انھوں نے دو گروہوں (حکام اور علماء) پر علیحدہ علیحدہ کام کا آغاز کیا۔ اپنی حکمتِ عملی کے پہلے نکتے پر عمل درآمد کے لیے انھوں نے روہیلہ سردار 'نجیب الدولہ' کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ افغانستان کے حکمران 'احمد شاہ ابدالی' کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دے تاکہ مرہٹوں اور جاٹوں کی قوت کو ختم کیا جاسکے۔اس سے مغل باشاہ کو طاقتور ہونے کا موقع مل جائے گا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے خود بھی احمد شاہ ابدالی کو خط لکھے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور نجیب الدولہ کی کوششوں سے ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کی فوج نے 'پانی پت' کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کی فوج کو عبرت ناک شکست دی۔ اس طرح وسطی اور مغربی ہند میں ان کا زور ختم ہو گیا۔ بڑھتے بڑھتے احمد شاہ ابدالی دہلی پہنچا اور اس نے مغل بادشاہ 'شاہ عالم ثانی' کو دہلی بلایا جو اس وقت الہ آباد میں تھا، تاکہ وہ دہلی میں متمکن ہو۔ مغل بادشاہ کی حکومت کے مستحکم ہونے کا یہ آخری موقع تھا، لیکن افسوس کہ بادشاہ دہلی نہ آیا اور یوں یہ تاریخی موقع ضائع ہو گیا۔

بنگال پر انگریزوں کا قبضہ

عین اسی وقت جب حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور نجیب الدولہ مرہٹوں اور جاٹوں کا زور توڑنے کے لیے جہاد میں مصروف تھے، دہلی اور پانی پت کے میدانوں سے بہت دور بنگال میں ہندوستان کی سیاست نے ایک اور کروٹ بدلی۔ انگریز جو تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے، انھوں نے بادشاہ سے بنگال کا ٹیکس معاف کرا لیا اور ساتھ ہی کلکتہ کے قلعہ میں توپوں اور اپنی فوج میں اضافہ کرنے کی اجازت بھی حاصل کر لی۔ تاہم بنگال کے نواب 'سراج الدولہ' کو بادشاہ کے یہ اقدام پسند نہ آئے۔ سراج الدولہ نے انگریزوں کو ان احکامات پر عمل

درآمد سے منع کر دیا، مگر انگریزوں نے سراج الدولہ کے اس حکم کی پرواہ نہ کی۔اس پر سراج الدولہ نے کلکتہ میں انگریزوں کے قلعہ 'فورٹ ولیم' (Fort William) پر حملہ کر دیا اور وہاں پر موجود تمام انگریزوں کو قیدی بنا کر 'مرشد آباد' لے آیا۔'لارڈ کلائیو' (Robert Clive) جو مدراس کی فوج میں کلرک کے طور پر بھرتی ہوا تھا، اب ترقی کرتا ہوا کرنل کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ وہ ان قیدیوں کو چھڑوانے کے لیے مدراس سے تین ہزار کی فوج لے کر نکلا۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ وہ اس فوج سے بنگال کی فوج کو شکست نہیں دے سکتا، چنانچہ اسے ایک غدار کی ضرورت تھی اور وہ غدار 'میر جعفر' کی شکل میں اسے مل گیا۔ کلائیو نے اسے لالچ دی کہ اگر وہ سراج الدولہ کی جگہ انگریزوں کی مدد کرے تو وہ اسے بنگال کا نواب بننے میں مدد دیں گے جسے میر جعفر مان گیا۔

۱۷۵۷ء کو 'پلاسی' (Plassey) کے مقام پر انگریز فوج اور سراج الدولہ کی فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ جنگ کے فیصلہ کن لمحے میں جب سراج الدولہ نے میر جعفر کی گھڑ سوار فوج کو حملہ کرنے کا حکم دیا تو یہ غدار حملہ کرنے کی بجائے اپنی فوج کو لے کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔ سراج الدولہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ یہ صورتحال دیکھ کر سراج الدولہ خود فرار ہو گیا، مگر بعد میں اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا کر اس پر بھاری جنگی تاوان عائد کر دیا جو وہ نہیں ادا کر سکتا تھا۔اس نے تاوان کی ادائیگی کے لیے عوام پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے جس کے نتیجے میں بنگال میں تاریخ کا بدترین قحط پڑا اور لاکھوں لوگ مر گئے۔ عوام مر رہے تھے اور میر جعفر ٹیکس میں اضافہ کر رہا تھا، جس سے عوام میر جعفر کے خلاف ہو گئے۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے داماد 'میر قاسم' نے اس کا تختہ الٹ دیا اور خود بنگال کا نواب بن گیا۔ میر جعفر بھاگ کر انگریزوں سے مدد کا طالب ہوا۔ اس کے مقابلے میں میر قاسم نے نواب اودھ اور بادشاہ شاہ عالم ثانی سے مدد مانگی۔

۱۷۶۴ء میں 'بکسر' (Buxar) کے میدان میں شاہ عالم اور انگریزوں کی فوج کا مقابلہ ہوا۔ شاہ عالم کو بکسر کے میدان میں شکست ہوئی۔ پھر انگریزوں اور مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں بادشاہ نے انگریزوں کو بنگال کا دیوان عطا کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریز اب بنگال کے حکمران بن گئے۔ جنگِ بکسر نہ صرف ہندوستان کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ ہے بلکہ یہ مغرب کے عروج کے لیے بھی ایک مضبوط سیڑھی ثابت ہوئی۔

جنگِ بکسر کے بعد ہندوستان کے حالات

جنگِ بکسر کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بنگال کا حکمران بننے کا مطلب یہ تھا کہ اب انگریز اپنا قانون نافذ کرنے، لوگوں کو سزائیں دینے، آزادانہ تجارت کرنے اور ٹیکس وصول کرنے کے مجاز تھے۔ اس سے قبل بنگال میں شریعت نافذ تھی اور اسی کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ بنگال کی تجارت کے تمام اصول مقامی باشندوں کے فائدے کے لیے بنائے گئے تھے۔ ان قوانین سے انگریزوں کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ سب کچھ تبدیل کر دیا اور بنگال میں بالفعل اپنی حکومت قائم کرلی۔ یہ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کا آغاز تھا۔ اب سیاسی طور پر انگریز ہندوستان میں جاری ریاستوں کی جنگ میں ایک فریق بن چکے تھے۔

ہندوستان کے بارے میں انگریزوں کا منصوبہ

انگریزوں نے ہندوستان میں کبھی بھی ہندوستانی بن کر رہنا (یعنی ہمیشہ کے لیے رہنا) منظور نہ کیا۔ اگر کبھی کیا بھی تو ہندوستان میں موجود جہادی تحریکوں نے انھیں ہمیشہ اس بات کا احساس دلایا کہ ایک نہ ایک دن انھیں ضرور اس ملک کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے ان کا مقصد یہی رہا تھا کہ ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لیا جائے۔ ہندوستان سے متعلق انگریزوں کا اصل منصوبہ یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے ہندوستان سے خام مال کو برطانیہ منتقل کر دیا جائے اور وہاں کی صنعت کو ترقی دی جائے، پھر اس مال کو دنیا کی منڈیوں میں فرخت کیا جائے۔ اس طرح ہندوستان کی اجارہ داری ختم کر کے برطانیہ کی اجارہ داری قائم کی جائے۔ وہ یہ بات بھی جانتے تھے کہ جب وہ یہ کام کریں گے تو اس سے ہندوستان کی صنعت تباہ ہو جائے گی اور ہندوستان میں ان کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا ہونے کا خطرہ ہو گا۔ دوسری طرف انگریز یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اب ہندوستان کی سیاست میں دو گروہ بن گئے ہیں؛ ایک انگریزوں کا حامی اور دوسرا ان کا مخالف۔ انگریزوں کے حامی گروہ میں نواب کرناٹک محمد علی والا جاہ، نظام حیدر آباد دکن، نواب اودھ شجاع الدولہ اور اس کا بیٹا واجد علی خان تھے۔ جبکہ انگریز مخالف گروہ میں نواب میسور حیدر علی، اس کا بیٹا ٹیپو سلطان، نواب روہیل کھنڈ نجیب الدولہ اور مرہٹے شامل تھے، گو مرہٹے انگریزوں کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ میسور اور روہیل کھنڈ کی ریاستوں کے بھی دشمن تھے۔

ہندوستان میں انگریز فوج کی تشکیل

ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں کے اس وقت کے جرنیلوں 'لارڈ کلائیو' اور 'وارن ہاسٹنگ' (Warren Hastings) نے فیصلہ کیا کہ انھیں ایک ایسی فوج کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے عام

معاشرے سے بہت مضبوط ہو اور اس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ کسی مذہب کی بنیاد کے بغیر جنگ کر سکے اور اپنی جان قربان کر سکے۔ ان سپاہیوں میں یہ صلاحیت ہی نہ ہو کہ وہ یہ بات سوچ سکیں کہ انگریز کوئی قانون تبدیل کر رہے ہیں تو کیوں کر رہے ہیں؟ اس قانون کی تبدیلی سے انگریزوں کو کیا فائدہ ہو گا اور اس سے ہندوستان کو کیا نقصان ہو گا؟ ان سپاہیوں کو صرف اس بات سے غرض ہو کہ اس خدمت کے عوض ان کو ملے گا کیا؟

اس کے ساتھ ساتھ ان سپاہیوں میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ انگریزوں کے وفادار رہیں۔ کسی دینی تصور کے بغیر جنگ کیسے ہو؟ اور انگریزوں کو مقامی لوگوں کی وفاداری کیسے حاصل ہو؟ ان سوالوں کا جواب انگریزوں کے پاس یہ تھا کہ اگر ایک سپاہی انگریز کا وفادار رہے گا تو اسے فوج میں ترقی ملے گی یعنی فوجی کیریئر ملے گا۔ اسی کو پیشہ ور سپاہی کہتے ہیں۔ درست الفاظ میں انھیں 'کرائے کے قاتل' کہا جاتا ہے اور یہی 'پاکستانی فوج' کی فکری بنیاد ہے۔ انگریزوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وفادار رکھنے کے لیے لارڈ کلائیو اور وارن ہاسٹنگ نے جو نظریہ دیا، اس کا نام 'وفاداری کے بدلے زمین' رکھا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انگریز کے ساتھ وفاداری کرنے والے کو بڑی بڑی جاگیریں دی جائیں گی۔ اس طرح ایک ایسا طبقہ خود بخود وجود میں آ جائے گا جو نہ صرف انگریزوں کا وفادار ہو گا بلکہ اس کی فوج کو مستقل افرادی قوت فراہم کرے گا۔

یہ وہ فکری بنیادیں تھیں جن کی اساس پر ایسٹ انڈیا کمپنی میں موجود گوداموں اور ساحلوں پر کمپنی کی املاک کی حفاظت کرنے والے مقامی چوکیداروں کو تین صدارتی فوجوں میں تبدیل کیا گیا۔ یہ تین فوجیں 'بنگال کی فوج'، 'مدراس کی فوج' اور 'بمبئی کی فوج' کہلائیں۔ ان تینوں فوجوں کو پیادہ، گھڑ سوار اور توپ خانہ کے دستوں سے لیس کیا گیا۔ آغاز میں انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ ہر علاقے میں وہاں کے مقامی لوگوں کو بھرتی کیا جائے۔ اس لیے بنگال کی فوج میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کے مسلمان اور برہمن ہندو شامل تھے۔ اسی طرح مدراس کی فوج میں جنوبی ہند کے ہندو اور مسلمان شامل تھے جبکہ بمبئی کی فوج میں مرہٹہ، سندھی اور بلوچی نسل کے مسلمان اور ہندو شامل تھے۔

مدراس کی فوج نے پلاسی، بکسر اور ٹیپو سلطان کے خلاف جنگوں میں انگریز کی فتح میں اہم کردار ادا کیا۔ بنگال کو فتح کرنا اور ٹیپو سلطان کو شکست دینا مدراس کی فوج ہی کا کارنامہ تھا۔ ۱۷۵۹ء میں ساحل کی حفاظت کے لیے مدراس کی فوج میں تین بٹالین بنائی گئیں جو اس تنظیم نو کے بعد مدراس کی مقامی پیادہ فوج بن گئی۔ ۱۷۹۸ء میں 'مسولی پٹم' میں ایک اور بٹالین بنائی گئی جسے 'میکلوڈ کی پلٹن' کہا جاتا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران فوجی بغاوت کے بعد انگریزوں نے 'رائل انڈین آرمی' (شاہی ہندی فوج) کے نام سے فوج کی از سرِ نو تشکیل کی اور ساحلی بٹالینوں میں مدراس کے مقامی باشندوں کی بجائے پنجابی اور پٹھان شامل کر لیے۔ ۱۹۰۳ء میں 'لارڈ کچنر' (Herbert Kitchener) نے رائل انڈین آرمی کی تنظیم نو کی اور اس کے تحت ان ساحلی رجمنٹوں کو پنجاب بٹالین اور پٹھان بٹالین میں تبدیل کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں رائل انڈین آرمی کی دوسری تنظیمِ نو میں ان پنجابی اور پٹھان بٹالینوں کو ملا کر 'پہلی پنجاب رجمنٹ'، 'دوسری پنجاب رجمنٹ'، 'آٹھویں پنجاب رجمنٹ'، 'چودھویں پنجاب رجمنٹ'، 'پندرہویں پنجاب رجمنٹ' اور 'سولہویں پنجاب رجمنٹ' بنادی گئیں۔ دوسری طرف 'میکلوڈ کی پلٹن' کو بمبئی کی بلوچ بٹالینوں کے ساتھ ملادیا گیا اور ۱۹۲۲ء کی تنظیمِ نو میں ان بلوچ بٹالینوں کو 'دس بلوچ رجمنٹ' بنادیا گیا۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستانی فوج کی تشکیل اس طرح ہوئی کہ مذکورہ بالا میں سے پہلی، چودھویں، پندرہویں اور سولہویں پنجاب رجمنٹوں کو ملا کر پاکستان کی 'پنجاب رجمنٹ' جبکہ دس بلوچ اور آٹھویں پنجاب رجمنٹ کو ملا کر پاکستان کی 'بلوچ رجمنٹ' بنادی گئی۔ اس طرح پاکستان کی پنجاب رجمنٹ کا جنم انگریزوں کی مدراس کی فوج سے ہوا اور بلوچ رجمنٹ کا جنم مدراس اور بمبئی کی فوجوں سے ہوا۔[40]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگال کی فوج کی اہمیت زیادہ ہو گئی۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بنگال کی فوج نے بہار، اڑیسہ، اودھ، دہلی اور پنجاب کی فتح میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ بنگال ہی کی فوج تھی جس نے ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی تھی مگر اسی فوج کے دوسرے حصے نے ... جسے 'گائیڈ کی کور' کہا جاتا تھا... انگریزوں کے ساتھ مل کر اس بغاوت کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی 'گائیڈ کی کور' ہے جس سے پاکستان فوج کی 'فرنٹ ائیر فورس رجمنٹ' نے جنم لیا۔ بمبئی کی فوج نے سندھ اور بلوچستان کی فتح میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کی ٹینکوں کی فوج... جسے فوجی اصطلاح میں 'آرمرڈ کور' کہتے ہیں... کی تمام رجمنٹیں بمبئی، بنگال اور مدراس کی گھڑ سوار بٹالینوں سے بنی ہیں۔

[40] اس حوالے سے مزید گفتگو ص ۲۰۱ پر عنوان 'تاجِ برطانیہ کا راج اور رائل انڈین آرمی کی تشکیل اور ص ۲۱۲ پر 'رائل انڈین آرمی کی تنظیمِ نو' کے تحت کی گئی ہے، وہاں ملاحظہ ہو۔

انگریزوں کی روہیل کھنڈ کی فتح

۱۷۷۲ء میں مرہٹوں نے روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔ حافظ رحمت خان نے شجاع الدولہ کی مدد سے مرہٹوں کو شکست دے دی۔ شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خان کے درمیان جنگ کے واجبات کی ادائیگی پر اختلاف ہو گیا۔ ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں حافظ رحمت خان شہید ہوگئے اور روہیل کھنڈ کو انگریزوں اور شجاع الدولہ نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ اس طرح شمالی ہند میں مسلمانوں کی امید کا آخری چراغ بھی بجھ گیا۔

انگریزوں کی ریاستِ میسور سے جنگ

روہیل کھنڈ کے بعد اب پورے ہندوستان میں صرف جنوبی ہند کی ریاستِ 'میسور' (Mysore) کے حکمران 'حیدر علی' اور آپ کے بیٹے 'فتح علی ٹیپو' مسلمانانِ ہند کی امید کا آخری سہارا رہ گئے تھے۔ لیکن نہ صرف انگریز بلکہ مرہٹے اور نظام حیدر آباد بھی میسور کی زرخیز زمین کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ۱۷۶۳ء میں نظام حیدر آباد نے انگریزوں کے ساتھ باہمی تعاون کا معاہدہ کیا۔ ستمبر ۱۷۶۶ء میں اس معاہدے کے تحت انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ ملا کر میسور پر حملہ کر دیا۔ یوں 'انگریز میسور جنگوں' (Anglo-Mysore Wars) کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلی جنگ میں حیدر علی نے انگریزوں کے اس اتحاد کو عبرت ناک شکست دی۔ اپریل ۱۷۶۹ء کو انگریزوں اور حیدر علی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے میں ایک دوسرے کے علاقے پر حملہ نہ کرنے کا عہد کیا گیا اور مشکل میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ ۱۷۸۰ء کو 'دوسری انگریز میسور جنگ' ہوئی جو چار سال جاری رہی۔ اس جنگ میں انگریزوں کو ایک دفعہ پھر عبرت ناک شکست ہوئی۔ اس جنگ کے دوران حیدر علی بیماری کے سبب فوت ہوگئے۔ حیدر علی کے انتقال کے بعد آپ کے بیٹے ٹیپو سلطان نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ ۴ اپریل ۱۷۸۴ء کو ٹیپو سلطان اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس پر انگریزوں نے انتہائی ذلت آمیز شرائط پر دستخط کیے۔ انگریزوں کے اس وقت کے گورنر 'وارن ہاسٹنگ' نے اس معاہدے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ 'یہ معاہدہ انگریزوں کے لیے ذلت آمیز ہے اور جب تک ٹیپو سلطان زندہ ہے، اس وقت تک انگریز ہندوستان فتح نہیں کر سکتا'۔

۱۷۸۹ء میں ٹیپو سلطان نے 'ٹریوی کور' پر حملہ کر دیا۔ ٹریوی کور کا راجہ انگریزوں کا ساتھی تھا۔ انگریز بھی اس جنگ میں کود پڑے۔ یہ 'تیسری انگریز میسور جنگ' تھی جو تین سال جاری رہی۔ ۱۷۹۲ء میں انگریزوں اور ٹیپو سلطان کے درمیان سرنگاپٹم کے مقام پر ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے بعد انگریز اس نتیجے پر پہنچے کہ ٹیپو

سلطان کو شکست دینے کے لیے انھیں میسور کی فوج میں ایک غدار کی ضرورت ہے، اور بالآخر انھیں وہ غدار مل گیا۔ وہ غدار میسور کا نائبِ سلطنت 'میر صادق' تھا۔ ۱۷۹۸ء میں 'چوتھی انگریز میسور جنگ' شروع ہوئی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم کی جنگ میں میر صادق نے غداری کرتے ہوئے انگریزوں کو سرنگاپٹم کے قلعے کے کمزور حصے کی نہ صرف نشان دہی کر دی بلکہ تنخواہ وصول کرنے کے بہانے وہاں ڈیوٹی پر موجود سپاہی بھی ہٹا دیے۔ انگریز فوج قلعہ میں داخل ہوگئی۔ ٹیپو سلطان نے قلعہ سے نکل کر حملہ کر دیا۔ جب اس سے ہتھیار ڈالنے کا کہا گیا تو اس نے جواب دیا کہ 'شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'۔ ٹیپو سلطان شہید ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانانِ ہند کی امید کا آخری ستارہ بھی ڈوب ہو گیا، انااللہ وانا الیہ راجعون!

اٹھارویں صدی عیسوی جس کا آغاز ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر کی مضبوط حکومت کی شکل میں ہوا تھا، اس کا اختتام شمالی ہند میں حافظ رحمت خان کی شہادت اور روہیلہ قوت کے خاتمے اور جنوبی ہند میں ٹیپو سلطان کی شہادت اور میسور کی حکومت کے خاتمے پر ہوا۔ ریاستوں کے وہ نواب جنھوں نے امیر الامراء بننے اور اپنی اپنی ریاستوں کو وسعت دینے کی خاطر انگریزوں کا ساتھ دیا، ایک ایک کر کے انگریزوں کے غلام بن گئے۔ مغل بادشاہ 'شاہ عالم ثانی' اب انگریزوں کا وظیفہ خوار بن گیا۔ نواب حیدر آباد دکن، نواب اودھ اور مرہٹہ قوت اب مکمل طور پر انگریزوں کے سامنے تسلیم ہو چکے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی کا آغاز ہو چکا تھا، ہندوستان کے سیاسی حالات نے ایک اور کروٹ بدلی۔ اب بنگال سے لے کر ستلج تک اور مدراس سے لے کر بمبئی تک بالواسطہ یا بلاواسطہ انگریزوں کی عمل داری قائم ہو چکی تھی۔ دوسری طرف مغربی اور شمال مغربی ہند میں رنجیت سنگھ نے سکھوں کی حکومت قائم کرلی تھی جس میں پنجاب، کشمیر، ہزارہ، پشاور، مردان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے شامل تھے۔ مسلمانانِ ہند کی کوئی مؤثر طاقت باقی نہ رہی تھی۔ دہلی میں حکومت بادشاہ کی اور حکم کمپنی کا چل رہا تھا۔ ان حالات کا جائزہ دہلی میں موجود علماء کا ایک گروہ اپنے بوڑھے قائد کی قیادت میں بڑی گہری نگاہ سے کر رہا تھا۔ یہ بوڑھا قائد عالمِ ربانی 'شاہ ولی اللہ' رحمہ اللہ کا عالمِ ربانی فرزند 'شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' رحمہ اللہ تھے، جو گزشتہ نصف صدی سے اپنے والد کے افکار کے مطابق مجاہدین کی ایک ایسی فوج کی تیاری میں مصروف تھے جو اٹھے اور ایک طرف جہاد اور قتال کرتے ہوئے انگریزوں اور سکھوں کی طاقت کا مقابلہ کرے، دوسری طرف معاشرے کی اصلاح کرتے ہوئے تمام شرک وبدعت اور فرسودہ رسومات کو ختم کرے اور تیسری طرف وہ مسلمانوں کی مفاد پرست سیاسی قیادت ......جسے شاہ صاحب سلاطینِ ضلالہ اور سلاطینِ کفریہ قرار دیتے تھے اور جو اپنے اپنے ذاتی مفادات کے لیے کفار

کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑ رہی تھی...... ختم کر کے اس کی جگہ 'خلافت علیٰ منهاج النبوة' کی طرز پر حکومت کا قیام کر سکے۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کا فتویٰ (۱۸۰۶ء)

امام شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ نے نئی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ۱۸۰۶ء میں ایک اہم فتوی صادر کیا جس نے ہندوستان کی شرعی حیثیت کے تبدیل ہونے کا اعلان کیا۔آپ نے اس فتویٰ میں ہندوستان کو دار الاسلام کے بجائے دار الحرب قرار دے دیا۔آپ نے حالات کو صحیح تناظر میں سمجھا،اسے شریعت کی میزان میں تولا اور بغیر کسی لیت و لعل اور بغیر کسی ڈر اور خوف کے شریعت کی منشاء کو بیان کر دیا۔ پھر صرف یہی نہیں کہ آپ نے علمی سطح پر فتوی دینے پر اکتفا کیا بلکہ فتوے کی روشنی میں جو حکمِ شرعی واضح ہوا،اس کی تکمیل کے لیے منصوبہ بندی بھی کی اور عملی اقدام بھی کیے۔

شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ کا فتوی حسبِ ذیل تھا:

[سوال یہ ہے کہ کیا دار الاسلام دار الحرب ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اس کا جواب دیتے ہوئے آپ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

معتبر کتابوں میں اکثر یہی روایت اختیار کی گئی ہے کہ جب تین شرطیں پائی جائیں تو دار الاسلام دار الحرب بن جاتا ہے۔

'الدر المختار' میں ہے:

''دار الاسلام دار الحرب نہیں ہو سکتا مگر جب تین امور پائے جائیں؛

۱۔ وہاں مشرکین کے احکام جاری ہو جائیں

۲۔ دار الاسلام دار الحرب سے مل جائے

۳۔ وہاں کوئی مسلمان امن میں نہ رہے اور نہ وہاں ایسا کوئی کافر ذمی رہ جائے جو پہلے مسلمانوں سے پناہ لے کر رہا اور اب بھی اسی کی پناہ کی وجہ سے ہو۔

اور دار الحرب اس حالت میں دار الاسلام ہو جاتا ہے کہ اہل اسلام کے احکام اس میں جاری ہو جائیں۔''

اور 'الكافي' میں لکھا ہے :

''دار الاسلام سے مراد وہ شہر ہیں جن میں مسلمانوں کے امام کا حکم جاری ہو اور وہ شہر اس کے زیر حکومت ہوں۔ اور دار الحرب سے وہ شہر مراد ہیں جن میں کافروں کے سردار کا حکم جاری ہو اور وہ اس کے زیرِ حکومت ہوں۔''

(پھر شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:)

اس ملک (ہندوستان) میں مسلمانوں کے امام کا حکم ہر گز جاری نہیں، نصرانی حکام کا حکم بے دغدغہ جاری ہے۔ اور احکامِ کفر کے جاری ہونے سے مراد ہے کہ مقدماتِ ملک، انتظامِ سلطنت، بندوبستِ رعایا، تحصیلِ خراج و باج و عشر اور اموال تجارت میں کافر حکام بطور خود حاکم ہوں اور ڈاکوؤں، چوروں کی سزا، رعایا کے باہمی معاملات اور جرموں کی سزا کے مقدمات میں کفار کا حکم جاری ہو۔

اگرچہ بعض احکامِ اسلام مثلاً جمعہ و عیدین و اذان و گاؤکشی میں کفار تعرض نہیں کرتے لیکن ان چیزوں کا اصلِ اصول ان کے نزدیک بے فائدہ ہے۔ لیکن مسجدوں کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں، جب تک اجازت نہ دیویں کوئی مسلمان اور کافر ذمی ان اطراف میں نہیں آ سکتا۔ مصلحتاً واردین، مسافرین اور تاجروں سے مخالفت نہیں کرتے، (لیکن) دوسرے امراء مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم بلا اجازت ان کے شہروں میں نہیں آ سکتے، اور اس شہر (دہلی) سے کلکتہ تک ہر جگہ نصاریٰ کا عمل ہے۔ گو اپنے دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنؤ اور رام پور میں ان کا حکم جاری نہیں کیونکہ ان مقامات کے والیانِ ملک نے ان سے صلح کر لی اور ان کی فرماں برداری منظور کر لی۔

احادیث اور صحابہ کرام اور خلفائے عظام کی رائے سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے (کہ ہندوستان ان حالات میں دار الحرب ہے)، کیونکہ حضرت صدیقِ اکبر کے زمانے میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ بنی یربوع دار الحرب ہے حالانکہ جمعہ اور عیدیں اور اذان اس جگہ جاری تھی مگر وہاں کے لوگوں کو حکمِ زکوٰۃ سے انکار تھا۔ اور ایسا ہی اس کے اطراف و جوانب کے بارے میں یہ حکم تھا کہ دار الحرب ہے حالانکہ ان شہروں میں مسلمان بھی تھے۔ علی ھذا القیاس خلفائے کرام کے زمانے میں یہی طریقہ جاری رہا بلکہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے زمانے میں یہ حکم فرمایا تھا کہ فدک اور خیبر دار الحرب ہے، حالانکہ ان مقامات میں اہلِ اسلام کے تجار بلکہ وہاں کے بعض باشندے بھی مسلمان تھے اور فدک و خیبر مدینہ منورہ سے نہایت متصل تھا۔] (فتاویٰ عزیزی، جلد اول، ص ۳۵)

فتویٰ کے اثرات

شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ کے اس فتویٰ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو دو طرح سے راہنمائی فراہم کی۔ پہلی راہنمائی اس فتویٰ کے متن نے فراہم کی کہ اب ہندوستان کی حالت بدل گئی ہے اور وہ دار الاسلام سے دار الحرب بن چکا ہے اور دوسری راہنمائی اس فتویٰ کی روشنی میں وہ عملی اقدام فراہم کرتا ہے جو حضرت شاہ صاحب نے جہاد کو منظم کرنے کے لیے کیا، یعنی اس دار الحرب کو دوبارہ دار الاسلام بنانے کے لیے عملی جد وجہد کا آغاز۔ مسلمانانِ برصغیر کے اس دورِ زوال میں حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ کا یہ فتویٰ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے نزدیک آج بھی اس فتویٰ کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ اس دور میں تھی۔ اس فتویٰ نے شریعت کی بنیاد پر سیاسی اور فکری جہت متعین کی ہے۔ اس فتویٰ کی اہمیت کی بنا پر ہم یہاں اس سے اخذ شدہ افکار کو نکات کی شکل میں مزید وضاحت کی خاطر بیان کرتے ہیں۔

- اس فتویٰ کی پہلی راہنمائی اس وقت کے ہندوستان کے حالات کا شرعی تجزیہ کرنا ہے کہ جن کی وجہ سے اس فتویٰ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس فتویٰ کے جاری کرنے کے وقت ہندوستان کا مغل بادشاہ تو مسلمان ہی تھا مگر مشرقی ہند سے لے کر وسطی ہند تک یعنی بنگال، بہار اور اڑیسہ مکمل طور پر انگریز کے قبضے میں تھے اور وسطی ہند کی اکثر ریاستوں نے ان کے ساتھ صلح کر رکھی تھی۔ حضرت شاہ صاحب بھی ہندوستان میں انہی دو قسم کے علاقوں کا ذکر فرماتے ہیں؛ ایک وہ علاقے جو کفار کے بالواسطہ قبضے میں ہیں اور دوسرے وہ جو بلا واسطہ قبضے میں ہیں۔ پھر ان دونوں قسم کے علاقوں کو وہ انگریزوں کے قانون کے نفاذ کی وجہ سے دار الحرب ہی قرار دیتے ہیں۔ یہ تفصیل آج کے حالات میں بھی ہمارے لیے راہنما ہے۔
- اس فتویٰ میں شاہ صاحب نے انگریزوں کو امتِ نصاریٰ کہا اور انھیں ہندوستان میں مسلمانوں کا دشمن قرار دیا۔ اس طرح حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ نے اللہ کے لیے دوستی اور اللہ کے لیے دشمنی کا معیار قائم کرنے کی طرف راہنمائی فرمائی، جسے عقیدہ الولاء والبراء[41] کہا جاتا ہے۔ یہ وہ عقیدہ تھا جو

---

[41] اس کے لیے شریعت میں الحب في الله والبغض في الله کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، جبکہ ہمارے برصغیر میں اسے موالات ومعادات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے رب، اپنے رسول اور تمام اہلِ ایمان کے ساتھ... عقیدۂ توحید کی بنا پر... دوستی، محبت اور نصرت کا تعلق رکھتا ہے، جبکہ کافروں کے ساتھ اس کا تعلق نفرت، بغض اور عداوت کا ہوتا ہے۔ یہ عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضہ ہے۔ (م ح)

گزشتہ ایک صدی میں مسلمانانِ ہند کے حکمرانوں اور عوام میں کمزور پڑ چکا تھا اور اسی وجہ سے مسلمان انگریز کفار کے ساتھ مل کر اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگ و جدل میں مصروف تھے۔

- مسلمانانِ ہند کی تیسری راہنمائی جو شاہ صاحب کے اس فتویٰ میں موجود ہے، وہ یہ ہے کہ کفار کی فرمانروائی کو ہرگز قبول نہ کیا جائے، اور یہ کہ وہ مسلم خطہ جہاں کفار قابض ہو جائیں دارالحرب بن جاتا ہے، چاہے اس خطے میں بعض اسلامی شعائر ادا کیے جاتے ہوں اور وہاں کے بعض سربراہان نام کے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ تو وہ نکتے تھے جو اس فتوے کے اندر موجود ہیں، ان کے علاوہ چند نکات ان تاریخی حقائق سے معلوم ہوتے ہیں جو اس فتویٰ کے نتیجے میں رونما ہوئے اور جن کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کر رہے ہیں۔

شاہ صاحب کا فتویٰ اور برصغیر کا شجرِ جہاد (تحریکِ آزادی کا آغاز)

مؤرخینِ ہند کا اس پر اتفاق ہے کہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کا فتویٰ دراصل ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کروا کے اللہ کے دین کو غالب کرنے کی بنیاد تھا اور اس شجرِ سایہ دار کی جڑ تھا جس کے سائے تلے ہندوستان کے تمام راسخ العقیدہ مسلمان اپنا ایمان بچانے اور غلبہ دین کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے پناہ لیتے رہے۔ مؤرخین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اس فتویٰ کو مسلمان علماء کے ہر طبقہ میں عام مقبولیت کا درجہ حاصل ہوا اور اس فتویٰ کے جاری ہونے کے بعد مسلمانانِ ہند کی تمام اجتماعی جدوجہد کا مرکز اور محور ہندوستان کی دارالحرب سے دار الاسلام منتقلی تھا۔ اس فتویٰ کو سامنے رکھ کر ہی تحریکِ مجاہدین میں شامل دہلی سے تعلق رکھنے والے علماء سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحیٔ رحمہم اللہ اور پٹنہ سے تعلق رکھنے والے علماء مولانا ولایت علی اور عنایت علی رحمہما اللہ نے جہاد کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران اکابرینِ دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہما اللہ کی کوششیں بھی اسی مقصد کے لیے تھیں۔ عظیم آباد کے علماء مولانا یحییٰ علی، مولانا جعفر تھانیسری اور مولانا احمد علی رحمہم اللہ کی 'انڈیمان' میں قید و بند کی صعوبتیں بھی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر برداشت کی گئیں۔ شمالی قبائل میں ملا صاحب اخوند اور حاجی صاحب ترنگ زئی رحمہما اللہ کی تحریک جبکہ وزیرستان میں ملا پاوندہ اور حاجی مرزا علی خان رحمہما اللہ کی تحریکیں بھی اسی مقصد کے حصول کے لیے تھیں۔ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی تحریکِ شیخ الہند رحمہ اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی تحریکِ ترکِ موالات بھی اسی مقصد کے لیے تھی۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی تحریکِ پاکستان میں شمولیت اور حضرت مدنی رحمہ اللہ کی متحدہ ہندوستان میں رہنے کی رائے؛ دونوں ہی کا

مقصد ہندوستان کو کفار سے نجات دلانے اور اسے دار الاسلام بنانا تھا۔ مسلمانانِ ہند کی اس تمام اجتماعی جدوجہد میں اسی فتویٰ کے متن اور اس کے نتیجے میں ہونے والے عملی اقدام کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عملی جدوجہد

خود حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ نے صرف فتویٰ دینے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ دار الحرب ہندوستان کو دوبارہ دار الاسلام ہندوستان میں تبدیل کرنے کے لیے عملی اقدامات شروع کر دیے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک دار الحرب کو دوبارہ دار الاسلام بنانے کا طریقہ 'اللہ کی راہ میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر جہاد اور قتال کے لیے ہجرت کرنا اور اس جہاد کے لیے تیاری کرنا تھا'۔ سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کی قیادت میں تحریکِ مجاہدین اسی فتویٰ کی عملی شکل تھی۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ اسی فتویٰ کی بنیاد پر بعد میں آنے والے تمام مسلمان گروہوں کی اٹھان ہوئی۔ تمام اسلامی تحریکات اور جماعتوں کے پیچھے یہی بنیادی سوچ تھی کہ ہندوستان میں اغیار کا قبضہ ہو چکا ہے اور اب مسلمانوں کی حکومت دوبارہ بحال کی جانی چاہیے۔ اس اعتبار سے یہ فتویٰ تمام اسلامی تحریکات اور تنظیموں کا نقطۂ اتحاد و محور ارتکاز ہے۔ **'تحریکِ آزادیٔ ہند' کا نقطہ آغاز یہی فتویٰ تھا، نہ کہ سر سید کے نظریات اور کانگرس و مسلم لیگ کا قیام۔**

سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریکِ مجاہدین اور شجرِ جہاد کا آغاز

تحریکِ مجاہدین دراصل علمائے حق اور مجاہدینِ اسلام کی وہ فوج ہے جو قرآن اور سنت کی روشنی حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزند شاہ عبد العزیز رحمہما اللہ کے دیے ہوئے لائحہ عمل کی روشنی میں ہندوستان کو دوبارہ دار الاسلام میں تبدیل کرنے کے لیے اٹھی۔ یہ تحریک برصغیر پاک و ہند سے انگریزوں کو نکالنے اور غلبہ دین کی جدوجہد کا وہ مضبوط تنا ہے جس نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے تمام راسخ العقیدہ مسلمانوں کی فکری راہنمائی کی بلکہ عالمی استعماری طاقتوں کے خلاف جہاد کو کھڑا کیا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے اور قیامِ پاکستان کے بعد پاک و ہند کے راسخ العقیدہ مکاتبِ فکر اسی شجر کی شاخیں ہیں، چاہے وہ مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کا دیوبندی مکتبۂ فکر ہو یا مولانا جعفر تھانیسری رحمہ اللہ کا اہلِ حدیث مکتبۂ فکر اور چاہے وہ قبائل کا انگریزوں کے خلاف جہاد ہو (جو کہ اب تک اسی طرح جاری ہے)۔ ان تمام کی آبیاری قرآن و سنت سے کی گئی ہے اور ان تمام مکاتبِ فکر میں ایک اہم قدرِ مشترک شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ کا مسلّم فتویٰ اور اس کے نتیجے میں دار الحرب کو دار الاسلام میں تبدیل کرنے کا لائحہ عمل ہے۔

سید احمد شہید رحمہ اللہ رائے بریلی کے سید خاندان میں ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے اللہ نے

انھیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ تعلیم کے لیے دہلی میں شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پاس تشریف لائے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس شاگرد میں صلاحیتوں کو دیکھ کر خصوصی نظر فرمائی۔آپ نے جلد ہی علم اور تزکیے کی منزلیں طے کر لیں۔ اپنے اس شاگردِ رشید میں تقوی، پرہیز گاری اور رجوع الی اللہ دیکھ کر شاہ صاحب نے اپنے بھتیجے شاہ اسماعیل شہید اور داماد مولانا عبدالحئ رحمہا اللہ کو اپنی زندگی میں ہی سید احمد شہید رحمہ اللہ سے بیعت کرنے کی ہدایت جاری فرمائی۔ یہ دونوں حضرات خود بھی وقت کے کبار علماء میں شمار ہوتے تھے۔اس طرح اللہ نے ایک ایسا پاکیزہ گروہ پیدا کر دیا جسے مسلمانوں کی راہنمائی کرنا تھی۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ نے اپنے کام کا آغاز دعوت اور تبلیغ سے کیا۔ پورے ہندوستان کے دورے کیے اور لوگوں کو قرآن وسنت، جہاد اور قتال کی دعوت دی۔ ہزاروں مسلمانانِ ہند نے ان کے ہاتھ پر شرک اور بدعت سے توبہ کی اور ہزاروں نے کفار کے ساتھ جہاد کا عہد کیا۔

شجر جہاد کے مراکز اور حلقے

رفتہ رفتہ یہ دعوت پورے ہندوستان میں پھیلنا شروع ہو گئی اور اس کے کئی مراکز قائم ہو گئے۔ان میں سے تین مراکز سب سے بڑے تھے۔پہلا مرکز دہلی میں شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کا مدرسہ رحیمیہ، دوسرا بہار میں صادق پور پٹنہ اور تیسرا مرکز قبائل اور صوبہ سرحد میں تھا۔ دہلی اور پٹنہ کے دونوں مراکز ہندوستان میں جہاد باللسان اور جہاد بالمال یعنی تحریض علی الجہاد اور انفاق فی سبیل اللہ کے تحت اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، جبکہ قبائل میں موجود مجاہدین کے مراکز جہاد بالسیف یعنی عملی جہاد اور قتال میں مصروف تھے۔

دہلی کا مرکز

دہلی کے اس مرکز کے دو ادوار ہیں۔پہلا جہادی دور ہے جو ۱۸۳۱ء میں جنگِ بالاکوٹ سے ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی تک جاری رہا۔اس حلقے نے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نواسے 'شاہ محمد اسحاق' کی قیادت میں اپنا کام پہلے کی طرح جاری رکھا۔یہ مرکز دہلی کی وہی مسجد و مدرسہ تھا جس کے سرپرست شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمہا اللہ ہوا کرتے تھے۔اس حلقے نے مالی امداد بھی جاری رکھی اور مجاہدین کی نئی کھیپ بھی گاہے بگاہے بھیجتا رہا۔ دوسرا علمی دور ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد شروع ہوا۔اس دور میں اس حلقے کی قیادت اکابرینِ دیوبند کے ہاتھ میں آ گئی جنھوں نے علم و عمل کے میدان کو سنبھالے رکھا اور اس کا خوب حق ادا کیا۔

صادق پور پٹنہ کا مرکز

صادق پور کے اس مرکز کی قیادت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے بیعت یافتہ اور مولانا اسحاق رحمہ اللہ کے شاگرد مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی رحمہما اللہ کر رہے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کو سید صاحب نے صادق پور میں رہ کر جہاد کے دعوتی کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ دونوں حضرات معرکہ بالاکوٹ کے وقت موجود نہ تھے، البتہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ۱۸۴۱ء سے ۱۹۰۲ء تک ۶۹ سال کے لیے اسی مرکز نے تحریکِ مجاہدین کی عملی قیادت کی۔ ۱۸۶۳ء کی جنگِ امبیلہ میں شکست کے بعد انگریزوں نے صادق پور پٹنہ کے اس مرکز کے خلاف جھوٹے مقدمات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ بہت سے علماء کو 'کالا پانی' کی سزا کے طور پر 'جزائر انڈمان' (Andaman) بھیج دیا گیا۔ انھی مقدمات میں شامل مولانا جعفر تھانیسری رحمہ اللہ اور حضرت شاہ اسحاق رحمہ اللہ کے شاگرد مولانا نذیر حسین رحمہ اللہ نے جماعتِ اہلِ حدیث ہند کی بنیاد رکھی۔

قبائل کا جہادی مرکز

شجرِ جہاد کا تیسرا مرکز آج کے صوبہ سرحد اور قبائل میں پھیلا ہوا تھا۔ شروع شروع میں یہ صرف ضلع مردان، صوابی، نوشہرہ اور بونیر تک پھیلا ہوا تھا مگر رفتہ رفتہ دعوتِ جہاد کی برکت سے یہ حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا اور مشرق میں پورے ہزارہ اور کشمیر تک پھیل گیا جبکہ مغرب میں سوات، باجوڑ، مہمند، خیبر اور وزیرستان تک پھیل گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں تقریباً ایک صدی تک مجاہدینِ اسلام نے جہاد کی برکت سے انگریزوں کے مقاصد کے آگے بند باندھے رکھا۔

مقاصد و منہجِ جہاد

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس فتوی کے نتیجے میں آپ کے شاگردِ رشید سید احمد شہید، داماد شیخ الاسلام مولانا عبدالحیؒ اور بھتیجے حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہم اللہ نے عملی جہاد کی طرف قدم اٹھایا۔ ان کا منہج صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سنت کے متبعین سلفِ صالحین رحمہم اللہ کا منہج تھا یعنی ہجرت، اعداد اور جہاد۔ ان کے مقاصد بھی وہی تھے جو اسلام نے جہاد کے لیے متعین کیے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب سیرتِ سید احمد شہید کے ص ۲۵۲ پر سید احمد شہید رحمہ اللہ کے خطوط سے وہ جملے نقل کیے ہیں جن میں سید صاحب نے خود مقاصد بیان کیے ہیں۔ مثلاً سید احمد شہید رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

- ''اگر اسلامی ملک آزاد ہو جائے اور ریاست و سیاست اور قضا و عدالت میں شرعی قوانین کو مدارِ عمل بنالیا جائے تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ خود مالکِ سلطنت بننے کے بجائے مجھے یہ پسند ہے کہ تمام اقطاع میں عادل فرماں رواؤں کی حکمرانی کا سکہ جاری ہو جائے''۔
- ''میں ہفت اقلیم کی سلطانی کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔ جب نصرتِ دین کا دور شروع ہو جائے اور سرکشوں کے اقتدار کی جڑ کٹ جائے گی تو میری سعی کا تیر خود بخود نشانۂ مراد پر جا بیٹھے گا''۔

تاریخ دعوت و عزیمت حصہ ششم جلد اول ص ۴۰۸ میں سید احمد شہید رحمہ اللہ کی زبانی یہ مقاصد نقل کیے گئے ہیں:

- ''ہمارا جھگڑا امراء و رؤساء سے نہیں بلکہ ہم کو لمبے بال والوں (سکھ) بلکہ تمام فتنہ انگیز کافروں سے جنگ کرنا ہے، نہ کہ اپنے کلمہ گو بھائیوں سے اور ہم مذہب مسلمانوں سے''۔
- ''اس ملک (یعنی مغربی ہند) کو مشرکین کی نجاستوں سے پاک اور منافقین کی گندگی سے صاف کرنے کے بعد حکومت و سلطنت کا استحقاق، ریاست اور انتظام سلطنت کی استعداد رکھنے والوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ احسانِ خداوندی کا شکر بجالائیں گے اور ہر حال میں جہاد کو قائم رکھیں گے اور کبھی اس کو موقوف نہیں کریں گے اور انصاف و مقدمات کے فیصلے میں شرع شریف کے قوانین سے بال بھر بھی تجاوز اور انحراف نہیں کریں گے اور ظلم و فسق سے کلیتاً اجتناب کریں گے۔ اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رخ کروں گا تاکہ اس کو شرک اور کفر سے پاک کیا جائے۔ اس لیے کہ میرا مقصود اصلی ہندوستان پر جہاد ہے، نہ کہ ملک خراسان میں سکونت اختیار کرنا''۔

اس سے معلوم ہوا کہ سید صاحب کے تصور میں ہندوستان دار الحرب تھا جہاں کافروں کا غلبہ تھا اور جسے دار الاسلام میں تبدیل کرنے کے لیے جہاد لازمی تھا۔ پھر یہ کہ دار الاسلام سے مراد یہ تھا کہ وہ اسلامی امارت کے قیام کے خواہاں تھے، جہاں شرعی قوانین نافذ ہوں۔

ہجرت، اعداد اور جہاد

جہاد کے لیے اعداد (یعنی تیاری) اور اعداد کے لیے ہجرت لازمی بھی تھی اور یہی صحابہؓ کا طریقہ ہے۔ خود سید صاحب نے یہ تصریح کی تھی کہ ہجرت سنت کے مطابق ہونی چاہیے۔ چنانچہ ہجرت و اعداد کے لیے سب سے

پہلے سرحد کے علاقے کو منتخب کیا گیا اور اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اگرچہ سید صاحب کے ساتھیوں نے یہ تجویز دی تھی کہ ہندوستان میں ہی رہ کر جہاد کیا جائے جس کے لیے ان کے بقول وہ اسلحہ اور مال فراہم کرنے پر قادر تھے، تاہم سید صاحب نے سرحد کو کئی خصوصیات کی وجہ سے منتخب کیا، جو آپ کے فرمودات کے مطابق حسبِ ذیل ہیں:

- جہاد کی تیاری (اعداد) کے لیے سرحد جغرافیائی اور عسکری نقطۂ نگاہ سے موزوں اور مامون علاقہ تھا جبکہ ہندوستان میں بلوے اور فساد کا اندیشہ تھا۔
- سرحد میں مسلمانوں کی اکثریت تھی جو سکھوں کے مظالم سے تنگ آچکے تھے اور یہاں کے عوام فطرتاً جنگجو اور خلوص کے ساتھ آمادہ ہونے والے تھے۔
- سرحد کے شمال و جنوب میں بھی مسلمان اکثریت کے علاقے تھے اور جنوب میں واقع پنجاب میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی سکھوں کے مظالم سے تنگ آچکے تھے۔
- اگرچہ سرحد کے کئی علاقوں پر کافر قابض ہو چکے تھے مگر آزادی اور خود مختاری کی رمق اب بھی باقی تھی۔ بہت سے علاقے آزاد تھے اور جن علاقوں پر کافروں نے قبضہ کر رکھا تھا، وہاں بھی مکمل اقتدار ان کو حاصل نہ تھا۔ اس کے بالعکس ہندوستان کے بیشتر علاقوں کی آزادی اور خود مختاری مکمل طور پر چھن چکی تھی۔

اس ہجرت کے لیے سید صاحب کو طویل سفر اختیار کرنا پڑا۔ چونکہ ان کے اور سرحد کے درمیان سکھوں کی ریاست تھی لہٰذا انھیں گھوم کر دوسری طرف جانا تھا۔ وہ اپنے علاقے رائے بریلی سے نکلے جو وسطی ہند میں واقع ہے، وہاں سے گوالیار گئے، پھر اڑیسہ کے شہر ٹونک، راجھستان کے شہر اجمیر، سندھ کے شہر شکار پور، بلوچستان کے شہر کوئٹہ، افغانستان کے شہر قندہار اور کابل سے ہوتے ہوئے پشاور پہنچے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سفر کے دوران آپ کو کتنی دشواریاں پیش آئی ہوں گی مگر اس سب کے باوجود آپ کے عزم اور حوصلے میں کمی نہ آئی۔ اڑھائی سے تین ہزار میل کی یہ مسافت آپ اور آپ کے قافلے نے تقریباً ۱۰ ماہ میں طے کی۔

سید احمد شہید رحمہ اللہ کی سرحد آمد

جب سید احمد شہید رحمہ اللہ سرحد پہنچے تو اس وقت سرحد چھوٹے چھوٹے خوانین[42] کے تحت مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، جن میں امب، پنجتار، سمہ، زیدہ، ستھانہ اور پشاور وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ یہ سب آج کے اضلاع پشاور، مردان نوشہرہ، صوابی اور بونیر وغیرہ کے علاقے ہیں۔ ان خوانین کے حالات ہندوستان کی ریاستوں سے کچھ مختلف نہ تھے۔ ان میں سے کچھ تو رنجیت سنگھ کی سکھ ریاست میں بلاواسطہ شامل تھے اور کچھ اس کو ٹیکس ادا کرتے تھے۔ سید صاحب سب سے پہلے پنجتار کے امیر فتح خان کے یہاں مہمان ہوئے اور وہاں سے جہاد کا آغاز کیا۔ پنجتار دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع تھا اور سکھوں کی حکومت والے علاقے سے زیادہ قریب تھا۔ اس لیے ساتھیوں کے مشورے سے آپ نے اپنا مرکز پنجتار سے ستھانہ منتقل کر لیا۔ ستھانہ ضلع مردان اور ضلع بونیر کی سرحد کے کنارے پر واقع ہے اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے جہاد کے مرکز کے لیے زیادہ موزوں تھا۔

بیعتِ امامتِ جہاد

سرحد پہنچ کر جو عملی مشکلات مجاہدین کو پیش آئیں، ان میں قبائلیوں کا غیر منظم طریقہ، مقاصدِ جہاد سے لا علمی، دنیوی مال و جاہ کو اہمیت دینا اور رؤساء کی باہمی رقابتیں شامل تھیں۔ اس لیے انھوں نے رؤساء سے گفت وشنید کی اور انھیں جہاد کے مقاصد اور شرعی منہج سے آگاہ کیا یہاں تک کہ وہ جہاد کو ایک امیر کے تحت منظم کرنے پر راضی ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہاں کے علماء اور رؤساء نے شاہ صاحب ہی کو امامت کے لائق جانا اور سرحد کے بڑے سادات، علماء، مشائخ، رؤساء اور خوانین نے انھیں جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ بمطابق جنوری ۱۸۲۷ء کو جہاد کی امامت کے لیے اپنا امیر منتخب کرنے کے ساتھ ساتھ جمعہ کے خطبوں میں بھی ان کا نام جاری کیا۔ اس طرح شاہ صاحب کے اپنے لوگ آپ کو 'امیر المؤمنین' کہنے لگے، سرحد کے عوام میں آپ 'سید بادشاہ' جبکہ سکھوں کے یہاں وہ 'خلیفہ صاحب' کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس بیعت میں جہاد کا انتظام سید صاحب کے ذمہ تھا مگر دیگر سیاسی اور مقامی معاملات میں خوانین آزاد تھے۔ اس بیعت کے بعد جہاد کے لیے نفیر عام کی گئی اور بڑے پیمانے پر جہاد کے لیے بیعت لی گئی۔ جن سے بیعت لی گئی ان میں ایسے سردار بھی تھے جن کے بارے

[42] خوانین 'خان' کی جمع ہے۔ اس وقت مذکورہ علاقوں کے قبائلی سرداران کو 'خان' کہا جاتا تھا، اور انھی کے پاس اپنے علاقوں کے انتظامات ہوتے تھے۔

میں مخلص مقامیوں نے سید صاحب کو خبردار کیا، لیکن نفیرِ عام کے سبب تمام سے بیعت لینے اور ان پر اعتماد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ البتہ مقامیوں کا خدشہ بعد میں درست ثابت ہوا۔

تحریکِ مجاہدین کے جنگی معرکے

جہاد کا آغاز اکوڑہ میں سکھوں کے خلاف حملے سے ہوا اور چند حملوں کے بعد ہی الحمد للہ سرحد کے علاقوں سے سکھوں کا زور کم ہونے لگا۔ تحریکِ مجاہدین کی طرف سے دو طرح کے جنگی معرکے ہوئے؛ ایک سکھوں کے خلاف اور دوسرا غدار خوانین کے خلاف۔ ان معرکوں میں اللہ تعالیٰ نے سید صاحب کو کامیابی عطا فرمائی اور سرحد سکھوں سے آزاد ایک مسلمان مملکت میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ اب موقع آگیا تھا کہ سید صاحب لوگوں سے بیعتِ شریعت لے کر اسے باقاعدہ ایک امارتِ شرعیہ میں بدل دیں۔

سید احمد شہید رحمہ اللہ کی بیعتِ شریعت

بیعتِ امامتِ جہاد لینے سے اگرچہ جہادی عمل منظم ہوا، تاہم کئی مقاصدِ جہاد پورے ہوتے نظر نہ آئے کیونکہ اس بیعت میں سرداروں کو مقامی معاملات میں آزادی تھی۔ لٰہذا اب آپ نے بیعتِ شریعت بھی لینا شروع کی۔ سرحد کے عوام میں بقیہ علاقوں کی طرح اگرچہ اسلام سے محبت تھی مگر اس کے ساتھ شرعی امور سے لاعلمی تھی اور برصغیر میں مسلمانوں کے انحطاط کے سبب خامیاں بھی تھیں۔ ان میں سے نمایاں خامیاں جو مولانا غلام رسول مہر نے (ص ۴۵۸ پر) ذکر کیں؛ ان میں

- روساء کی احکامِ شریعت سے بے پرواہی اور مقامی علماء کی روساء کے ساتھ مداہنت،
- معاشرے میں بہت سے بدعتی امور کا رواج جیسے اسقاط کا حیلہ، حقِ مہر میں زیادتی، عورتوں کو وراثت سے محروم کرنا وغیرہ، اور
- جہاد اور غیر جہاد کے لیے لڑنے میں فرق نہ کرنا شامل ہیں۔

مقاصدِ جہاد کی تکمیل کے لیے بیعتِ شریعت میں سید صاحب سرداروں سے وعدہ لیتے تھے کہ وہ اپنے معاملات کو شریعت کے موافق چلائیں گے اور رعایا پر بھی شریعت نافذ کریں گے۔

شعبان ۱۲۴۴ھ بمطابق فروری ۱۸۲۹ء کو سردار فتح خان کے قبیلے کا ایک اجتماعِ عام ہوا جس میں فتح خان نے تمام لوگوں کو بیعتِ شریعت کی ترغیب دی اور سب نے بطیبِ خاطر اسلامی نظام کی پابندی قبول کر لی۔ اس کے نتیجے میں ایک جید عالم کو قاضی القضاۃ اور ایک کو احتساب پر مامور کیا گیا۔ محتسب کے ماتحت تیس تفنگچی بھی مقرر کیے گئے۔

مؤرخین کے مطابق اس بیعت سے امکانات پیدا ہوئے کہ جن مقاصد کے لیے سید صاحب نے سفرِ ہجرت کیا تھا، وہ عملًا نافذ ہو جائیں گے اور اتنا لشکر دستیاب ہو سکے گا جو انگریزوں اور سکھوں کے خلاف منظم جنگ شروع کرے، دوسری جانب معاشرے سے شرکیہ اور بدعتی رسم و رواج کا قلع قمع ہو گا اور ان کی جگہ نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور حسبہ قائم ہو جائے گا۔ لیکن اسی دوران ایک فتنے کا آغاز ہوا جس نے اس پوری عمارت کو ہلا دیا۔

خوانینِ پشاور کی بدعہدی اور سید احمد شہید رحمہ اللہ کی شہادت

تحریکِ مجاہدین کی ان کامیابیوں سے رنجیت سنگھ گھبرا گیا۔ دوسری طرف پشاور میں 'خان یار محمد خان' جو صوبہ سرحد پر اپنی ملکیت کے خواب دیکھ رہا تھا، اسے بھی مجاہدین کی یہ کامیابی ایک آنکھ نہ بھائی۔ کہا جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کے بدعتی علماء کو اپنے ساتھ ملایا جنھوں نے ایک فتویٰ تیار کر کے پشاور کے خوانین کے پاس بھیجا۔ اس فتویٰ کا مضمون کچھ یوں تھا: ''تمہاری طرف ایسے شر پسند لوگ آئے ہیں جنھوں نے نیا دین ایجاد کیا ہے۔ انھیں فوراً اپنے علاقے سے نکال دو''۔ خوانینِ پشاور جو پہلے ہی اپنی نیت میں خالص نہ تھے، انھیں اس فتوے کے سہارے اپنی سازش کو منظم کرنے کا موقعہ مل گیا۔ خوانینِ پشاور نے اندر ہی اندر عوام اور دیگر خوانین و علماء میں مجاہدین کے خلاف ایک مہم چلائی۔ اس مہم سے بہت سے لوگ گمراہ ہو گئے جن میں سے اکثریت نے جہالت کی بنا پر ان کا ساتھ دیا۔ بہر حال ان سازشیوں نے خفیہ طور پر ایک دن مقرر کر کے اپنے اپنے علاقوں میں موجود مجاہدین کو انجانے میں حملہ کر کے شہید کر دیا۔ ان مجاہدین میں زیادہ تر وہ قاضی اور علماء تھے جنھیں سید صاحب نے لوگوں کے فیصلوں اور دین کے مطابق تربیت کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہ حضرات تحریکِ مجاہدین کی روح تھے اور اس سے تحریک کو بہت نقصان پہنچا۔ وفادار خوانین اور مجاہدین نے سید احمد شہید کو ان خوانین سے بدلہ لینے کا مشورہ دیا مگر سید صاحب نے اسے مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی قرار دے کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور پھر ستھانہ سے بالاکوٹ کی طرف ہجرتِ ثانیہ کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں ہجرت کرنے کے بعد مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کا وہ مشہور معرکہ ہوا جس میں سید صاحب نے شاہ اسماعیل شہید اور دیگر ساتھیوں سمیت جامِ شہادت نوش کیا اور اس میں مجاہدین کو شکست ہوئی۔

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ کی شہادت کے بعد مجاہدین نے 'مولانا ولی محمد پھلتی' کو اپنا امیر مقرر کر لیا۔ مولانا ولی محمد پھلتی مجاہدین کو لے کر واپس ستھانہ آ گئے اور معاملاتِ جہاد کا آغاز کر دیا۔ مولانا کبار سن تھے اور ایک سال کے بعد ہی انتقال کر گئے۔ مولانا ولی محمد پھلتی کے بعد مجاہدین نے 'مولانا نصیر الدین منگلوری' کو امیر بنایا۔ آپ کی زندگی میں دوبارہ عملی معرکوں کا آغاز ہوا اور مولانا ایسے ہی ایک معرکے میں

شہید ہو گئے۔ دہلی کے مرکز نے قیادت کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے 'مولانا نصیر الدین دہلوی' کا انتخاب کیا۔ مولانا نصیر الدین دہلوی مجاہدین کی ایک پوری فوج لے کر سندھ اور افغانستان کے راستے ستھانہ کی طرف سفر ہجرت پر روانہ ہوئے۔ مولانا ابھی سندھ میں ہی پہنچے تھے کہ انھیں معلوم ہوا کہ انگریز اپنی کرائے کی ہندوستانی فوج کے ساتھ افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے سندھ پہنچ چکا ہے۔ یہ اس کھیل کا آغاز تھا جس میں امتِ مسلمہ کے دو دشمن روس اور برطانیہ اپنے آپ کو دنیا کی سپر طاقت منوانے کی دوڑ میں شامل ہو چکے تھے۔

جہادِ افغانستان اول (۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۲ء)

تین براعظموں پر پھیلی ہوئی سلطنتِ عثمانیہ جو اس وقت کی سپر طاقت تھی، اب اس پر جمود کے اثرات نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انگریز آہستہ آہستہ ہندوستان میں قبضہ کے بعد ایک طاقت کی حیثیت سے ابھر کے سامنے آرہے تھے۔ دوسری طرف روس وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستوں کو للچائی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ایران یا بلوچستان میں سے کسی ایک کے ساحل تک پہنچ کر گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ دنیا کے ساتھ تجارت کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ روس یہ بھی چاہتا تھا کہ ہندوستان پر قبضہ کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے محروم کر دیا جائے۔ چنانچہ روس ایران اور افغانستان میں اپنے اثرات کو بڑھانے لگا۔ انگریزوں کے لیے یہ تینوں باتیں ناقابل قبول تھیں اور ان کے خیال میں روس کو اس پالیسی سے باز رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ افغانستان میں برطانیہ کی مرضی کی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنگال آرمی ایک طرف دریائے ستلج تک پہنچ چکی تھی تو دوسری طرف بمبئی آرمی سندھ کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ پنجاب، کشمیر، ہزارہ اور سرحد میں راجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ انگریز اور مہاراجہ کے درمیان دوستی کا معاہدہ تھا۔ ۱۸۱۸ء میں شاہ شجاع کو شکست دے کر دوست محمد افغانستان کا بادشاہ بن گیا۔ شاہ شجاع افغانستان سے فرار ہو کر ہندوستان آگیا اور انگریزوں سے پناہ لے کر لدھیانہ میں رہائش پزیر ہو گیا۔

۱۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو ایک گھڑ سوار کابل کی تنگ گلیوں میں داخل ہوا۔ یہ زار روس کا نمائندہ 'ونکووچ' تھا جو زار روس کی طرف سے دوستی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ دوست محمد کے دربار میں برطانیہ کے نمائندے 'برنس' (Alexander Burnes) نے اس خط کو گورنر جنرل 'لارڈ آکلینڈ' (Auckland) کی طرف بھیج دیا۔ لارڈ آکلینڈ نے اپنے سفیر کے ذریعے والیٔ افغانستان کو دوستی کا پیغام بھیجا۔ دوست محمد اس شرط پر تیار ہوا کہ پشاور رنجیت سنگھ سے لے کر دوبارہ اس کی تحویل میں دیا جائے۔ یہ شرط پوری کرنا برطانیہ کے بس میں نہ تھا

کیونکہ برطانیہ کا رنجیت سنگھ کے ساتھ دوستانہ معاہدہ تھا۔ اس مشکل سے نکلنے کے لیے انگریز کی نظرِ کرم شاہ شجاع پر پڑی جسے دوست محمد نے ۱۸۰۹ء میں جلاوطن کرکے حکومت پر قبضہ کیا تھا۔ شاہ شجاع جو لدھیانہ میں انگریزوں کی پناہ میں اپنی زندگی کے دن پورے کررہا تھا، اس بات پر راضی ہوگیا کہ اقتدار میں آنے کے بعد وہ پشاور سے دست بردار ہو جائے گا۔ اس طرح شملہ کے مقام پر برطانیہ، رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس شملہ معاہدے (Simla Manifesto) میں یہ طے پایا کہ انگریز فوج افغانستان پر قبضہ کرکے شاہ شجاع کو افغانستان کا بادشاہ بنائے گی اور واپس چلی جائے گی۔ یہی معاہدہ 'جہادِ افغانستان اول'[43] (First Anglo-Afghan War) کا سبب بنا۔

۱۹ جنوری ۱۸۳۹ء کو برطانیہ کی دو ڈویژن فوج فیروزپور اور بنگال سے چل کر کوئٹہ میں جمع ہوئی۔ اس میں ۹۵۰۰ انگریز فوجی، ۳۸ ہزار عام سپاہی اور ۳۰ ہزار اونٹ تھے۔ فوج نے ۳ مئی کو قندھار پر معمولی مزاحمت کے بعد قبضہ کرلیا اور شاہ شجاع کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد کابل کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے غزنی کے مقام پر قلعہ غزنی فتح کرنے کے لیے انہیں سخت جنگ لڑنی پڑی۔ اس معرکے میں افغان فوج کے ساتھ ساتھ یاغستان کے قبائل اور سید احمد شہید کے بیعت یافتہ مولانا نصیر الدین دہلوی رحمہ اللہ کی قیادت میں ہندوستانی مجاہدین نے بھی حصہ لیا۔ اس جنگ کا سب سے خونریز معرکہ قلعہ کی دیوار کے باہر اِنھی ہندوستانی مجاہدین نے لڑا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اس معرکہ میں شامل تمام مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا اور بالآخر قلعہ غزنی پر انگریز فوج کا قبضہ ہوگیا۔ کابل پر قبضے کی راہ میں یہی بڑی رکاوٹ تھی جس کے دور ہو جانے کے بعد کابل بآسانی قبضۂ اغیار میں آگیا۔ کامیابی میں مست برطانوی فوج کو یہ اندازہ نہ تھا کہ جنگ درحقیقت اب شروع ہوگی۔

۱۸۴۰ء کے اوائل میں برطانیہ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ افغانستان میں عوامی ردِعمل بڑھ رہا ہے اور حالات بتدریج خراب ہوتے چلے جارہے ہیں، کابل میں ایک بڑا فوجی اڈہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس اقدام کے خلاف علمائے حق کی آواز جہاد کے لیے شرارہ بن گئی جس کے نتیجے میں کوہستان کے علاقے میں شاہ شجاع اور انگریز کی پوری فوج قتل کی گئی۔ کابل میں بھی برطانوی نائب سفیر 'برنس' اور اس کے بھائی کو قتل کرنے کے بعد مجاہدین نے فوجی اڈے کا گھیراؤ کرلیا۔ برطانوی سفیر 'میک نیگٹن' (William Hay

---

[43] جدید مؤرخین انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان پر قابض برطانیہ اور افغانستان کے مابین ہونے والی تین جنگوں کو 'انگریز افغان جنگ' (Anglo-Afghan Wars) کا نام دیتے ہیں، تاہم مصنف نے ان تینوں جنگوں کے لیے 'جہادِ افغانستان' کی اصطلاح کو پسند کیا ہے، گو سیاقِ کلام میں افغان جنگ بھی لکھا ہے۔ یہ وضاحت اس لیے کردی ہے تاکہ قارئین کو مغالطہ نہ ہو۔ (م ح)

(Macnaghten) نے دوست محمد کے بیٹے اکبر خان سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر اکبر خان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ برطانوی فوج افغانستان سے نکل جائے۔ بات چیت کے ناکام ہونے پر مجاہدین نے برطانوی سفیر کو قتل کرنے کے بعد فوجی اڈے پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے انگریز جرنیل اور بہت سے افسروں کو قید کیا۔ انگریز فوج کا ایک حصہ لڑتے ہوئے جلال آباد کی طرف پسپا ہوا تو مجاہدین نے اس کا تعاقب کیا اور فوج کے ایک ڈاکٹر (ولیم برائیڈن) کے علاوہ کوئی بھی زندہ جلال آباد نہ پہنچ سکا۔

قندھار میں 'ناٹ' (General Nott) نامی افسر انگریز فوج کی قیادت کر رہا تھا مگر اس کے حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہ تھے، لہٰذا اس کی مدد کے لیے پشاور سے 'پولوک' (General Pollock) نامی افسر کی قیادت میں کمک بھیجی گئی۔ اس کمک کا صرف اتنا فائدہ ہوا کہ باقی فوج ۲۳ دسمبر ۱۸۴۲ء کو واپس فیروز پور پہنچ گئی۔ جبکہ افغانی مجاہدین نے شاہ شجاع کو قتل کر کے اقتدار دوبارہ دوست محمد کو سونپ دیا۔ اس طرح برطانوی فوج جو مقاصد لے کر افغانستان میں داخل ہوئی تھی، ان میں سے ایک بھی حاصل نہ کر سکی۔ الٹا اسے مجاہدین کے مقابلے میں سخت ترین عسکری شکست کا سامنا کرنا پڑا جس میں اس کا جرنیل گرفتار ہوا اور اسیری کے عالم میں ہی مر گیا اور ایک ڈاکٹر کے سوا تمام فوجی ہلاک کر دیے گئے۔ یوں جہادِ افغانستان اول ختم ہوا۔

فرانس کا الجزائر پر حملہ ۱۸۳۰ء اور امیر عبدالقادر کا جہاد

ایک طرف تحریکِ مجاہدین کی جدوجہد جاری تھی اور دوسری طرف برطانیہ افغانستان پر حملے کے لیے پر تول رہا تھا کہ اسی دوران فرانس نے شمالی افریقہ کے مسلمان ملک الجزائر پر حملہ کر دیا۔ الجزائر بحیرۂ روم کے کنارے پر واقع مسلمان ملک ہے۔ اس دور میں یہ سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھا۔ فرانس کے قبضے کے خلاف وہاں کے مسلمانوں نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ ان کے امیر عبدالقادر تھے۔ امیر عبدالقادر عالمِ دین اور سلسلہ قادریہ کے صوفی تھے۔ ان کی قیادت میں الجزائر میں تحریکِ جہاد نے فرانسیسی فوج کا بہت سخت مقابلہ کیا۔ امیر عبدالقادر نے بربر قبائل کو منظم کیا اور بہت سے دیگر قبائل نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اس جہاد کی وجہ سے امیر عبدالقادر آدھے سے زیادہ الجزائر پر قابض ہو گئے اور آپ نے امارتِ اسلامیہ قائم کر کے شریعت نافذ کر دی۔ اس جہاد کی کامیابی سے گھبرا کر فرانس کی حکومت نے ۱۸۳۷ء میں امیر عبدالقادر سے صلح کر لی اور ان کی حکومت کو مان لیا، مگر دو سال بعد ہی فرانس نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ۱۸۳۹ء میں دوبارہ امیر عبدالقادر کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگ ۱۸۴۷ء تک جاری رہی جس کے نتیجے میں فرانس نے امیر عبدالقادر کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ امیر عبدالقادر نے تیونس سے مدد اور پناہ کی اپیل کی جو نہ مل سکی، اور اس کے سبب امیر

عبدالقادر کو فرانسیسی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ آپ کو گرفتار کر کے شام میں جلاوطن کر دیا گیا جہاں ۱۸۸۳ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

سلطنتِ عثمانیہ کا زوال؛ مغربی اصلاحات کا دور (۱۸۲۶ء تا ۱۸۷۶ء)

یورپ میں انقلابِ فرانس کے اثرات پھیل رہے تھے اور ہر ملک میں بادشاہتوں کو آئین میں محدود کیا جا رہا تھا، دوسری طرف ہندوستان پر برطانیہ اور الجزائر پر فرانس کا قبضہ مکمل ہو رہا تھا اور روس قوقند، بلقان اور بحیرۂ اسود پر قبضہ کرنے کے لیے فوج کشی کر رہا تھا۔ ان حالات کے زیرِ اثر سلطنتِ عثمانیہ پر زوال کے آثار نمودار ہونے لگے۔ انقلابِ فرانس کے اثرات اب سلطنتِ عثمانیہ کے گوشے گوشے میں سنائی دینے لگے۔ بہت سی وطنی تحریکوں نے جنم لے لیا جو اپنے اپنے وطنی حقوق کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب کسی حکومت پر زوال طاری ہو جاتا ہے تو وہ دوسری قوموں سے مرعوب ہونا شروع ہو جاتی ہے اور ان کے نظاموں کو اپنانا شروع کر دیتی ہے۔ یہی حال سلطنتِ عثمانیہ کا ہوا۔ زوال کے اس زمانے میں عثمانیوں نے مغرب کے نظاموں اور ان کی صنعتی ترقی سے متاثر ہونا شروع کر دیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مغرب کا نظام اپنانے سے شاید ان کے مسائل حل ہو جائیں گے، مگر نہ کبھی ایسا ہونا تھا اور نہ ہوا۔

۱۸۳۹ء میں سلطان محمود نے نظام کی تنظیمِ نو کے نام سے سلطنت عثمانیہ کے اندر تبدیلیاں شروع کر دیں۔ یہ تبدیلیاں معاشی، معاشرتی، عسکری اور قانونی نوعیت کی تھیں۔ اس تنظیمِ نو کا سادہ سا مطلب یہ تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کو مکمل طور پر مغربی طرز پر منظم کرنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس تنظیمِ نو کی بہت سی تفصیلات ہیں جن کا خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

- ۱۸۳۹ء میں حقوقِ انسانی کے متعلق انقلابِ فرانس کا چارٹر منظور کیا گیا۔
- ۱۸۴۰ء میں مغرب کی تقلید میں پہلی بار سلطنتِ عثمانیہ میں کاغذ کے کرنسی نوٹ جاری کیے گئے۔
- ۴۴-۱۸۴۳ء کے دوران فوج کو مکمل طور پر مغرب کے نظریہ جنگ اور ترتیب کے مطابق منظم کیا جانے لگا۔ اس فوج کو منظم کرنے والا کوئی اور نہ تھا بلکہ مغرب کو لادین نظریہ جنگ دینے والے 'جنرل کلازوٹ' کا شاگرد 'جنرل مولٹکی' تھا۔
- ۱۸۴۴ء میں سلطنتِ عثمانیہ کا قومی ترانہ اور قومی جھنڈا بنایا گیا۔
- اسی سال سلطنتِ عثمانیہ میں مغربی طرز کے معاشی نظام کی بنیاد رکھی گئی۔
- اسی سال شرعی احکامات میں ترمیم کر کے بعض نئے مغربی فوجداری قوانین بنائے گئے۔

- ۱۸۴۸ء میں مغربی طرز کی یونیورسٹیوں کی بنیاد رکھی گئی۔
- ۱۸۵۶ء میں جزیہ ختم کر دیا گیا اور مغربی طرز پر ٹیکس کا نظام نافذ کر دیا گیا۔
- اسی سال غیر مسلموں کو فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت دے دی گئی۔
- ۱۸۶۶ء میں پہلا اسٹاک ایکسچینج بنایا گیا۔
- ۱۸۶۹ء میں مغربی نقالی میں 'شہریت' کا قانون بنایا گیا۔

ان اصلاحات اور اس تنظیمِ نو نے روبہ زوال سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کی رفتار مزید تیز کر دی۔ ہم آگے چل کر اس پر مزید روشنی ڈالیں گے ان شاء اللہ۔

ہندوستان میں برطانیہ کی بند بارڈر پالیسی (۱۸۴۸ء تا ۱۸۷۸ء)

ہندوستان میں سیاست اب ایک نیا رخ لے رہی تھی۔ ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی اب دہلی کی حکومت پر عملی طور پر قابض ہو چکی تھی، تاہم دوسری طرف افغانستان میں شکست کے بعد اب برطانیہ کے لیے روس کا خطرہ مزید بڑھ گیا تھا۔ اسی دوران رنجیت سنگھ مر گیا اور تخت کے لیے اس کے وارثوں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی۔ اس سے انگریزوں کو موقع مل گیا اور وہ مدد کے بہانے پنجاب میں گھس گئے۔ بالآخر ۱۸۴۹ء میں وہ پنجاب پر قابض ہو گئے۔ اس واقعے کو تاریخ میں 'الحاقِ پنجاب' کہتے ہیں۔ 'الحاقِ پنجاب' تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے جس نے گریٹ گیم اور ہندوستان دونوں کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ الحاقِ پنجاب کی بدولت برطانیہ ہندوستان کے مغرب میں قبائل اور افغانستان کے ساتھ بلاواسطہ مقابلہ میں آ گیا اور الحاقِ پنجاب کی وجہ سے گریٹ گیم اپنے نقطہ عروج کی طرف بڑھ گئی۔

اب گریٹ گیم میں افغانستان کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ افغانستان میں برطانیہ اور روس دونوں کے مفادات وابستہ تھے۔ یوں اس محاذ پر تین فوجیں مد مقابل آ گئیں۔ ایک طرف انگریز تھے جو روس کو روکنے کے لیے قبائل و افغانستان پر قبضہ کر کے یہاں اپنا کٹھ پتلی حکمران دیکھنا چاہتا تھا، دوسری طرف روس افغانستان پر قبضہ کر کے ہندوستان سے انگریز کا قبضہ ختم کرنا چاہتا تھا اور گوادر کی بندرگاہ پر قبضہ کر کے بین الاقوامی تجارت کرنا چاہتا تھا، جبکہ تیسری طرف مجاہدین برطانیہ اور روس دونوں کو مسلمانوں کے ملک سے نکالنا چاہتے تھے۔ اس طرح یہ ایک ایسی سہ فریقی جنگ بن گئی جو علاقائی جنگ بھی تھی اور بین الاقوامی جنگ بھی۔ یہ جنگ اس قدر پھیلی کہ انگریزوں نے اس کا تصور تک نہ کیا تھا۔

الحاقِ پنجاب کے سبب بہت سے نئے چیلنج انگریزوں کے سامنے آئے۔ سب سے پہلا چیلنج یہ تھا کہ اب وہ پہلی مرتبہ ہندوستان سے آئے ہوئے تحریکِ مجاہدین اور آزاد قبائل کے مجاہدین کے بلاواسطہ آمنے سامنے تھے۔ وہ ہندوستان میں فتوحات کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ الحاقِ پنجاب کے نتیجے میں وہ ایک ایسی جنگ میں داخل ہو رہے ہیں جو ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک (قریباً ایک صدی) جاری رہے گی اور اس جنگ میں ان کا اس قدر جانی و مالی نقصان ہو گا جو کئی بڑی جنگوں سے زیادہ ہو گا اور وہ کوئی بھی مقصد حاصل نہ کر سکیں گے۔ الحاقِ پنجاب سے پیدا ہونے والا دوسرا بڑا چیلنج بین الاقوامی تھا؛ برطانیہ کی حکومت شروع سے ہی روس کی توسیع پسند پالیسی سے خائف تھی۔ اسے روس کے گرم پانی تک پہنچنے کی خواہش کا بھی علم تھا جو براستہ افغانستان بلوچستان کے ساحل تک پہنچنے سے پوری ہو سکتی تھی اور یہ حصہ برطانیہ کی عمل داری میں شامل تھا۔ روس کے ان توسیع پسندانہ عزائم کو روکنے کے لیے انگریزوں کے پاس یہی طریقہ تھا کہ وہ افغانستان پر یا تو قبضہ کر لیں یا وہاں اپنے مطلب کی حکومت قائم کر لیں لیکن ان کے راستے میں قبائل اور مجاہدین حائل تھے۔ ان تمام مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے جو حکمتِ عملی اختیار کی، اسے 'بند بارڈر پالیسی' کہتے ہیں۔

اس پالیسی سے مراد یہ تھی کہ ہندوستان میں سلطنتِ برطانیہ کی سرحد کو دریائے سندھ تک محدود کر دیا جائے اور دریائے سندھ کو سلطنتِ برطانیہ کی حد مانتے ہوئے دریا کے پار پانچ اضلاع مردان، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کو صوبہ پنجاب میں شامل کر دیا جائے، جبکہ ان کے مغرب میں واقع قبائل پر بلاواسطہ قبضے کی بجائے بالواسطہ دیر، سوات، بونیر اور ٹانک کے خوانین کے ذریعے کنٹرول کیا جائے۔ اس پالیسی کو مؤثر بنانے کے لیے ۱۸۷۲ء میں 'ایف سی آر' (Frontier Crime Regulation) کا قانون بنایا گیا۔

اس پالیسی کے چند اہم مقاصد یہ تھے:

1. انگریز کے زیرِ تسلط علاقے پر امن رہیں اور وہاں قبائل کی مداخلت کو روکا جا سکے۔
2. انگریزی قانون کی نگاہ میں مجرم اگر قبائل میں پناہ لیں تو قبائل انھیں واپس حکومت کے حوالے کریں۔
3. قبائل کو انگریزی قانون کے تابع کرنے کی منظم کوشش کی جائے۔
4. قبائل میں سے جو انگریز کے ساتھ معاہدہ کر لے، اسے شکنجے میں لانے کے لیے ملکی نظام متعارف کرایا جائے۔

تاہم برطانیہ کی یہ 'بند بارڈر پالیسی' مجاہدین اور قبائل کے جہاد کے نتیجے میں ناکام ہو گئی۔

فرنٹیئر فورس کا قیام،تاریخ اور کارنامے

'بند بارڈر پالیسی' کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ۱۸۴۶ء میں پنجاب کے گورنر 'ہنری لارنس' (Henry Lawrence)اوراس کے بھائی 'جان لارنس' (John Lawrence)نے بنگال کے مقامی فوج کے افسر 'لیفٹیننٹ ہیری لمسڈن' (Harry Lumsden)کوایک نئی فوج منظم کرنے کا حکم جاری کیا۔اس نئی فوج کا نام 'گائیڈز کی کور' (Corps of Guides) رکھا گیا۔ گائیڈز کی اس کور کا کام دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی سرحد کی حفاظت کرنا، قبائلی اور ہندوستانی مجاہدین کے ممکنہ حملوں کو روکنااور ضرورت پڑنے پر ان کے خلاف آپریشن کرنا تھا۔شروع شروع میں گائیڈ ایک نیم فوجی عسکری قوت کی تنظیم تھی اور یہ گھڑ سوار دستوں 'گائیڈز کیولری' (Guides Cavalry)اور پیادہ دستوں 'گائیڈز انفنٹری'(Guides Infantry) پر مشتمل تھی۔چونکہ انگریزاس سرحد کو 'پنجاب کی سرحد' کہتے تھے جس کاانگریزی ترجمہ 'پنجاب فرنٹیئر' (Punjab Frontier)تھا،اس مناسبت سے ۱۸۶۵ء میں گائیڈ کی اس کور کے نام کے ساتھ 'پنجاب فرنٹیئر' لگنے لگا جو بعد میں 'پفر' (Piffers) بن گیااور جو آج بھی پاکستانی فوج کی فرنٹیئر فورس رجمنٹ کا تخلص ہے۔

۱۸۷۶ء میں اس کور کے سیاہ کارناموں سے خوش ہو کر ملکہ برطانیہ 'وکٹوریہ' نے اس کور کو 'ملکہ کی اپنی کور' (Queen Victoria's Own Corps)کااعزازی نام دیا۔اس طرح یہ 'ملکہ برطانیہ کی اپنی کور آف گائیڈ فرنٹیئر فورس' کہلانے لگی۔ ۱۹۰۶ء میں اس کے نام کے ساتھ اس کے بانی 'لمسڈن' کا نام شامل کر دیا گیا۔

۱۹۱۴ء میں 'کور آف گائیڈ' کو پیادہ اور گھڑ سوار دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں پیادہ حصے کا نام 'دس فرنٹیئر فورس رجمنٹ' رکھا گیا جو آج پاکستان کی 'فرنٹیئر فورس رجمنٹ' کہلاتی ہے۔

۱۸۴۹ء میں پنجاب کے گورنر 'ہنری لارنس' نے بارڈر کے دفاع کے لیے ایک اور نیم فوجی ملیشیا کے قیام کا اعلان کیا جس کا نام 'فرنٹیئر رائفل' (Frontier Rifles) رکھا گیا۔اس فوج میں پنجاب کی پہلی، دوسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی پیادہ رجمنٹوں کو شامل کیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں ان رجمنٹوں کے ساتھ ان کے بانی انگریزوں کے نام شامل کر دیے گئے۔ اس طرح پہلی پنجاب پیادہ رجمنٹ 'کچپن کوک کی رائفل'، دوسری

پنجاب پیادہ رجمنٹ 'چھپن پنجاب رائفل'، چوتھی پنجاب پیادہ رجمنٹ 'ستاون ویں وئیلڈ رائفل'، پانچویں پنجاب پیادہ رجمنٹ 'اٹھاون ویگن رائفل' اور چھٹی پنجاب رجمنٹ 'اُنسٹھ سندھی رائفل' بن گئی۔

ایف سی آر کا قانون

'بند بارڈر پالیسی' کا دوسرا اہم منصوبہ آزاد قبائل کو پرامن رکھنا تھا۔ اس کے لیے برطانوی حکومت نے ایک خاص قانون نافذ کیا جس کا نام 'فرنٹیئر کرائم ریگولیشن' (ایف سی آر) رکھا گیا۔ اس قانون سے قبائل میں ایک نئے نظام نے جنم لیا جو کسی نہ کسی طرح آج بھی قائم ہے۔ اس قانون کی رو سے قبائل کے سرکردہ افراد کو 'ملک' کا لقب دیا جانے لگا۔ شروع میں ان کے ساتھ متصل اضلاع کے منافق خوانین کے ذریعے رابطہ رکھا جاتا تھا اور بعد میں اس کے لیے 'پولیٹیکل ایجنٹ' تعینات کیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ پرامن رہنے کے لیے حکومت قبائل کو رقم ادا کرنے کی پابند تھی جسے 'مواجب' کہا جاتا ہے۔ یہ رقم ملک کی صوابدید پر قوم کے افراد میں تقسیم ہوتی تھی۔ جو قبیلہ امن خراب کرتا اس کے خلاف بندش لگائی جاتی تھی۔ بندش کا مطلب یہ تھا کہ فوج اور باقی قبائل اس قبیلہ کی معاشی ناکہ بندی کریں۔ اگر قبیلے کے چند افراد یا کوئی شاخ معاہدے کی پابندی نہ کرتی تو باقی قبیلہ اس کے خلاف برامتہ کرتا، جس سے مراد اس فرد یا شاخ سے معاشی قطع تعلق کرنا تھا۔ ملک، مواجب، بندش اور برامتہ اس قانون کی باقاعدہ اصطلاحات بن گئیں جو اب تک نافذ ہیں۔ قبائلی عوام اور علماء نے اس نظام کو مکمل طور پر مسترد کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ اس اعلان میں سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ساتھ آئے ہوئے مہاجر مجاہدین کا بڑا ہاتھ تھا۔ قبائل اور مہاجر مجاہدوں نے انگریز فوج اور چوکیوں پر حملوں کا آغاز کر دیا۔

جہادِ قبائل (۱۸۴۸ء تا ۱۸۷۸ء)

برطانیہ کی بند بارڈر پالیسی کے نتیجے میں پہلی مرتبہ مجاہدینِ اسلام اور انگریزوں کی تیار کردہ 'کرائے کی فوج' کا بلاواسطہ آمنا سامنا ہوا۔ اس وقت کے مجاہدین کا مقصد وہی تھا جو آج کے مجاہدین کا ہے؛ یعنی اللہ کے دشمنوں کو شکست دے کر شریعت کا نفاذ کرنا۔ ان کی ترتیب بھی وہی تھی جو آج کے مجاہدین کی ہے۔ وہی مدد کرنے والے انصار، وہی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مہاجرین۔ ان کے علاقے، رنگ، نسل مختلف تھے مگر مقصد اور نصب العین ایک ہی تھا۔ ان کے دن اللہ کی راہ میں جہاد کرتے گزرتے اور راتیں اس کے حضور قیام اور سجود میں گزرتیں۔

اب تحریکِ مجاہدین کی قیادت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے بیعت یافتہ مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی رحمہا اللہ کر رہے تھے۔ ان کی قیادت میں مجاہدینِ اسلام نے کفار کی ناک میں دم کر دیا۔ ان کے مدِ مقابل انگریزوں کی فوج میں موجود کرائے کے نام نہاد مسلمان فوجی تھے جو اپنی قیمتی زندگی برطانیہ کے لیے قربان کر رہے تھے اور جو ہر جنگ اس لیے کر رہے تھے کہ امتِ مسلمہ کو شکست دی جائے۔ کرائے کے ان سپاہیوں کی زندگی کا مقصد اپنی زندگی کی قربانی دے کر امت کو زوال سے دوچار کرنا اور اس کے عوض چند گز زمین اور چند فوجی اعزازات حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو 'مسلمان' بھی کہتے تھے۔

جہادِ قبائل کو ہم دو محاذوں میں تقسیم کر سکتے ہیں؛ شمالی اور جنوبی۔ شمالی سے مراد ملاکنڈ، بونیر، سوات، باجوڑ، مہمند، خیبر اور مردان وغیرہ کے قبائل ہیں اور جنوبی سے مراد اور کزئی اور شمالی و جنوبی وزیرستان ہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اس میں مہاجر اور انصار دونوں شامل تھے۔ جس طرح یہ تمام علاقے ایک دوسرے سے متصل تھے، اسی طرح ان میں ہونے والا جہاد بھی ایک دوسرے سے متعلق تھا۔ پھر ہجرت اور جہادی حکمتِ عملی کے سبب بھی ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقوں میں چلے جاتے تھے۔ ان علاقوں میں سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ساتھی اور مقامی قبائل دونوں برسرِ پیکار تھے۔ یہاں جہاد کے لیے عموماً مندرجہ ذیل حکمتِ عملیاں اپنائی گئیں:

1. زیادہ تر کارروائیاں دشمن کے علاقوں پر چھاپہ مار حملوں کی صورت میں کی گئیں جن کا مقصد انگریزوں کو آگے بڑھنے سے روکنا تھا۔
2. ان چھاپوں کے نتیجے میں انگریزوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ حملہ آور ہوں اور یوں مجاہدین انھیں اپنی پسند کے محاذ میں دھکیل کر نشانہ بناتے تھے۔
3. مختلف اوقات میں انگریز اپنی پالیسی بدلتے رہتے تھے اور روس کے ڈر سے افغانستان کی طرف پیش قدمی کرتے تھے جس کی راہ میں یہ قبائل آڑے آجاتے تھے۔
4. خود افغانستان کے اندر بھی مجاہدین انگریز کے خلاف افغان حکومت کا ساتھ دیتے تھے۔

انگریز مؤرخین لکھتے ہیں کہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۷ء تک کے اس دور میں مجاہدین کی کارروائیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ پشاور شہر میں کسی انگریز کا باہر نکلنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس دور میں مجاہدین کے خلاف انگریزوں نے آٹھ بڑے آپریشن کیے جن میں انھیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس دور کا ایک بڑا آپریشن 'میجر نکلسن' کی

قیادت میں تحریکِ مجاہدین کے مرکز 'ستھانہ' میں کیا گیا۔ مجاہدین اس آپریشن کے نتیجے میں پسپا ہو کر بونیر کے علاقے 'ملکا' میں آ گئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی

مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے مقام پر برطانیہ کی ہندوستانی فوج 'بنگال فوج' نے بغاوت کر دی۔ ان فوجیوں نے میرٹھ میں موجود تمام انگریز افسروں کو قتل کر دیا اور خود بھاگ کر دہلی آ گئے۔ وہاں بھی انھوں نے انگریزوں کا قتل عام کیا اور خود بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے پاس آ کر اس سے قیادت کرنے کی اپیل کی۔ اس طرح دہلی پر ان مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ ہند کے مسلمانوں کے لیے انگریزوں سے آزادی کا سنہرا موقعہ تھا مگر بد قسمتی سے بادشاہ بہادر شاہ ظفر میں خود اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان لوگوں کی قیادت کر سکے۔ اس نے باغی فوج کے ایک جرنیل 'بخت خان' کو قیادت کی ذمہ داری دے دی۔ رفتہ رفتہ یہ بغاوت لکھنؤ، جانسی اور شاملی تک پھیل گئی۔

اس جنگِ آزادی کو کچلنے میں سب سے اہم کردار انگریزوں کی نئی بھرتی شدہ چونتیس ہزار کی اس فوج نے ادا کیا جو پنجاب کے اضلاع جہلم، چکوال اور راولپنڈی (خطہ پوٹھوہار) کے رہنے والے مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ان کے ساتھ گائیڈ کی فرنٹیئر فورس رجمنٹ بھی شامل تھی جو 'میجر نکلسن' کی قیادت میں ستائیس دن میں چھ سو میل کا سفر کر کے دہلی پہنچی اور آزادئ ہند کی تحریک کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا۔

تاجِ برطانیہ کا راج اور رائل انڈین آرمی کی تشکیل

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اپنوں کی غداری سے ناکام ہو گئی۔ کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی اور ہندوستان اب بلاواسطہ تاجِ برطانیہ کے تحت آ گیا۔ کمپنی کی صدارتی فوجوں کا نام 'رائل انڈین آرمی' رکھ دیا گیا۔ انگریز مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی انگریزوں کے خلاف بغاوت کمپنی کی حکومت کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھی۔ تاہم اس بغاوت کے دوران سلطنتِ برطانیہ کو پنجاب کے تین اضلاع جہلم، چکوال اور رولپنڈی جبکہ پشتونوں کے دو اضلاع بونیر اور کرک (کوہاٹ) سے انگریزوں کی ایسی وفادار افرادی قوت میسر آئی جس نے آنے والے وقت میں انگریز فوج میں شامل ہو کر نہ صرف مسلمانوں کی وحدت سلطنتِ عثمانیہ کو شکست دے کر امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھیر دیا، بلکہ مسلمانوں کے قبلہء اول کو یہودیوں کے قبضہ میں دے کر ریاستِ اسرائیل کے قیام میں بھی مدد دی۔ ان علاقوں نے انگریزوں کی اتنی مدد کی کہ انگریز مؤرخ تاریخ کی کتابوں میں ان اضلاع کو 'سلطنتِ برطانیہ کی تلوار' کہنا شروع ہو گئے۔ ان اضلاع سے بھرتی اتنی کامیاب رہی کہ انگریز جرنیلوں نے نہ صرف بنگال کی

فوج بلکہ مدراس اور بمبئی کی فوج میں بھی پنجاب، بونیر اور کرک کے افراد کو شامل کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ انگریزوں کی تمام فوج کا ۶۰ سے ۷۰ فیصد حصہ ان اضلاع سے بھرتی ہونے لگا۔ انگریز نے ان قوموں کو 'جنگجو نسلیں' (Martial Race) قرار دیا۔ انگریزوں کا دیا ہوا لقب آہستہ آہستہ ایک عقیدہ اور فوج میں شمولیت کا معیار بن گیا جو آج بھی پاکستانی فوج میں ایک معیار کے طور پر قائم ہے۔

شمالی قبائل کا محاذ اور جنگ امبیلہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مردان میں موجود بنگال کی 'پچپنویں فوج' نے بڑے پیمانے پر بغاوت کی تھی۔ اس بغاوت کو شروع کرنے میں تحریکِ مجاہدین کا بڑا ہاتھ تھا۔ جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے جو تحقیقات کیں، اس سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ نہ صرف بغاوت مجاہدین نے کرائی تھی بلکہ بنگال فوج کے بھاگ جانے والے باغی سپاہیوں کو بھی مجاہدین نے پناہ دی تھی۔

اس بغاوت کی سزا کے طور پر ۱۸۵۸ء میں انگریز فوج نے مجاہدین کے مرکز ستھانہ پر حملہ کر دیا۔ مجاہدین چونکہ گوریلا فوج تھے، لہٰذا وہ ستھانہ سے پسپا ہو کر ضلع بونیر کے علاقے 'ملکا' چلے گئے اور یوں انگریزوں کا یہ حملہ ناکام ہو گیا۔ کئی سال مجاہدین اور انگریز فوج کے درمیان جنگ چلتی رہی اور مجاہدین نے انگریز فوج کو اتنا تنگ کر دیا کہ انگریز مؤرخ کے مطابق پشاور شہر میں دن کے وقت بھی انگریز فوج کا نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ بالآخر ۱۸۶۳ء کو برطانوی حکومت نے تحریکِ مجاہدین کے خلاف ملکا پر ایک بڑے آپریشن کا منصوبہ بنایا جو تاریخ میں 'جنگ امبیلہ' (Umbeyla Campaign) کے نام سے جانی گئی۔

اس جنگ کا منصوبہ یہ تھا کہ مجاہدین کو شمال کی جانب پہاڑوں میں نہ جانے دیا جائے بلکہ انھیں جنوب کی جانب دریائے سندھ کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کیا جائے جہاں ایک فوج مقابلے کے لیے پہلے سے موجود ہو۔ اس لیے اس حملے کو انتہائی راز میں رکھا گیا اور یہ طے پایا کہ ضلع بونیر میں واقع وادی چملہ کے 'درۂ امبیلہ' سے گزر کر مجاہدین کے مرکز ملکا پر حملہ کیا جائے۔ اس آپریشن کا پلان تین ہفتے کا تھا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو انگریز فوج 'جنرل چیمبرلین' (Neville Chamberlain) کی قیادت میں چھاؤنی سے چلی اور اس نے درۂ امبیلہ کے دونوں پہاڑوں میں حفاظتی چوکیاں قائم کیں جن میں شمالی چوکی کا نام 'عقاب کا نشیمن' (Eagle's Nest) اور جنوبی چوکی کا نام 'کریگ پیکٹ' (Crag Picquet) تھا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو جب انگریز فوج جنرل چیمبرلین کی زیرِ قیادت اس درے میں داخل ہوئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ مجاہدین پہلے سے تیار

تھے۔ سوات، باجوڑ، بونیر اور تحریکِ مجاہدین کے شیر اللہ کے ان دشمنوں سے نمٹنے کے لیے امبیلہ کے اس درے میں موجود تھے۔

مجاہدین نے ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو 'کریگ پیکٹ' پر حملہ کیا اور اس پیکٹ کی حفاظت پر مامور پہلی پنجاب بٹالین کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ پہلی پنجاب بٹالین اور بیسویں پنجاب بٹالین نے اس پیکٹ کو حاصل کرنے کے لیے حملہ کیا اور مجاہدین کو پسپا ہونا پڑا۔ یہ بیسویں پنجاب بٹالین اب پاکستان فوج کی پنجاب رجمنٹ کا حصہ ہے۔ ۱۳ نومبر ۱۸۶۳ء کو مجاہدین نے پھر سے کریگ پیکٹ پر قبضہ کر لیا، مگر چند دن بعد انھیں دوبارہ پسپا ہونا پڑا۔ ۲۰ نومبر ۱۸۶۳ء کو مجاہدین نے تیسری دفعہ حملہ کر کے کریگ پکٹ پر قبضہ کر لیا۔ اب کی دفعہ اس پیکٹ پر حملہ کرنے کی قیادت انگریز فوج کے جرنیل چیبرلین نے خود کی اور وہ اس حملے میں شدید زخمی ہو گیا جس کے سبب اسے میدان سے علیحدہ ہونا پڑا۔ جنگ کے اس مرحلے پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ انگریز فوج مدد کے بغیر یہ جنگ جیت نہیں سکتی۔ اس لیے لاہور، سیالکوٹ اور جہلم سے تازہ دم دستے روانہ کیے گئے جن کی قیادت 'جنرل گوروک' (Garvock) کر رہا تھا۔ اسی جرنل گوروک نے جنرل چیمبرلین کی جگہ فوج کی قیادت سنبھالی۔

تاہم اس مدد کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ انگریز فوج اس آپریشن کو تین ہفتوں میں مکمل کرنے کے لیے نکلی تھی مگر تین ماہ گزر جانے کے باوجود ابھی امبیلہ کے درے میں بھی مکمل داخل نہ ہو سکی تھی۔ انگریز مسلمانوں کے خلاف جنگ کا اصول جان چکے تھے کہ میدانِ جنگ میں اگر فتح حاصل نہ ہو تو پیسے دے کر غدار پیدا کرو۔ چنانچہ بونیر کے ملکان اور خوانین کو سوا لاکھ روپیہ دے کر اس بات پر راضی کیا گیا کہ انگریز فوج کا ایک دستہ ان خوانین کی نگرانی میں جا کر مجاہدین کے مرکز کو جلا کر واپس آ جائے گا۔ پھر ایسا ہی ہوا کہ ان خوانین کی موجودگی میں فرنٹیئر فورس رجمنٹ کا ایک دستہ 'ملکا' گیا اور مجاہدین کے مرکز کو آگ لگا کر واپس آ گیا۔ انگریز فوج میں موجودہ پاکستان فوج کی پنجاب رجمنٹ اور فرنٹیئر فورس رجمنٹوں نے بھرپور حصہ لیا۔ مجاہدین کی فوج میں 'ملا اخوند صاحب سوات' کے ساتھ امیر مجاہدین مولانا عبداللہ ولد مولانا عنایت علی بھی شریک تھے۔ انھوں نے مل کر مجاہدین کو منظم کیا۔ یہ اس دور کی سب سے بڑی لڑائی تھی جو امبیلہ کے مقام پر ہوئی۔ اس کے بارے میں مؤرخین کا تجزیہ ہے کہ اگر انگریز ان خوانین کے ساتھ سودے بازی نہ کرتا تو شاید اسے ہمیشہ کے لیے پورے سرحد سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

جنوبی قبائل کا محاذ اور مولوی گلاب دین وزیر

اس دور میں شمالی قبائل کے علاوہ جنوبی قبائل نے بھی برطانیہ کے خلاف جہاد میں بھرپور کردار ادا کیا اور خاص طور اس میں چند شخصیات قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس تحریکِ جہاد کو منظم کیا اور اسے تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا۔ ان شخصیات میں مولوی گلاب دین، ملا پاوِندہ، شہزادہ فضل دین اور فقیر اپی شامل ہیں۔

جنوبی قبائل میں جہاد کی ابتداء کرنے والے 'مولوی گلاب دین' تھے، جن کا عرف 'دہ وزیرو ملا' یعنی 'وزیروں کا مولوی' تھا۔ آپ کا تعلق 'سرکی خیل وزیر' سے تھا، البتہ آپ کے والد پہلے داود شاہ اور پھر ممند خیل وزیر ہجرت کر گئے تھے۔ آپ نے ۱۸۵۲ء میں پہلی دفعہ وزیرستان میں انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے ہوئے منظم تحریک شروع کی۔ اس تحریک کی بدولت ان کے گرد وزیر، مسعود، داوڑ، بنوچی اور خٹک تمام جمع ہو گئے۔ آپ نے داود شاہ اور ممند خیل میں انگریزوں سے مقابلہ کیا مگر جب انگریزوں کا یہاں غلبہ ہوا تو کجوری کے مقام پر اپنا مرکز بنایا۔ یہاں آپ نے کارتوس، بندوق اور توپ بنانے کے لیے اسلحہ ساز کارخانہ بھی لگایا۔ اس زمانے کی ایک توپ اب بھی وزیروں کے یہاں محفوظ ہے۔ آپ نے سپین وام، گڑیوم اور دوسلی کے مقام پر قلعے تعمیر کیے جہاں ہمیشہ آٹھ دس ہزار کا لشکر موجود ہوتا تھا۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں انگریز آپ کی حیات تک شمالی وزیرستان میں داخل نہ ہو سکے۔ آپ نے تربیت کا ایسا نظام قائم کیا تھا کہ آپ کی زندگی میں ہی ملا پاوندہ جیسا شخص میدانِ جہاد میں پیدا ہوا۔ کجوری کے مقام پر ہی آپ کی وفات ہوئی۔

کریمیا کی جنگ اور روس کا وسطی ایشیاء اور بلقانی ریاستوں پر قبضہ

۱۸۵۳ء میں روس اور سلطنتِ عثمانیہ کے درمیان جنگ شروع ہوئی جسے تاریخ میں 'کریمیا کی جنگ' (Crimean War) کہتے ہیں۔ اس جنگ کی وجہ یہ تھی کہ روس بیت المقدس کے عیسائیوں کے مقدس مقامات کی ذمہ داری لینا چاہتا تھا جو سلطنتِ عثمانیہ کے ماتحت ایک معاہدے کی بنا پر فرانس کے پاس تھی۔ زار روس روایتی (آرتھوڈوکس) کلیساء کا رکن تھا جبکہ فرانس رومن کیتھولک کلیساء کی جانب سے یہ ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔ زار روس نے خلیفہ سے مطالبہ کیا کہ یہ ذمہ داریاں فرانس سے لے کر اسے دی جائیں۔ فرانس نے یہ ذمہ داریاں دینے سے انکار کر دیا۔ زار روس 'نکولس اول' (Nicholas I) نے کریمیا پر حملہ کر دیا جو بحیرۂ اسود کے نزدیک عثمانی علاقہ تھا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ سلطنتِ عثمانیہ نے جنگ کا اعلان کر دیا اور اس میں برطانیہ اور فرانس نے سلطنتِ عثمانیہ کا ساتھ دیا۔ جنگ کے نتیجے میں روس سے یہ علاقے واپس لے لیے گئے اور ۱۸۵۶ء میں یہ جنگ ختم ہو گئی۔ جنگ کے اختتام پر 'معاہدۂ پیرس' (Treaty of Paris) ہوا۔

گریٹ گیم کا یورپی دور ۱۸۵۶ء میں 'معاہدۂ پیرس' کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں تمام یورپی طاقتوں نے سلطنتِ عثمانیہ کو یورپ کا حصہ مان لیا اور اس کے علاقوں کی حفاظت کی ضمانت دی، لیکن چند ہی سال بعد اس معاہدے کی خلاف ورزیاں شروع کر دیں۔ برطانیہ اور فرانس کا مقصد ہمیشہ یہ رہا کہ خلیفہ کے اختیارات کو کمزور کر کے عثمانی خلافت کو اندر سے کمزور کیا جائے۔ اس کام کے لیے انھوں نے سلطنت کے اندر موجود عیسائیوں کو شہ دے کر شام، لبنان اور بلغاریہ میں فسادات کروائے اور ان کی حفاظت کی ضمانت کے طور پر آئینی جمہوری حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ دوسری طرف نوجوان ترکوں کی تنظیم کھڑی کر کے ان کے ذریعے بھی آزادی اور مساوات کے نعرے بلند کروائے۔ ان تمام اقدامات کا مقصد خلیفہ کی طاقت کو کمزور کرنا تھا۔

دوسری طرف روس دوبارہ اٹھا اور اس نے جنوب کی سمت بڑھتے ہوئے ۱۸۶۵ء میں پہلے 'تاشقند' پر قبضہ کیا، پھر تین سال بعد ۱۸۶۸ء میں 'بخارا' اور پھر پانچ سال بعد ۱۸۷۳ء میں 'قوقند' پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس اقدام سے ہندوستان کے گورنر جنرل 'لارڈ لیٹن' کو سلطنتِ برطانیہ کے روایتی حریف روس سے خطرہ لاحق ہوا کیونکہ اس طرح روس برطانوی سامراج سے صرف چار سو کلومیٹر دور رہ گیا تھا۔ دوسری طرف یورپی ممالک کی یہ سازشیں جاری تھیں کہ روس نے ۱۸۷۷ء میں 'بلقان' کی ریاستوں پر حملہ کر دیا جو عثمانی سلطنت کا حصہ تھیں۔ بلقان کی ریاستیں بھی اپنی آزادی کے نام پر روس کے ساتھ مل گئیں۔ 'انڈرنوپل' پر قبضے کے ساتھ ہی برطانیہ اور فرانس کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں روس مکمل فتح نہ حاصل کر لے۔ اس لیے برطانیہ نے اپنا بحری بیڑا 'درۂ دانیال' میں بھیج دیا جس سے جنگ رک گئی۔ جنگ کی تفصیلات طے کرنے کے لیے 'معاہدۂ برلن' (Treaty of Berlin) ہوا جس میں مانٹی نیگرو، یونان، رومانیہ اور سربیا کی عثمانی ریاستوں کو آزاد اور خود مختار ریاستیں تسلیم کر لیا گیا جبکہ عثمانی صوبوں بوسنیا اور ہرزیگووینیا کو آسٹریا کے حوالے کر دیا گیا۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ اپنی یورپی ریاستوں سے محروم ہو گئی۔

سلطنتِ عثمانیہ کا آئینی دور؛ ۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ انقلابِ فرانس کے اثرات کے تحت سلطان محمود اور اس کے بعد آنے والے سلطانوں نے حالات کو بہتر بنانے کے لیے سلطنت میں تنظیمِ نو کا ایک سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس تنظیمِ نو کا مقصد سلطنت کو مغربی طرز پر منظم کرنا تھا۔ تاہم جیسا کہ اللہ کا حکم ہے کہ اگر کافروں کی بات کو مان لیا جائے تو ان کا ارادہ تو یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے ان کا ایمان بھی لے جائیں۔ تنظیمِ نو نے کوئی بہتری پیدا نہیں کی

بلکہ 'نوجوان ترکوں' (Young Turks) کے نام سے ایک ایسی تنظیم پیدا ہو گئی جس کا مطالبہ تھا کہ ملک کا آئین بنایا جائے اور اور پارلیمنٹ بنا کر ملک میں الیکشن کرائے جائیں۔ 'سلطان عبدالحمید ثانی' نے ملک کا پہلا آئین بنانے کی اجازت دے دی۔ اس کے تحت بغیر کسی پارٹی کے ۱۸۷۷ء میں پہلی پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آ گیا۔ البتہ ۱۸۷۸ء میں اس پارلیمنٹ کو سلطان عبدالحمید نے توڑ دیا۔ ۱۸۷۸ء میں دوسری پارلیمنٹ کے لیے انتخابات ہوئے مگر اس کو بھی اختلافات کے تحت توڑ دیا گیا۔ اس سے ملک کے حالات مزید خراب ہو گئے۔ ملک کے کئی حصوں میں احتجاج شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۸ء تک چلتا رہا۔ ۱۹۰۸ء میں عوامی دباؤ کے تحت سلطان عبدالحمید ثانی نے پارلیمنٹ کو دوبارہ بحال کر دیا مگر حالات بہتر نہ ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں سلطان کے خلاف بغاوت ہو گئی اور سلطان عبدالحمید کو ہٹا کر اس کے بھائی کو 'محمد پنجم' کے خطاب کے ساتھ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ سلطان عبدالحمید کے خلاف نوجوان ترکوں کے اس انقلاب میں تین پاشاؤں کا کردار بہت اہم رہا۔ یہ تینوں انور پاشا، طلعت پاشا اور جمال پاشا تھے۔ ان تین پاشاؤں پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے سلطنتِ عثمانیہ کو جنگِ عظیم اول میں شامل ہونے پر مجبور کیا تھا۔ ان کا ذکر آگے جنگِ عظیم اول کے باب میں آئے گا۔

نہر سویز کی تعمیر، مصر پر برطانیہ کا قبضہ اور مہدی سوڈانی کی تحریکِ جہاد

مصر سولہویں صدی عیسوی میں 'سلطان سلیم اول' کے زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ کے قبضے میں آیا تھا اور ۱۸۸۲ء تک اسی کے تحت رہا۔ اس سارے زمانے میں کئی نشیب و فراز آئے۔ ۱۷۹۸ء میں 'نپولین بوناپارٹ' نے اس پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں نپولین کو مصر سے نکلنا پڑا۔ نپولین کے نکلنے کے بعد 'محمد علی پاشا' مصر پر قابض ہو گیا۔ محمد علی پاشا کا خاندان ۱۸۰۵ء سے ۱۹۵۲ء تک مصر کا بادشاہ رہا جب ایک فوجی انقلاب میں جمال عبدالناصر نے شاہ فاروق کو بادشاہت سے ہٹا کر جلاوطن کر دیا۔ ۱۸۵۹ء میں 'سعدی پاشا' نے فرانس کے تعاون سے بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم کو ملانے والی نہر کا منصوبہ بنایا جس سے مصر کی اہمیت بڑھ گئی۔ ابتداء میں برطانیہ نے اس منصوبے میں کوئی دلچسپی نہیں لی کیونکہ اس کے انجینیروں کے خیال میں یہ ایک ناممکن منصوبہ تھا، مگر ۱۸۶۹ء میں 'اسماعیل پاشا' کے زمانے میں یہ منصوبہ مکمل ہو گیا۔ اس منصوبے سے یورپ سے ہندوستان کا راستہ ایک تہائی سے بھی کم رہ گیا جس کے سبب اس راستے کی اہمیت برطانیہ کے لیے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ ۱۸۷۵ء میں برطانیہ نے مصر سے اس کے حصص خرید لیے۔ اسماعیل پاشا کے بعد 'توفیق پاشا' حکمران بنا تو اس کے خلاف 'احمد اعرابی' نام کے ایک قومی راہنما نے بغاوت کر دی۔ اعرابی مصر میں فرانس اور برطانیہ کی مداخلت کے خلاف تھا۔ اس بغاوت نے برطانیہ اور فرانس کے لیے خطرہ پیدا کر دیا کہ اعرابی پاشا کی کامیابی کی صورت میں نہر

سویز برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ برطانیہ نے توفیق پاشا کی مدد کے لیے فوج بھیجی جس میں ہندوستان سے بھیجی گئی سات ہزار کی فوج بھی شامل تھی۔اس فوج نے 'تل الکبیر' (Tel al-Kabir) کی جنگ میں اعرابی کی فوج کو شکست دی اور مصر برطانیہ کے پروٹیکٹوریٹ میں شامل ہوگیا۔ 'کرومر' (Cromer) کو اس کا وائسرائے بنادیا گیا۔

مصر کی فتح کے بعد برطانیہ نے سوڈان...جو پہلے مصر کا ایک صوبہ مانا جاتا تھا... کو دوبارہ فتح کرنے کا منصوبہ بنا یا۔ یہ صوبہ 'محمد احمد بن عبداللہ' کے قبضے میں آگیا تھا جو 'مہدی سوڈانی' کے نام سے مشہور تھا۔ محمد احمد نے اپنے آپ کو 'مہدی' قرار دیا اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۸۴ء میں مہدی سوڈانی نے خرطوم پر قبضہ کر لیا اور برطانیہ کے گورنر 'گورڈن' (George Gordon) کو قتل کر دیا۔ گورڈن کی مدد کے لیے مصر سے بھیجی جانے والی دو فوجوں کو مہدی سوڈانی کی فوجوں نے شکست دے دی۔ ۱۸۸۵ء میں مہدی سوڈانی کی وفات ہوئی۔ مہدی کے خلیفہ نے وہاں شریعت نافذ کر دی۔ مہدی سوڈانی کی قائم کردہ یہ حکومت تقریباً پندرہ سے بیس سال تک قائم رہی۔ اس دوران ان کی فوجوں نے ایتھوپیا اور مصر پر بھی قبضے کی کوشش کی۔ ۱۸۹۶ء میں برطانوی 'جنرل کچنر' نے سوڈان پر حملہ کیا۔ دو سال کی سخت جنگ کے بعد ۱۸۹۸ء میں 'ام درمان' کی لڑائی میں مہدی سوڈانی کی فوج کو شکست ہوئی۔ ام درمان کی شکست جدید طریقہء جنگ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوئی۔ اس جنگ میں مشین گن نے ہزاروں مجاہدین کو شہید کیا۔ مجاہدین کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ توپ خانے اور مشین گن کے فائر میں بغیر دفاع کے سیدھے چلتے جاتے جس کے سبب اس جنگ میں تقریبا ۳۵۰۰۰ مجاہدین شہید یا زخمی ہوئے۔ ایک جنگ میں اتنے بڑے نقصان نے اس تحریک کی عسکری قوت توڑ کر رکھ دی اور سوڈان ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ یہ جنگ مجاہدین کے لیے بہت اہم سبق ہے۔

برطانیہ کی قبائل کے لیے اقدامی پالیسی (۱۸۷۸ء تا ۱۹۰۰ء)

انیسویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں عالمی سیاست کئی رنگ بدل رہی تھی۔ اب روس وسطی ایشیاء پر قابض ہو چکا تھا، قوقند کے محاذ میں بھی روس کو کافی کامیابی ہوئی تھی، جبکہ اس نے مشرقی یورپ میں بھی اپنے اثر میں اضافہ کر لیا تھا۔ وسطی ایشیائی ریاستوں میں قبضہ کرنے کے بعد اب روس ہندوستان سے صرف چار سو کلومیٹر دور رہ گیا تھا۔اس کی نظریں اب افغانستان پر تھیں۔ یہ ساری صورت حال ہندوستان میں انگریزوں کے لیے بہت زیادہ پریشان کن تھی۔ ان کی اختیار کردہ بند بارڈر پالیسی مجاہدین کے جہاد کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔اس لیے انھوں نے ہندوستان کے قبائلی علاقے کے لیے 'اقدامی پالیسی' اپنانے کا فیصلہ کیا۔ اس

پالیسی کے تین مرحلے تھے؛ایک یہ کہ آگے بڑھ کر قبائلی علاقے پر قبضہ کیا جائے اور روس کے خلاف دفاعی لائن بنائی جائے، دوسرا یہ کہ افغانستان پر یا تو مکمل قبضہ کیا جائے یا اس کے ساتھ روسی حملے کی صورت میں برطانیہ کا ساتھ دینے کا معاہدہ کیا جائے اور تیسرا یہ کہ افغانستان اور ہندوستان کے درمیان سرحد قائم کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔اس ساری صورتِ حال نے 'دوسری افغان جنگ' (Second Anglo-Afghan war) کو جنم دیا۔

جہادِ افغانستان دوم (۱۸۷۹ء)

۱۸۷۷ء میں سر 'رابرٹ سنڈیمن' (Robert Sandeman) گورنر جنرل آف انڈیا کا نمائندہ برائے بلوچستان مقرر ہوا تو اس نے 'خان آف قلات' کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے ناطے برطانیہ نے چمن، درۂ بولان اور درۂ خوجک پر قبضہ کر لیا۔اس کامیابی کے تناظر میں سنڈیمن نے بند بارڈر پالیسی کے بجائے اقدامی پالیسی مرتب کی اور اسے افغانستان سے متصل سرحدی علاقے میں بھی لاگو کرنے کی کوشش کی۔اس پالیسی کے دو بڑے مقاصد تھے؛ایک یہ کہ روس کی طرف سے خطرے کو جتنا ممکن ہو اپنی سلطنت سے دور دھکیل سکیں اور دوسرا یہ کہ ذمہ داریوں کے تعین کے لیے افغانستان کے ساتھ سرحدی حد بندی ہو جائے۔ برطانیہ کی اس توسیع پسندانہ پالیسی سے افغانستان کے حاکم 'امیر دوست محمد' کے بیٹے 'امیر شیر علی' کو خطرہ لاحق ہوا۔

ان حالات کے پیشِ نظر ایک طرف برطانوی حکومت افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت دیکھنا چاہتی تھی تو دوسری طرف روس بھی اسی کا خواہاں تھا، جبکہ ان دونوں کے برعکس افغانی حکومت غیر جانب دار رہنا چاہتی تھی۔اپنی خواہش کے پیشِ نظر روس نے ایک وفد کابل بھیجا جس نے شیر علی سے ملاقات کی مگر اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔اتفاقاً اسی وقت برطانوی جرنیل 'نیل چیمبرلین' (Neville Chamberlain) کی قیادت میں برطانیہ کا وفد بھی کابل آ پہنچا جس کی ملاقات سے شیر علی نے انکار کر دیا۔جب 'لارڈ لیٹن' (Edward Lytton) کو یہ خبر پہنچی تو اس نے 'شیر علی' کو مثبت جواب کے لیے پندرہ دن کی مہلت دی جس کی شیر علی نے کوئی پرواہ نہ کی۔ مدت ختم ہونے پر برطانوی افواج نے تین اطراف یعنی خیبر، کرم اور قندھار کی جانب سے افغانستان پر حملہ کر دیا اور یوں ۱۸۷۸ء میں دوسرے افغان جہاد کا آغاز ہوا۔قندھار کی طرف روانہ کی گئی فوج نے بآسانی قندھار پر قبضہ کر لیا جبکہ خیبر اور کرم کی جانب سے جانے والی افواج کو قبائل کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بالآخر وہ کابل پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔شیر علی روس کی طرف فرار ہو گیا

اور وہاں پر ہی فوت ہو گیا۔ شیر علی کے بیٹے یعقوب خان نے ۲۶ مئی ۱۸۷۹ء کو گندمک کے مقام پر انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا جس کے اہم نکات یہ تھے:

1. یعقوب خان روس کے خلاف برطانیہ کا ساتھ دے گا۔
2. اس کام کے عوض سلطنتِ برطانیہ یعقوب خان کو ۶۰ ہزار پاونڈ سالانہ دے گی۔
3. اگر روس افغانستان پر حملہ آور ہوا تو برطانیہ اس کی عسکری امداد کا پابند ہو گا۔
4. افغانستان کا سفارت خانہ دہلی میں ہو گا۔

یہ 'معاہدۂ گندمک' (Treaty of Gandamak) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس معاہدے کے تسلسل میں برطانیہ کا ایک وفد 'کویگنری' (Sir Pierre Cavagnari) کی قیادت میں افغانستان پہنچا۔

تاہم حسبِ سابق افغان قوم اپنی روایات اور دینی اقدار کے پیش نظر 'ملا مشکِ عالم' کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو مجاہدین نے برطانوی وفد سمیت کویگنری کی رہائش گاہ کو گھیر لیا۔ اس وقت اس کے ساتھ فرنٹیئر فورس رجمنٹ کے ۷۵ سپاہی بھی تھے۔ مجاہدین نے اس فوج کے مسلمان سپاہیوں کو علیحدہ ہو جانے کے لیے کہا مگر ان بدبختوں نے انگریز کی نمک حرامی کرنے سے انکار کر دیا اور اسی کے ساتھ جہنم رسید ہو گئے۔ اس قتل کا بدلہ لینے کے لیے ۱۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو 'جنرل رابرٹس' (Frederick Roberts) کی قیادت میں کرم کے راستے برطانیہ کی فوج نے کابل پر حملہ کیا اور کابل میں داخل ہو گئی، مگر مجاہدین نے 'غازی جان محمد وردک' کی قیادت میں اس فوج کو شیر پور کے فوجی اڈہ میں محصور کر دیا۔

اسی دوران 'ملا مشکِ عالم' کی کوششوں سے قندھار کے مجاہدین بھی بیدار ہو گئے۔ انھوں نے والئ ہرات 'ایوب خان' کی قیادت میں قندھار پر حملہ کر دیا۔ میوند کے مقام پر ایوب خان اور 'جنرل سٹیورٹ' (Gen Donald Stewart) کی فوجوں کے درمیان تاریخی لڑائی ہوئی۔ ایوب خان نے نہ صرف قندھار پر قبضہ کر لیا بلکہ وہاں موجود انگریز فوج کی اکثریت کو قتل اور قید کر لیا۔ مجبوراً جنرل رابرٹس کو قندھار کی فوج کی مدد کے لیے کابل سے فوجی کمک بھیجنا پڑی جو بمشکل باقی ماندہ فوج کو قندھار سے نکالنے میں کامیاب ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برطانیہ کے پاس نہ تو قندھار کے محاذ کو سنبھالنے کے لیے لازمی فوج بچی اور نہ ہی کابل کے محاذ کے لیے۔ لہٰذا اس نے افغانستان سے نکلنے میں ہی عافیت جانی۔ انگریز کے نکلنے کے بعد شیر علی کے ایک رشتہ دار 'عبدالرحمن' نے

کابل کے تخت پر قبضہ کر لیا اور انگریزوں کے ساتھ 'معاہدۂ گندمک' کے مطابق چلنے کا وعدہ کر لیا۔ یوں جہادِ افغانستان دوم کا خاتمہ مجاہدین کی اس کامیابی پر ہوا کہ انگریز فوج کو افغانستان سے نکال دیا گیا۔

ڈیورنڈ لائن (۱۸۹۳ء)

جہادِ افغانستان دوم میں شکست کھانے کے بعد انگریز اپنے آپ کو سرحد میں محفوظ تصور نہیں کر رہے تھے۔ ایک طرف سے روس کا خطرہ تھا اور دوسری طرف افغانستان کے قبائل کا خوف تھا جن میں انگریز کے خلاف پکنے والا لاوا کسی بھی وقت آتش فشاں بن کر پھٹ سکتا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر انھوں نے بلوچستان میں جاری اقدامی پالیسی کو قبائل میں بھی آزمانے کا فیصلہ کیا۔ پالیسی کے دو مقاصد میں سے ایک مقصد افغانستان اور ہندوستان کے درمیان حد بندی کرنا تھا۔ اسے پورا کرنے کے لیے ۱۸۹۳ء میں انگریز سفارت کار 'سر ڈیورنڈ' (Henry Durand) اور افغانستان کے امیر عبدالرحمن کے درمیان حد بندی کا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے امیر عبدالرحمن قبائلیوں کو اعتماد میں لیے بغیر قبائلی علاقے سے دست بردار ہو گیا جس کی وجہ سے افغانستان اور ہندوستان (اور اب پاکستان) کے درمیان حد بندی ہمیشہ کے لیے متنازعہ رہی۔ اس فیصلہ پر عمل درآمد کرتے ہوئے انگریزوں نے بھی قبائلیوں کو اعتماد میں لیے بغیر قبائلی علاقے میں فوجی چوکیوں کی تعمیر شروع کر دی۔ قبائل نے اس تمام عمل کو انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور ملا پاوِندہ کی قیادت میں ان چوکیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ یوں برطانیہ کے خلاف جنوبی قبائل کی تحریکِ جہاد میں تیزی آگئی۔

مولوی محی الدین مسعود عرف 'ملا پاوِندہ' اور آپ کی تحریکِ جہاد (جنوبی قبائل کا محاذ)

آپ کا نام محی الدین ولد مہتاری تھا اور آپ کا تعلق مسعود قبیلے کی شاخ شابی خیل سلطانائی سے تھا۔ آپ ۱۸۶۳ء میں جنوبی وزیرستان کے گاؤں 'مربی' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے بنوں کے ایک دینی مدرسے میں حاصل کی اور پھر مزید تعلیم کے لیے سوات چلے گئے۔ وہاں علماء کی صحبت میں رہے اور ایک مسجد میں مؤذن کے طور پر خدمات انجام دینے لگے۔ اس کے علاوہ آپ نے وہاں تعلیمِ دین و تبلیغِ جہاد کا سلسلہ ءدرس جاری رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ سوات میں انگریزوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا، یہاں تک کہ انگریز نے آپ کو برطانوی سامراج کے تحت ریاست سوات کی حکمرانی اور سالانہ ستر ہزار روپے گرانٹ کی پیشکش کی جسے آپ نے ٹھکرا دیا۔ بعد میں آپ اپنے آبائی وطن وزیرستان واپس لوٹے اور یہاں بھی برطانوی فوج کے خلاف زور و شور سے جہاد جاری رکھا۔ دلیری اور جرأت و شجاعت کے سبب آپ کو وزیرستان کا بادشاہ تسلیم

کیا گیا۔ آپ کا قول ہے: ''میں نے جہاد اللہ کی رضا اور اپنی سرزمین کے دفاع کے لیے شروع کیا ہے، اگر ضرورت پڑی تو اکیلے بھی جنگ لڑتا رہوں گا مگر انگریز کو وزیرستان میں داخل نہ ہونے دوں گا''۔ شروع میں آپ نے خفیہ کاروائیاں کیں مگر جب ۵۰۰۰ کا لشکر بنا تو باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔

۱۸۹۶ء کی ایک خفیہ دستاویز میں انگریز نے لکھا تھا: ''ملا پاوندہ مسعود قبائل کا سب سے بڑا مولوی ہے اور انگریزوں کے لیے مسائل پیدا کر رہا ہے۔ اس کی سازشیں سرحد کے جنوبی حصے میں انگریزوں کو پریشان کر رہی ہیں''۔ جبکہ 'لارڈ کرزن' (George Curzon) نے ملا پاوندہ کو ایک نمبر کا بدمعاش کہا۔ انگریزوں نے بارہا وفاداری کے بدلے ذاتی مراعات و مفادات کی لالچ دی مگر آپ نے کبھی قبول نہ کی۔ بعدازاں انگریز نے آپ کے خلاف ۱۳ انگریزوں کو قتل کرنے اور کئی وارداتوں کے الزام میں مقدمہ درج کیا اور آپ کی زمین ضبط کر لی۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کے بارے میں 'جنرل ایلیٹ' نے کہا: ''ملا پاوندہ نے برطانوی حکومت کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اپنے قبائلی معیار کے لحاظ سے وہ تعریف کے لائق ضرور تھا۔ مستقل مزاج اور مضبوط انسان۔ تاہم وہ انگریزوں کے خلاف تمام غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کرتا تھا''۔ یہ ذہن میں رہے کہ 'بدمعاش' کا لقب اس زمانے میں آج کل کے لقب 'دہشت گرد' کے مترادف تھا اور غیر قانونی ہتھکنڈے 'دہشت گردی' کے ہم معنی۔ اپنی زندگی کے دوران آپ نے قبائلی علاقوں میں علماء کا ایک بڑا گروہ تیار کیا جس نے علاقے میں دین کی تعلیمات اور جہاد کو فروغ دیا۔ آپ کی وفات ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔

لارڈ کرزن کی پالیسی

قبائل کی جنگوں سے تنگ آکر انگریزوں نے قبائل کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ جب 'لارڈ کرزن' ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا تو اس نے بہت سی اصلاحات شروع کیں۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں قبائل میں وہ نظام نافذ ہو گیا جو آج تک قائم ہے۔ اس نے ۱۹۰۱ء میں پشاور، مردان، کوہاٹ اور ڈیرہ اسماعیل خان کو پنجاب سے علیحدہ کر کے صوبہ سرحد کے نام سے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا۔ قبائل کی آزاد حیثیت کو مان لیا گیا۔ انگریزوں کی طرف سے ایک نمائندہ جسے پولیٹیکل ایجنٹ کا نام دیا گیا قبائل سے رابطے کے لیے مقرر کیا گیا۔ یہ پولیٹکل ایجنٹ قبائل کے ملکان کے ساتھ مل کر قبائلی عوام کے ساتھ رابطے میں رہتا تھا۔ اس طرح قبائل اور انگریزوں کے درمیان ایک حد بندی ہو گئی۔

رائل انڈین آرمی کی تنظیمِ نو

جہادِ افغانستان دوم کے بعد سلطنتِ برطانیہ میں موجود ہندوستانی فوجیوں کی کارکردگی پر بہت تنقید ہوئی۔ 'جنرل رابرٹس' نے... جو اس فوج کا کمانڈر تھا...ایک رپورٹ مرتب کی۔اس رپورٹ میں اس نے ہندوستانی فوج کی صلاحیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ فوج لارڈ کلائیو اور وارن ہاسٹنگ کے ان اصولوں پر بنائی گئی تھی جو اس وقت کے چیلنج تھے جن کا مقصد ہندوستان کو داخلی طور پر فتح کرنا اور وہاں برطانیہ کا قانون نافذ کرنا اور اس کی حفاظت کرنا تھا۔ مگر اب ایک سو سال بعد سلطنتِ برطانیہ کے چیلنجوں میں اضافہ ہو چکا ہے۔اب برطانیہ کو ان داخلی چیلنجوں کے علاوہ خارجی چیلنج بھی در پیش ہیں جن میں پہلا چیلنج مغرب کی جانب افغانستان میں روس کا راستہ روکنا ہے، دوسرا چیلنج اس بحری راستے کی حفاظت کرنا ہے جو برطانیہ کو ہندوستان سے بحر اوقیانوس اور نہر سویز سے گزار کر بحیرۂ احمر اور بحر ہند کے راستے ہندوستان تک لے آتا ہے اور تیسرا بڑا چیلنج بین الاقوامی سطح پر روس اور سلطنتِ عثمانیہ کو شکست دے کر برطانیہ کو سپر طاقت بنانا ہے۔ 'جنرل رابرٹس' نے ہندوستانی فوج کو ان تینوں چیلنجوں کے لیے مکمل طور پر غیر موزوں قرار دیتے ہوئے رائل انڈین آرمی کی مکمل تنظیمِ نو کی تجاویز دیں۔

جنرل رابرٹس کی ان تجاویز کو برطانیہ کی حکومت نے بہت سنجیدگی سے لیا اور ان تجاویز پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ابتدائی طور پر ۱۸۹۵ء میں ہندوستانی فوج کی ایک تنظیمِ نو ہوئی جس میں مدراس، بمبئی اور بنگال کی فوجوں کو ہندوستان پر روسی حملے کی صورت میں علاقوں کی حفاظت کی ذمہ داری کے حساب سے تقسیم کرنا تھا۔ البتہ رائل انڈین آرمی کی اصل تنظیمِ نو کرنے والا 'لارڈ کچنر' تھا۔ ۱۹۰۳ء میں کچنر کو ہندوستان میں فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا جو مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا۔ یہ وہی جنرل کچنر تھا جس نے سوڈان میں مہدی سوڈانی کی تحریکِ شریعت کو کچلنے کے لیے وہاں پر موجود مسلمانوں پر انتہائی مظالم کیے۔ پھر سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف جنگِ عظیم اول میں بھی یہی جنرل کچنر وزیرِ جنگ تھا۔ ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۰۹ء تک جنرل کچنر نے رائل انڈین آرمی کی جو تنظیمِ نو کی اس کی اہمیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ پاکستان کی فوج آج بھی اسی کا تسلسل ہے۔اس تنظیمِ نو کے لیے کچنر کے سامنے اُن چار مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی فوج کی صلاحیت میں اضافہ کرنا تھا جن کی نشان دہی جنرل رابرٹس نے اپنی رپورٹ میں کی تھی۔ وہ مقاصد یہ تھے:

1. داخلی طور پر لاء اینڈ آرڈر کو قائم رکھنا،
2. ہندوستان کی مغربی سرحد کو روس اور قبائل کے حملوں سے محفوظ رکھنا،

3. یورپ سے ہندوستان تک کے بحری راستے کی حفاظت کرنا، اور
4. سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف گریٹ گیم کی بین الاقوامی جنگ میں برطانیہ کو فوج فراہم کرنا۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے ایسٹ انڈیا آرمی کی قدیم ترتیب کو ...جو بنگال، مدراس اور بمبئی کی افواج کے نام سے تھی... ختم کرکے ان تینوں فوجوں کو ملادیا اور اس کی ترتیب جدید فوج کے نظام کے مطابق بٹالین، بریگیڈ اور ڈویژن کے انداز میں کردی۔ کچنر نے اس فوج کو نو ڈویژن فوج میں منظم کیا جس میں ہر ڈویژن کے ساتھ ایک گھڑ سوار بریگیڈ اور تین پیادہ بریگیڈ شامل تھے۔ پھر ہندوستان کو شمالی اور جنوبی کمانڈ کا نام دے کر ان نو ڈویژنوں کو ان علاقوں میں تقسیم کردیا۔ اس طرح شمالی کمانڈ میں راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ کے مقام پر ایک ایک ڈویژن کو تعینات کیا گیا، جبکہ جنوبی کمانڈ میں مہوہ، لکھنؤ اور سکندر آباد میں بھی ایک ایک بریگیڈ کو تعینات کیا گیا۔ اس فوج کا ایک ڈویژن برما میں بھی تعینات تھا۔ بحری راستے کی حفاظت کے لیے ایک بریگیڈ کو عدن (یمن) میں تعینات کیا گیا۔ اس فوج کو اس بات کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا کہ وقت آنے پر وہ سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف نفری فراہم کرسکے۔

جنرل کچنر کی اس تنظیمِ نو کا اصل حصہ یہ جدید ترتیبِ نو ہی نہیں تھی بلکہ فوج کے انتخاب اور اس کی تربیت کے اس نظام کی تنظیمِ نو تھی جس نے رائل انڈین آرمی کے مسلمان فوجیوں کو یہ صلاحیت بخشی کہ وہ سلطنتِ برطانیہ کی عظمت کی خاطر کسی بھی مسلمان قوت سے ٹکرا جائیں تو انھیں کوئی پرواہ نہ ہو اور ان کی فوجی کارروائی سے مسلمانوں کی خلافت ختم ہو جائے اور امتِ مسلمہ کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے جائیں تو ان کے ایمان پر کوئی آنچ نہ آئے، یہ فوجی بیت المقدس کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین کر صلیبیوں کے سپرد کردیں مگر خود ان کا اصرار یہی ہو کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان کارناموں کے عوض وہ سلطنتِ برطانیہ کے بڑے سے بڑے فوجی اعزاز کے حق دار ٹھہریں اور پھر بھی اپنے آپ کو امتِ مسلمہ کا حصہ کہیں۔ یہ ایک عجیب منطق ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسا ہی ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے۔ یہ کارنامہ مغرب کے اس لادین نظریہء جنگ کا تسلسل ہے جسے پروشیا کے جنرل کلازوٹ نے عیسائیت کے نظریہء جنگ کے مقابلے میں انیسویں صدی کے وسط میں پیش کیا اور جو بعد میں رفتہ رفتہ پورے یورپ کی افواج نے قبول کیا اور آج پوری دنیا کی وطنی افواج کا نظریہء جنگ ہے۔ کلازوٹ کے اسی نظریہء جنگ کی بنیاد پر رائل انڈین آرمی کا انتخاب اور نظامِ تربیت منظم کیا گیا۔

کلازوٹ کے نظریہء جنگ کے مطابق کوئی سپاہی لڑنے اور اپنی جان دینے کا حوصلہ چار مقاصد کے تحت پا سکتا ہے:

1. حب الوطنی کی خاطر،
2. اپنی رجمنٹ یا بٹالین کے وقار کی خاطر،
3. اپنے پیشے کی خاطر، اور
4. اپنے کسی ساتھی کی خاطر جسے انگریزی میں 'بڈی' (Buddy) کہتے ہیں۔

حب الوطنی ایک ایسا جذبہ ہے جس کے لیے انسان اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ اسی طرح جو رجمنٹیں تاریخی طور پر قدیم ہیں اور ان کی روایات مضبوط ہیں، وہ سپاہی کے لیے ایک قبیلہ بن جاتی ہیں اور سپاہی اس قبیلے کے وقار کے لیے جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ رجمنٹ کا وقار دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے؛ ایک رجمنٹ کی تاریخ اور دوسری اس کی روایات۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی جان اپنے پیشے کی انجام دہی کی خاطر بھی دے دیتا ہے، اس لیے ایک سپاہی کو پیشہ ور بنا کر لڑنے اور جان دینے کا حوصلہ دیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ انسان اپنے دوست کی جان بچانے کی خاطر بھی جان دے سکتا ہے۔

یہ وہ نظریات تھے جن کی بنیاد پر جنرل کچنر نے رائل انڈین آرمی کے تربیتی نظام کو از سر نو مرتب کیا۔ ملٹری کالج بنائے گئے جن کا مقصد یہ تھا کہ آٹھویں جماعت سے ایک بچے کو لے کر حب الوطنی، رجمنٹ اور دوستی کے ماحول میں پیشہ ور سپاہی کی طرح رکھا جائے۔ اس ماحول میں پروان چڑھنے والا بچہ (کیڈٹ) مغربی نظریہء جنگ کے لیے تیار ہو جاتا تو اسے ملٹری اکیڈمی میں افسر بننے کی تربیت کے لیے بھرتی کیا جاتا تھا۔ افسر بننے کے بعد اسے اکیڈمی میں کارکردگی کی بنیاد پر ایسی رجمنٹوں میں بھیج دیا جاتا تھا جن کی تاریخ اور روایات زیادہ مضبوط ہوں، یعنی جن کیڈٹوں کی کارکردگی جتنی اچھی ہو گی، وہ اتنی ہی قدیم تاریخ والی رجمنٹ میں جائے گا۔ اسی منصوبے کے تحت ۱۹۰۷ء میں کوئٹہ شہر میں افسروں کی تربیت کے لیے 'کمانڈ اور سٹاف کالج' قائم کیا گیا۔ اس طرح اب اس فوج کی پوری تنظیم، ترتیب اور تربیت کا ایسا مکمل انتظام ہو گیا جس نے رائل انڈین آرمی کے مسلمان افسروں اور سپاہیوں میں یہ صلاحیت پیدا کر دی کہ وہ آنے والے دنوں میں سلطنتِ عثمانیہ کو جنگِ عظیم اول میں شکست دیں اور امتِ مسلمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف وطنی ریاستوں میں تبدیل کر دیں۔

ایک طرف امتِ مسلمہ کے خلاف 'رائل انڈین آرمی' کی تنظیمِ نو ہو رہی تھی تو دوسری طرف دہلی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے کے مدرسے میں ایک درمیانے قد اور کمزور جسم مگر عقابی آنکھوں والا عالمِ ربانی ان حالات کا گہرائی سے جائزہ لے رہا تھا۔ ہندو پاک میں اپنوں کی غداری کی وجہ سے مسلمانوں کا زوال اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس زوال کی وجہ سے انگریزوں کو وہ قوت حاصل ہو گئی تھی جس سے وہ امتِ

مسلمہ کے مرکز خلافت عثمانیہ کو گرانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ یورپ سے خلافتِ عثمانیہ کے اثرات ختم کرنے کے لیے گریٹ گیم کی اصطلاح میں پوشیدہ برطانیہ، فرانس اور روس کی سازشیں اس کے سامنے تھیں۔ اس کی دور اندیش نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ وہ دن دور نہیں جب ملتِ اسلامیہ کے یہ تینوں دشمن مل کر مسلمانوں کے مرکز خلافت کو ختم کر دیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ تاریخ میں جب بھی امت پر ایسا وقت آتا ہے تو علمائے حق کبھی خاموش نہیں رہتے۔ لہٰذا وہ بھی کچھ کر گزرنے کی ٹھان چکا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ انگریزوں کی اصل طاقت وہ فوج اور وہ سرمایہ ہے جو اسے ہندوستان سے حاصل ہوتے ہیں اور ہندوستان کے بغیر انگریز کچھ بھی نہیں۔ اگر ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت ختم کر دی جائے تو وہ کبھی بھی سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف کوئی سازش نہیں کر سکتا۔ اسی کے پیشِ نظر وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ مسلمانوں کو اس فوج میں جانے سے روکنا ہے، انھیں یہ بتانا ہے کہ کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑنا کفر ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسے شجرِ جہاد کی تمام شاخوں کو بھی اکٹھا کرنا تھا تاکہ ایک منظم جہاد کا آغاز ہو سکے۔ چنانچہ یہ بزرگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن 'قصبہ دیوبند' میں اپنے حجرے سے نکلے اور پورے ہندوستان میں ایک تحریک برپا کر دی۔ اس تحریک کی تفصیلات ہم جنگِ عظیم اول کے واقعات میں لائیں گے ان شاءاللہ۔

جنگِ عظیم اول

'گریٹ گیم' اب اپنے کامیاب اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ۱۸۵۶ء کی 'پیرس کانفرس' سے ۱۹۱۲ء کی 'جنگِ بلقان' تک برطانیہ، فرانس اور روس تینوں نے مل کر کوئی ایسا موقع ضائع نہ ہونے دیا جس سے یورپ میں خلافتِ عثمانیہ کی طاقت کم ہوتی ہو۔ کریمیا کی جنگ ہو یا بلقان کی جنگ میں بلقان کی ریاستوں کی حمایت ہو، غرض مسلمانوں کی خلافت کو یورپ میں کمزور اور ناتواں کر دیا گیا۔ ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو آسٹریا کا ولی عہد 'فرڈینڈ' (Franz Ferdinand) جو سربیا کے دورے پر تھا، ایک طالبِ علم کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ آسٹریا نے اس کے قاتلوں کو گرفتار کر کے اپنے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ سربیا نے برطانیہ سے مدد کی اپیل کی۔ چند ہی ہفتوں میں یہ چھوٹا سا مسئلہ ایک جنگِ عظیم میں تبدیل ہو گیا۔ برطانیہ، روس اور فرانس اتحادی بن گئے جبکہ آسٹریا، جرمنی اور سلطنتِ عثمانیہ مقابل اتحاد بن گئے۔ جرمنی نے بلجیم اور فرانس پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کو روکنے کے لیے برطانیہ اور فرانس نے ایک مشترکہ فوج ترتیب دی۔ جرمنی نے فرانس میں اپنی دفاعی پوزیشنوں کو مستحکم کرنے کے لیے موریچوں کا ایک دفاعی نظام قائم کر دیا جس کے جواب میں برطانیہ اور فرانس نے بھی

اپنے اپنے دفاعی مورچے بنالیے۔ اسی لیے اس جنگ کو 'مورچوں کی جنگ' (Trench Warfare) کہتے ہیں۔

دوسری طرف برطانیہ اور فرانس کے پاس یہ سنہری موقع تھا کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کو ختم کر کے امتِ مسلمہ کے وسائل پر قبضہ کر لیں۔ اس وقت 'کچنر' وزیرِ جنگ تھا اور 'چرچل' (Winston Churchill) منصوبہ سازی کا ذمہ دار تھا۔ برطانیہ اور فرانس نے ترکی پر براہِ راست حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیا برطانیہ کے اپنے پاس اتنی فوج موجود ہے کہ وہ یہ جنگ لڑ سکے؟ جی ہاں، برطانیہ کے پاس کرائے کی پندرہ لاکھ ہندوستانی فوج تھی جو آدھی مسلمان سپاہیوں پر مشتمل تھی اور جو ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائیوں اور اپنی خلافت کو ختم کرنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

جنگِ عظیم اول میں ہندوستان اور رائل انڈین آرمی کا کردار

جنگِ عظیم اول کے دوران برطانیہ نے جنگوں کے لیے رائل انڈین آرمی کو 'سریع الحرکت افواج' (Expeditionary Forces) کی صورت میں منظم کیا:

- برطانیہ کی پہلی سریع الحرکت فوج جو رائل انڈین آرمی کے دو پیادہ ڈویژنوں (لاہور اور میرٹھ) پر مشتمل تھی، پہلے فرانس گئی اور وہاں بہت سا نقصان اٹھانے کے بعد چوتھی سریع الحرکت فوج کے ساتھ مصر بھیج دی گئی۔
- دوسری سریع الحرکت فوج کو جو بنگلور بریگیڈ، سکندر آباد ڈویژن اور ایمپیریل سروس بریگیڈ پر مشتمل تھی، مشرقی افریقہ بھیجا گیا تاکہ وہاں پر موجود جرمنی کی فوج کے خلاف لڑے۔
- تیسری سریع الحرکت فوج کو جو ایمپیریل سروس کی چار بٹالینوں اور ۲۹ پنجاب بٹالین پر مشتمل تھی، یوگینڈا سے ممباسہ ریلوے لائن کی حفاظت پر مامور کیا گیا۔
- چوتھی سریع الحرکت فوج جو پہلے چھٹی پونا ڈویژن پر مشتمل تھی، 'جنرل ٹاؤن شیڈ' (Charles Townshend) کی قیادت میں ترکوں سے شکست کھا گئی۔ پھر اس کے بعد چھ ڈویژن فوج 'جنرل سٹیلنے موڈی' (Stanely Maude) کی قیادت میں منظم کی گئی جو چھٹی پونا، ساتویں میرٹھ، بارہویں، چودھویں، سترہویں اور اٹھارویں انڈین ڈویژنوں پر مشتمل تھی، اس کا کام بغداد فتح کرنا تھا۔

- پانچویں سریع الحرکت فوج چوتھے اور پانچویں گھڑ سوار ڈویژنوں، میرٹھ اور لاہور کے پیادہ ڈویژنوں اور ایمپریل سروس ڈویژن پر مشتمل تھی جس کی قیادت 'جنرل ایلن بی' (Edmund Allenby) کر رہا تھا۔ اس فوج کا مقصد فلسطین اور شام کو فتح کرنا تھا۔
- چھٹی سریع الحرکت فوج دسویں اور گیارہویں انڈین ڈویژنوں پر مشتمل تھی اور اس کا مقصد نہر سویز کی حفاظت کرنا تھا۔
- ساتویں سریع الحرکت فوج کو جو انتیسویں انڈین بریگیڈ پر مشتمل تھی، گیلی پولی کے محاذ پر بھیجا گیا جہاں اسے بہت سا نقصان اٹھانے کے بعد واپس مصر بھیج دیا گیا۔

برطانیہ کا ترکی پر قبضے کا منصوبہ

۱۹۱۵ء میں چرچل نے برطانیہ کی حکومت کو ایک منصوبہ ارسال کیا جس میں برطانیہ کی بحریہ اور بری فوج کو درۂ دانیال پر مشترکہ حملہ کرنے کی تجویز دی گئی تھی۔ اس منصوبے کے مطابق برطانوی بحری بیڑے نے پہلے درۂ دانیال پر حملہ کرکے برطانوی فوج کو وہاں پر اتارنا تھا اور اس کے بعد درۂ دانیال میں داخل ہو کر آبنائے باسفورس کے دوسرے کنارے پر قبضہ کرنا اور استنبول کو برطانوی توپوں کی زد میں لینا تھا۔ چرچل کا خیال تھا کہ اس طرح عثمانی حکومت کسی بھی قیمت پر صلح کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ تاہم وزیرِ جنگ جنرل کچنر نے اس منصوبے سے یہ کہتے ہوئے اتفاق نہ کیا کہ اس وقت فوج کو یورپ کے کسی بھی محاذ سے نکالنا بہت خطرناک ہوگا۔ جنرل کچنر اور ایڈمرل 'جان فیشر' (John Fisher) کے اس اعتراض کے جواب میں چرچل نے مشورہ دیا کہ اگر یہ ممکن نہ ہو تو بری حملے کی جگہ مختصر فوج کے ساتھ صرف بحری حملہ کیا جائے تو بھی ان مقاصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایڈمرل فیشر کو اس منصوبے پر بھی اعتراض تھا مگر اچانک ہی عثمانی بحریہ کا ایک تار جو انھوں نے اپنے مرکز کو گولے بارود کی کمی کی شکایت کے لیے لکھا تھا، برطانوی فوج کے ہاتھ لگ گیا۔ اس تار کے ملنے پر ایڈمرل فیشر کو اس منصوبے کی کامیابی کا یقین ہو گیا اور وہ اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے تیار ہو گیا۔

۱۵ مارچ ۱۹۱۵ء کو سولہ بحری جہازوں پر مشتمل 'ایڈمرل کارڈن' (Admiral Carden) کی قیادت میں برطانیہ اور فرانس کا بیڑا ابحر او قیانوس سے ترکی کی طرف روانہ ہو گیا۔ حملے سے ایک دن پہلے ایڈمرل کارڈن پر دماغی مرض کا حملہ ہوا تو اس نے اس حملے کی قیادت اپنے نائب 'روبیک' (de Robeck) کے حوالے کر دی۔ ۱۸ مارچ کو یہ بحری بیڑا ترکی کی ساحلی چوکیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں اپنے دفاع کے لیے ترکی فوج نے پانی میں بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں۔ ایڈمرل روبیک اچھی طرح جانتا تھا کہ آگے بارودی

سرنگیں بچھی ہیں، اس لیے اس نے ان سرنگوں کو صاف کرنے کا حکم دیا۔ جیسے ہی سرنگ صاف کرنے کا کام شروع ہوا تو فرانسیسی جہاز 'بووے' (Bouvet) ایک بارودی سرنگ سے ٹکرا گیا اور دو منٹ کے اندر اندر سمندر میں غرق ہو گیا۔ اس کے کپتان نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا اور اس طرح تمام عملہ بھی اس جہاز کے ساتھ غرق ہو گیا۔ دو برطانوی جہاز 'اوشن' (Ocean) اور 'اِرریزسٹ ایبل' (Irresistible) بھی بارودی سرنگوں سے ٹکرا کر ڈوب گئے۔ تین مزید جہاز جن میں برطانوی 'اِن فلکسیبل' (Inflexible)، فرانسیسی جہاز 'گلوا' (Gaulois) اور 'سوفرن' (Suffren) شامل تھے، بارودی سرنگوں سے ٹکرا کر بے کار ہو گئے۔

چند منٹوں کے اندر اندر اتحادیوں کے چھے جہاز ڈوب چکے تھے۔ اس لمحے ایڈمرل روبیک کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ حملہ جاری رکھے یا واپس پسپا ہو جائے۔ اس نے بری فوج کے کمانڈر 'این ہملٹن' (Ian Hamilton) سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ پسپا ہونے سے پہلے بری فوج کے کچھ حصے کو خشکی پر اتار کے ایک طرف کے علاقے پر قبضہ کرنا چاہیے۔ اس منصوبے کو تار کے ذریعے لندن بھیجا گیا اور ان کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

چرچل نے پسپا ہونے کی شدید مخالفت کی کیونکہ استنبول اب صرف ایک گھنٹے کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ حملے کا مشورہ دیا، مگر بحریہ کے ایڈمرل فیشر نے دوبارہ حملہ کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں برطانیہ اور فرانس کا یہ حملہ ناکام ہو گیا۔

ترک فوج کا نہر سویز پر حملہ

۱۵ جنوری ۱۹۱۵ء کو ترکی فوج نے صحرائے سیناء کی طرف سے مصر میں برطانیہ کی مقبوضہ نہر سویز پر حملہ کرنے کے لیے اپنی فوج 'جمال پاشا' کی قیادت میں بھیجی۔ یہ نہر برطانیہ کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی نہر کے ذریعے برطانیہ اپنے مقبوضہ ہندوستان سے مالی اور عسکری مدد کے لیے رابطہ رکھتا تھا۔ اگر اس راستے کو ختم کر دیا جاتا تو برطانیہ شدید مشکلات سے دوچار ہو سکتا تھا۔ جمال پاشا کی قیادت میں پندرہ ہزار فوجی صحرائے سینا میں سو میل کا سفر کر کے اس نہر پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ ۲۲ فروری ۱۹۱۵ء کو اس فوج نے حملہ کر دیا۔ جمال پاشا کا مقابلہ نہر سویز کی حفاظت پر مامور بلوچ رجمنٹ سے تھا جو ہندوستان کی چھٹی سریع الحرکت فوج پر مشتمل اور دسویں اور گیارہویں انڈین ڈویژنوں کا حصہ تھی۔ مسلسل حملوں کے باوجود جمال پاشا نہر پر قبضہ نہ کر سکا اور اسے واپس صحراء کی طرف پسپا ہونا پڑا۔

گیلی پولی کی جنگ

جنرل کچنر جو پہلے مشرقِ وسطیٰ میں فوج بھیجنے کا سخت مخالف تھا، اب وہ چرچل کے منصوبے یعنی ترکی پر مکمل فوجی قبضے کا حامی ہو چکا تھا اور وہاں بری فوج بھیجنے پر تیار ہو گیا۔ ۲۲اپریل ۱۹۱۵ء کو برطانوی فوج جو آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور فرانس کے فوجیوں پر مشتمل تھی، درۂ دانیال کے مغربی کنارے 'گیلی پولی' پر حملہ کرنے کے لیے جہازوں پر سوار ہوئی۔ اس فوج کے قائد 'جنرل این ہملٹن' کو یہ حکم ملا کہ وہ گیلی پولی پر قبضہ کرنے کے بعد استنبول پر قبضہ کرے۔ لندن میں بیٹھے برطانوی قائدین چند دنوں میں ایک بہت بڑی فتح کا انتظار کر رہے تھے۔ ۲۵اپریل ۱۹۱۵ء کو اسّی ہزار برطانوی فوجی 'اینزک کوو' (Anzac Cove) اور 'کیپ ہیلس' (Cape Helles) میں اترے جبکہ فرانسیسی فوجی 'کم کلے' (Kum Kale) میں اترے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے فوجی دستے جنھیں 'اینزک' کہا جاتا تھا، اپنی مطلوبہ جگہ سے ایک میل دور اترے۔ ان کی توقع کے برخلاف انھیں ہموار چڑھائی کی بجائے عمودی پہاڑی چڑھائی کا سامنا کرنا پڑا۔ عمودی چٹانوں کا سلسلہ اس طرح بنا ہوا تھا کہ اس نے میدانی علاقوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں کاٹ رکھا تھا۔

اینزک فوجوں نے حملہ کر دیا۔ اس جگہ کی کمانڈ 'کرنل مصطفیٰ کمال'[44] کر رہا تھا اس کے ساتھ ترکی فوج کے انیسویں ڈویژن کے فوجی تھے۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ کرنل کمال کو اپنے اعلیٰ افسروں کی طرف سے کوئی حکم نہ ملا تھا، تاہم اسے کچھ تو کرنا تھا۔ ترکی فوجی اپنی جگہ چھوڑ کر پسپا ہونے لگے تو اس نے انھیں ڈٹ جانے کا حکم دیا اور خود لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کمال کو تازہ دم دستوں کی مدد بھی حاصل ہو گئی اور اس نے اینزک حملے کو پسپا کر دیا۔

دوسری طرف ہیلس کے ساحل پر برطانوی فوج دن کی روشنی میں حملہ آور ہوئی۔ دو بٹالین فوج جو جہاز سے نمودار ہوئی تھی، اس کے اکثر فوجی ساحل تک پہنچنے سے پہلے ہی ترک فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ایک برطانوی ہوا باز جو اس وقت جہاز اڑا رہا تھا، اس نے رپورٹ بھیجی کہ ساحل سے پچاس گز تک سمندر کا پانی خون سے سرخ ہو چکا ہے۔ رات کا اندھیرا چھا چکا تھا مگر اتحادی فوجوں کا کوئی بھی ہدف پورا نہیں ہوا تھا۔ تمام عسکری اہمیت کی جگہیں ترکوں کے ہاتھ میں تھیں۔ اس پوزیشن میں تین ہفتے گزر گئے۔ ترکوں نے اینزک فوج

---

[44] یہ وہی بدبخت مصطفیٰ کمال اتاترک ہے جس نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کا اعلان کیا تھا اور ترک وطنیت کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی نے ترکی میں بالجبر اسلام کی جگہ سیکولرزم کو فروغ دیا۔ لعنة الله عليه!

کو ساحل کی طرف پیچھے دھکیلنے کے لیے حملہ کیا، مگر وہ اس میں ناکام رہے۔ اب یہ جنگ کا معمول بن گیا کہ برطانوی بہت قربانیوں کے بعد کسی عسکری اہمیت کی جگہ پر قبضہ کرتے تو ترک حملہ کر کے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیتے۔اسی طرح جنگ جاری رہی۔

۶ اگست ۱۹۱۵ء کو برطانوی فوج نے 'اینزک کوو' کے شمال میں واقع 'خلیج سوفلہ' (Suvla Bay) پر تازہ دم فوج کے ساتھ حملہ کیا۔اگرچہ یہ حملہ بہت سرعت سے کیا گیا تھا مگر پھر بھی ناکام رہا۔ کچھ دن بعد کرنل مصطفٰی کمال کی قیادت میں ترکی فوج نے خلیج سوفلہ پر حملہ کیا اور برطانوی فوج کو آدھا میل سمندر کی طرف دھکیل دیا۔ ترکوں نے ایک دفعہ پھر عسکری اہمیت کی جگہوں پر قبضہ کر لیا۔ برطانوی فوج عددی طور پر اپنے سے کئی گنا کم فوج سے بار بار شکست کھاتی رہی۔ گرمیاں گزر گئیں اور سردی کی آمد آمد تھی مگر 'گیلی پولی' کا میدان ان معرکوں سے ابھی تک گرم تھا۔ ترک فوج عسکری اہمیت کی تمام جگہوں پر اسی طرح قابض رہی جس طرح پہلے دن سے قابض تھی۔ برطانوی فوج میں بیماری وباء کی شکل میں پھیلنے لگ گئی، سپاہیوں میں ہیضہ اور پیچش کے امراض بہت زیادہ بڑھ گئے۔ ہندوستان سے ساتویں سریع الحرکت فوج کو گیلی پولی کے محاذ پر بھیجا گیا تاکہ وہ وہاں پھنسی ہوئی فوج کی مدد کر سکے مگر اس فوج نے بہت نقصان اٹھایا اور اسے واپس مصر بھیج دیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۱۵ء میں لندن کی وزارتِ جنگ نے 'جنرل ہملٹن' سے پسپائی کے بارے میں مشورہ طلب کیا تو اس کا جواب تھا کہ پسپائی اتنی خطرناک ہے کہ اس کے آدھے فوجی پسپائی کے دوران قتل ہو سکتے ہیں۔کچھ دنوں کے بعد ہملٹن کی جگہ جنرل 'چارلس منرو' (Charles Monro) کو نیا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ اس نے محاذ کا مشاہدہ کر کے رپورٹ بھیجی کہ یہ فوج اب لڑنے کے قابل نہیں رہی اور اس کو فوراً محاذ سے نکال لینا چاہیے۔ نومبر ۱۹۱۵ء کو وزیرِ جنگ کچنر نے میدانِ جنگ کا خود مشاہدہ کر کے پسپائی کا حکم جاری کیا۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۵ء کو برطانوی فوجی بحری جہازوں پر واپسی کے لیے سوار ہونا شروع ہوئے اور ۹ جنوری ۱۹۱۵ء کو تمام فوج واپس چلی گئی۔اس شکست کے بعد چرچل کو سزا کے طور پر ایک معمولی عہدے پر فائز کر دیا گیا۔

برطانیہ کا عراق پر پہلا حملہ

دوسری طرف برطانوی فوجوں نے اپریل ۱۹۱۵ء کو جنرل 'ٹاؤن شیڈ' کی قیادت میں دریائے دجلہ کے کنارے کی طرف پیش قدمی شروع کی۔اس پیش قدمی کا مقصد ایران میں موجود تیل کے ذخائر کی حفاظت کرنا تھا۔ مئی ۱۹۱۵ء تک اس نے ترک فوجوں کو دریا کے دوسرے کنارے تک دھکیل دیا۔ جنرل 'جان نکسن' (John Nixon) جو جنرل ٹاؤن شیڈ کا کمانڈر تھا، افواج کی کمی کے باوجود جنرل ٹاون شیڈ سے مزید فتوحات

کے لیے اصرار کرتا رہا۔ اس کا اصرار تھا کہ سال کے آخر تک بغداد بھی فتح کر لیا جائے۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو ٹاؤن شیڈ کی افواج نے کوت العمارہ پر حملہ کیا اور شام ہونے تک اس شہر کو فتح کر لیا۔ جنرل ٹاؤن شیڈ کے ساتھ ہندوستان سے آئی ہوئی چوتھی سریع الحرکت فوج تھی۔ جنرل نکسن اس فتح سے مطمئن نہ تھا۔ اس نے ٹاؤن شیڈ کو مزید آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ٹاؤن شیڈ نے گیارہ ہزار فوج کے ساتھ 'ٹیسیفان' (Ctesiphon) شہر کی طرف پیش قدمی شروع کی۔

ٹیسیفان میں نورالدین پاشا کی قیادت میں بیس ہزار ترکی فوج نے اس کا مقابلہ کیا۔ ٹیسفان کی لڑائی چار دن اور چار راتیں جاری رہی۔ مگر جنرل ٹاؤن شیڈ ترکی فوجوں کو شکست دینے میں ناکام رہا اور کوت العمارہ کی طرف پسپا ہو گیا۔ ترک فوجوں نے اس کا پیچھا کیا اور چار دن بعد کوت العمارہ کا محاصرہ کر لیا۔ ٹاؤن شیڈ کے پاس اسلحہ اور خوراک کے ذخائر موجود تھے، اس لیے اس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ عراق میں کوت العمارہ کے مقام پر جنرل ٹاؤن شیڈ کی تیرہ ہزار افواج ترک فوجوں کے گھیرے میں تھیں۔ ترکوں نے ایک مؤثر عسکری قوت کوت العمارہ کے محاصرے کے لیے جمع کر لی تھی۔ اس دوران استنبول سے جرمن فیلڈ مارشل 'ونڈر گال' (Colmar von der Goltz) عراق میں برطانیہ کے خلاف جنگ کی قیادت کرنے پہنچا۔ ونڈر گال کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ دشمن کا محاصرہ کر کے اسے ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس لیے اس نے برطانوی فوجوں کا محاصرہ سخت کر دیا۔ جنوری ۱۹۱۵ء سے اپریل تک جنرل 'ایف جے المر' (Aylmer) کی قیادت میں برطانوی فوج باہر سے ترکوں کے محاصرے کو توڑنے کی سر توڑ کوشش کرتی رہی مگر اس کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اس دوران جنرل ٹاؤن شیڈ کی محصور فوج کے پاس خوراک اور اسلحہ کے ذخائر ختم ہونا شروع ہو گئے۔ جنرل المر نے دریائے دجلہ کے راستے کشتی کے ذریعہ خوراک اور اسلحہ پہنچانے کی کوشش کی۔ چاندنی رات میں ایک کشتی دریائے دجلہ میں روانہ ہوئی مگر وہ جلد ہی دریا میں ترک فوجوں کی بچھائی ہوئی تار میں پھنس گئی اور اپنے عملے سمیت ترک فوج کے ہاتھ لگ گئی۔ اپنی شکست کے واضح آثار دیکھتے ہوئے ۲۷ اپریل ۱۹۱۵ء کو برطانوی فوج نے اپنی توپوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ ترکوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔

۲۹ اپریل ۱۹۱۵ء کو تیرہ ہزار برطانوی اور ہندوستانی فوجیوں نے اپنے جرنیل سمیت ترک فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس جنگ میں برطانوی نقصان کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ٹاؤن شیڈ کی تیرہ ہزار فوج کے قید ہونے کے علاوہ محاصرے کو توڑنے کی کوشش میں جنرل المر کے تئیس ہزار فوجی مارے گئے۔ اس جنگ سے برطانیہ میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ دوسری طرف ترک فوجوں نے دریائے دجلہ کے کنارے اپنی پوزیشن

مستحکم کرنا شروع کردی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ برطانوی فوج بغداد کو فتح کرنے کی دوبارہ کوشش ضرور کرے گی۔

برطانیہ کا عراق پر دوسرا حملہ

ادھر برطانیہ میں گیلی پولی اور کوت العمارہ کی شکستوں نے برطانوی عوام کو وزیر اعظم 'ہربرٹ' (Herbert Asquith) کے خلاف کردیا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء کے انتخابات میں برطانوی عوام نے 'ڈیوڈ لائیڈ جارج' (David Lloyd George) کو وزیر اعظم منتخب کیا۔ ڈیوڈ لائیڈ جارج انتہائی متعصب اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ اس نے اپنا نصب العین اور مقصد ہی خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ رکھا ہوا تھا۔ عراق کی شکست سے سبق سیکھتے ہوئے برطانوی وزارتِ جنگ نے برطانوی فوج کو از سر نو منظم کیا اور جنرل 'پرسی لیک' کو عراق کے محاذ کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ جنرل پرسی لیک کے ساتھ ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار کی فوج تھی جس کی دو تہائی تعداد ہندوستانی فوجیوں پر مشتمل تھی۔ اس نے 'جنرل سٹنلے موڈی' کو بغداد فتح کرنے کا حکم دیا۔ جنرل موڈی کے ساتھ ہندوستان کی چوتھی سریع الحرکت فوج تھی۔ یہ فوج چھ انڈین ڈویژنوں پر مشتمل تھی۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں اس نے 'کوت العمارہ' پر حملہ کرکے اس کا محاصرہ کرلیا۔ ترکی فوج بغداد کی طرف پسپا ہوگئی اور اس طرح برطانوی فوج دوبارہ کوت العمارہ پر قابض ہوگئی۔ جنرل موڈی نے ترک فوج کا پیچھا کیا اور اسے بغداد کے شمال میں دھکیل دیا جس کی وجہ سے بغداد کا دفاع ٹوٹ گیا۔ گیارہ مارچ ۱۹۱۷ء کو موڈی بغیر کسی جنگ کے بغداد پر قابض ہوگیا۔

عثمانیوں کا روسی محاذ

دسمبر ۱۹۱۴ء میں ترک عثمانی فوج نے قوقاز کے علاقے 'زرکمش' (Sarikamish) کی جانب پیش قدمی شروع کردی جہاں اس سے قبل روس نے قبضہ کرلیا تھا۔ ترک فوج چاہتی تھی کہ روس کو پیچھے دھکیل دیا جائے، لیکن ترک فوج کی اس کارروائی کا الٹا نتیجہ برآمد ہوا۔ برفانی حالات کی سنگینی ترک فوج کے آڑے آگئی اور جنوری ۱۹۱۵ء میں ترک فوج بے شمار جانی نقصان اٹھاتے ہوئے اس حال میں واپس ہوئی کہ قوقاز کی سمت روس کے لیے محفوظ اور عثمانیوں کے لیے غیر محفوظ ہوگئی۔ مئی ۱۹۱۵ء میں روس نے 'ایرزُرم' (Erzurum) کی شہر پناہ کی جانب پیش قدمی کی۔ جنرل 'یوڈن ایچ' (Nikolai Yudenich) کی اسّی ہزار فوج نے 'وان' (Van) شہر فتح کرنے کے بعد 'مش' (Mush) شہر کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ اس محاذ پر

تقریباً پچاس ہزار ترک فوجی دفاع پر معمور تھے، مگر ان کے پاس اسلحہ اور خوراک کے ذخائر کی شدید کمی تھی۔ اس محاذ پر بروقت اسلحہ اور خوراک کی ترسیل بہت مشکل تھی کیونکہ سڑکوں اور ریلوے کا نظام نامکمل حالت میں تھا۔ پھر گیلی پولی سے عراق تک فوج کو پہنچانا تو آسان تھا مگر گیلی پولی سے مشرقی محاذ تک کا وقت چھ سے آٹھ ہفتے کا تھا۔ ان مشکلات کے باوجود ترکی افواج نے روس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے مفتوحہ علاقے واپس لے لیے۔ ان کارروائیوں میں دونوں طرف کا جانی اور مالی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ یہ حالات دیکھ کر زار روس نے ستمبر ۱۹۱۵ء میں قوقند کے اس محاذ پر اپنے چچا 'گرینڈ ڈیوک نیکولس' (Grand Duke Nicholas) کو بھیجا۔ محاذ کی حالت دیکھ کے اس نے ایک سال تک جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس دوران وہ آئندہ آنے والی جنگوں کی تیاری میں مصروف رہا۔ جنوری ۱۹۱۶ء کو اس نے دوبارہ جنگ کا آغاز کر دیا اور ترک فوج کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ترک فوج پسپا ہو کر 'ایرزرم' کے قلعہ میں محصور ہو گئی۔ فروری ۱۹۱۶ء کو ایرزرم کا قلعہ بھی ترک فوج کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ایرزرم کا ہاتھ سے نکل جانا ترک فوج کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا۔ اس خبر کو کئی ماہ تک سلطان سے بھی چھپا کے رکھا گیا۔ اگست تک روسی فوجوں نے عثمانی خلافت کا بہت سا علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس جنگ میں ترکوں کی دوسری اور تیسری فوج کو روس کے ہاتھوں بہت بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

تحریکِ شیخ الہند

جنگِ عظیم اول میں جہاں ایک طرف برطانیہ اور فرانس، روس کے ساتھ مل کر امتِ مسلمہ کو توڑنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تو دوسری طرف حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت پر کاری ضرب لگانے کے لیے سرگرم ہو چکے تھے۔ آپ جان چکے تھے کہ جنگِ عظیم اول کے دوران برطانیہ کی اصل قوت ہندوستان ہے۔ آپ کا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان کی حکومت اور غیور قبائل کو ساتھ ملا کر مجاہدین کی ایک فوج بنائی جائے جو جہاد کر کے ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت ختم کر دے اور جب ہندوستان میں برطانیہ کو شکست ہو گی تو وہ جنگِ عظیم اول میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف کھڑا نہ رہ سکے گا۔

البتہ اس منصوبہ کی کامیابی کے لیے یہ ضروری تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کو اپنے ساتھ ملایا جائے اور ان سے ایک فتویٰ لکھوا کر امیر افغانستان حبیب اللہ کو جہاد کے لیے قائل کیا جائے۔ دوسری طرف قبائل کے علمائے کرام اور مجاہدین سے رابطہ کر کے ان کو اس جہاد کے لیے تیار کیا جائے۔ اور تیسری طرف ہندوستان کی فوج میں شامل

مسلمان فوجیوں کو بتایا جائے کہ انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑنا حرام ہے اور اس طرح مرنے والا سراسر کافر اور جہنمی ہے۔

جہاں تک تحریکِ مجاہدین اور قبائلی مجاہدین کا تعلق تھا تو وہ سب تیار تھے۔ اس طرح تحریکِ شیخ الہند میں شجرِ جہاد کی تمام شاخیں جمع ہو گئی تھیں۔ شمالی قبائل باجوڑ، مہمند اور آفریدی 'حاجی صاحب ترنگ زئی' کی قیادت میں اور جنوبی قبائل وزیرستان میں 'شہزادہ فضل دین' کی قیادت میں اکھٹے تھے۔ ۱۹۱۵ء کو حضرت شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان میں امیر حبیب اللہ کے پاس بھیج دیا اور خود حجاز کے گورنر غالب پاشا سے ملنے کے لیے مکہ کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے اس جہاد کو شروع کرنے کی اجازت حاصل کر سکیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی اکتوبر ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچے۔ انھیں افغانستان کے امیر حبیب اللہ کو ہندوستان میں جہاد کے لیے قائل کرنا تھا۔ امیر حبیب اللہ انگریزوں کا حامی تھا مگر وہ اس کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا بھائی اور نائبِ سلطنت نصر اللہ انگریزوں کے خلاف تھا اور افغانستان کی پوری قوم بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے تیار تھی۔ امیر حبیب اللہ نے جب اس معاملے کے لیے اہلِ شوریٰ کو بلایا تو تمام اہلِ شوریٰ نے جہاد کی حمایت کر دی۔ اب حبیب اللہ کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔

امیر حبیب اللہ نے اپنے دو چہرے بنا لیے؛ ایک انگریزوں کو دکھانے والا چہرہ جو اس کا اصل چہرہ تھا اور دوسرا جہادی چہرہ جو عوام اور مجاہدین کو دکھانے کے لیے تھا۔ اس نے انگریزوں پر یہ واضح کر دیا کہ وہ عوام اور مجاہدین کو روک نہیں سکتا کیونکہ جنگِ عظیم اول کی وجہ سے تمام لوگ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے پر تیار ہیں، البتہ وہ انگریزوں کی یہ خدمت کر سکتا ہے کہ عوام اور مجاہدین کے اس ردِ عمل کو آہستہ کر دے یا ان کے راستے میں روڑے اٹکائے تاکہ انگریزوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف جنگ میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ انگریزوں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ چنانچہ امیر حبیب اللہ نے جہاد کی مخالفت نہ کی بلکہ کہا کہ جہاد کے لیے امیر اور بیعت کی ضرورت ہے، اس لیے جو بھی جہاد کرنا چاہتا ہے وہ امیر نصر اللہ کے پاس درخواست دے۔ دوسری طرف اس نے بہانہ بنایا کہ روس کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے، اس سے اطمینان کے بغیر انگریزوں کے ساتھ جہاد ممکن نہیں۔ حبیب اللہ کی ان کوششوں سے افغان عوام تو متاثر ہوئے مگر قبائل میں جہاد کی لہر دوڑ گئی۔ شہزادہ فضل دین اور حاجی صاحب ترنگ زئی نے میدانِ کارزار گرم کر دیا۔

جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن غالب پاشا اور انور پاشا سے افغانستان، قبائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے نام انگریزوں کے خلاف جہاد کی اپیل اور فتویٰ ہندوستان روانہ کر چکے تھے تو حجاز میں شریف حسین کی بغاوت شروع ہوگئی۔ شریف حسین نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ، مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے ان علماء کو مالٹا بھیج دیا جہاں سے انھیں ۱۹۲۰ء میں جنگ ختم ہونے کے بعد رہائی ملی۔ رہائی کے کچھ ماہ بعد ہی حضرت شیخ الہند کا انتقال ہو گیا۔

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری سے آپ کی تحریک کو خاصہ نقصان پہنچا اور یہ عالمی منصوبہ ناکام ہو گیا۔ تاہم اس کے باوجود آپ کی تحریک نے ہندوستان اور افغانستان میں دوررس اثرات مرتب کیے جن کا ذکر ہم مناسب موقع پر کریں گے۔

برطانیہ کا فلسطین پر حملہ

گیلی پولی اور کوت العمارہ کی عبرت ناک شکست کے بعد برطانوی فوج نے ایک اور منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد مصر سے فلسطین پر حملہ آور ہونا تھا۔ اس فوج کی قیادت جنرل 'مرے' (Archibald Murray) کر رہا تھا۔ اس حملے سے پہلے جنرل مرے نے ہزاروں فوجی اور مصری مزدوروں کی مدد سے ایک فٹ چوڑی پانی کی پائپ لائن بچھائی اور اس کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن بچھانے کا کام بھی شروع کیا گیا۔ اس سارے کام میں جنرل مرے نے چھ ماہ کا وقت لیا۔ اب برطانوی فوج کی دفاعی تیاریاں مکمل تھیں۔ عثمانیوں کی چوتھی فوج اس برطانوی فوج کے حملے کو روکنے کے لیے تیار تھی۔ جنرل مرے کے ساتھ ہندوستانی پانچویں سریع الحرکت فوج تھی۔ اس فوج میں آج کی پاکستانی فوج کی سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں گھڑ سوار رجمنٹیں شامل تھیں۔

غزہ کی پہلی لڑائی

جنرل مرے نے پہلے 'غزہ' پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جنرل 'چارلس ڈوبل' (Charles Dobell) کو حکم دیا کہ وہ غزہ پر حملہ کرے۔ ڈوبل کے پاس مناسب مقدار میں عسکری قوت موجود تھی، خاص طور پر اس کے ساتھ صحرائی جنگ کی مہارت رکھنے والا گھڑ سوار دستہ موجود تھا۔ تاہم اس صحرائی دستے کے ساتھ دس ہزار گھوڑے بھی تھے جنھیں پینے کا پانی چاہیے تھا۔ پانی کے ذخائر غزہ میں تھے۔ لہٰذا اس مہم کی کامیابی غزہ کے پانی کے کنووں کے ساتھ وابستہ تھی۔ ۱۹۱۷ء کے موسمِ بہار کے آغاز میں فلسطین میں جنرل مرے نے

اپنی فوج کا بڑا حصہ غزہ کو فتح کرنے کے لیے بھیج دیا۔ عثمانی فوج نے بھی 'بئر شیبہ' سے غزہ تک دفاعی مورچے قائم کردیے۔ برطانوی فوج نے اس دفاعی لائن کو توڑنے کی کوشش کی یہاں تک کہ جنگ کے ایک مرحلے میں غزہ کا مکمل محاصرہ کرلیا گیا۔ ایسے میں ترک فوج نے نکل کر برطانوی گھڑ سوار دستے کو گھیرنے کے لیے اقدام کیا لیکن جنرل مرے ان کولے کر پسپا ہوگیا۔ گھڑ سوار دستے کی مدد سے محروم ہوکر برطانوی پیادہ فوج ترکی فوج کے حملے کی زد میں آگئی اور اسے بھی پسپا ہونا پڑا۔

غزہ کی دوسری لڑائی

۱۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو جنرل مرے نے غزہ پر دوبارہ حملے کا حکم دیا۔ جواب میں ترک فوج انتہائی بے جگری سے لڑی۔ اس کے سپاہی ایک مورچے سے دوسرے مورچے میں بھاگ بھاگ کر لڑتے رہے اور اس حملے کو ناکام بنادیا۔ ترکوں کے جوابی حملے سے برطانوی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ ان ناکامیوں کے بعد جنرل مرے کو تبدیل کرکے یورپی محاذ سے جنرل 'ایلن بی' کو اس محاذ کا نیا کمانڈر بنادیا گیا۔ جنرل ایلن بی ساری گرمیاں جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہا۔

غزہ کی تیسری لڑائی

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ایلن بی نے غزہ پر تیسرے حملے کا حکم دیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی فوج غزہ پہنچ گئی اور اس فوج نے بیک وقت غزہ اور بئر شیبہ پر حملہ کردیا۔ ایلن بی کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ دونوں طرف کی ترک افواج کو مصروف کرکے پہلے بئر شیبہ پر قبضہ کیا جائے اور پھر دونوں قوتوں کو جمع کرکے غزہ پر قبضہ کیا جائے۔ اس کی یہ حکمتِ عملی کامیاب رہی اور بئر شیبہ فتح ہوگیا۔ تاہم جب اس نے غزہ پر حملہ کیا تو ترک فوجوں نے جرأت اور شجاعت کی مثالیں قائم کردیں۔ غزہ کے مجاہدوں نے نو ماہ تک انتہائی بہادری سے اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقت ور فوج کا مقابلہ کیا۔ بالآخر خوراک اور اسلحہ کی کمی کے باعث انھیں پسپا ہونا پڑا اور غزہ برطانوی فوج کے قبضے میں آگیا۔

'ایلن بی' کا اگلا ہدف 'بیت المقدس' کا شہر تھا جو مسلمانوں کا قبلہ اول تھا اور صلاح الدین ایوبی کے زمانے سے آج تک سات سو چالیس سال سے مسلمانوں کے قبضے میں چلا آرہا تھا۔ برطانیہ کے متعصب وزیر اعظم لائیڈ جارج نے ایلن بی کو حکم دیا کہ بیت المقدس (یروشلم) کو ہر صورت میں عیسایوں کے عید کے تہوار کرسمس سے پہلے فتح کیا جائے تاکہ وہ قوم کو عید کا تحفہ دے سکے۔ عیسائی مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ جنگ دراصل ایک 'صلیبی

جنگ' تھی مگر چونکہ ایلن بی کے ساتھ ہندوستان سے آئی ہوئی فوج کے مسلمان سپاہی بھی تھے، اس لیے اس نے اس جنگ کو صلیبی جنگ کہنے سے پرہیز کیا، گو اس کے عیسائی فوجی اس کو صلیبی جنگ ہی سمجھتے تھے۔

۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو ایلن بی کی فوجوں نے بیت المقدس پر حملہ کیا۔ اس وقت صرف پندرہ ہزار ترک فوج نے اپنے سے کئی گنا بڑی فوج کا مقابلہ کیا مگر جلد ہی شکست کھا کر پسپا ہو گئی۔ اس طرح عثمانیوں کا چار سو سالہ اقتدار ختم ہوا اور بیت المقدس عیسائیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

امتِ مسلمہ کے غدار

ان شکستوں کے باوجود برطانیہ اور اس کے اتحادی یہ جانتے تھے کہ سلطنتِ عثمانیہ میں ابھی بھی اتنی طاقت موجود ہے کہ مسلمان کسی بھی وقت اٹھ کر اپنی مقبوضہ جگہوں کو واپس لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پھر اسی دوران برطانیہ اور اس کی اتحادی فوجوں کو تین بڑے دھچکے لگے۔ روس جس میں زار خاندان کی حکومت تھی اور جو برطانیہ کا اتحادی بھی تھا، وہاں اچانک ہی اشتراکی انقلاب آ گیا۔ اس انقلاب کی قیادت 'ولادیمیر لینن' (Vladimir Lenin) کر رہا تھا۔ اس نے آتے ہی جرمنی اور عثمانیوں سے امن معاہدے کر لیے۔ اس طرح دونوں ممالک اب ایک بڑے دشمن سے مکمل طور پر فارغ ہو کر اپنی تمام طاقت برطانیہ اور فرانس پر لگا سکتے تھے۔ دوسرا دھچکا یہ لگا کہ امریکہ جس نے جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ تاحال جنگ میں نہیں اترا تھا۔ اتحادی افواج کو تیسرا دھچکا اس وقت لگا جب انھیں یہ اطلاع ملی کہ جرمنی ۱۹۱۸ء میں یورپی محاذ پر بڑے حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ ان تینوں عوامل کو دیکھ کر برطانیہ کی وزارتِ جنگ نے جنرل ایلن بی کو حکم دیا کہ وہ تمام فالتو اسلحہ اور فوجی فوراً یورپی محاذ پر روانہ کرے۔ یوں جنرل ایلن بی ایشیا میں مزید فتوحات کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ یہ سلسلہ جاری رکھنے کے لیے اسے مدد چاہیے تھی جبکہ برطانیہ کی بیشتر فوج یورپی محاذ میں مصروفِ کار تھی۔ اس نے فتوحات کو آگے بڑھانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مسلمانوں کے اندر غداروں کی تلاش شروع کر دی۔

'شریف حسین' حجاز کے قبائل کا سردار اور عرب قومیت کا داعی تھا۔ برطانیہ کی خفیہ ایجنسی نے اس سے رابطہ قائم کیا اور وہ اس شرط پر برطانیہ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا کہ جنگ کے بعد برطانیہ عربوں کے لیے علیحدہ ملک بنانے میں مدد دے گا۔ برطانیہ نے اس پر آمادگی کا اظہار کر دیا حالانکہ یہ صاف جھوٹ تھا۔ برطانیہ نے صرف اور صرف خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنا تھا اور مشرقِ وسطی میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنا تھا اور اس کے لیے انھیں وقتی طور پر عرب قبائل کی مدد چاہیے تھی۔ عرب قبائل اس جھوٹے وعدے پر سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ

بغاوت پر تیار ہوگئے۔ البتہ ان کے پاس کوئی منظم قیادت نہ تھی، چنانچہ جنرل ایلن بی نے 'کیپٹن لارنس' (Thomas Edward Lawrence) کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ عربوں میں عسکری بغاوت کو منظم کرے۔ دوسری طرف شریف حسین کے بیٹے فیصل نے اس قیادت کی کمی کو پورا کر دیا۔ لارنس نے اس بغاوت کے لیے اسلحہ اور سونا فراہم کیا۔ لارنس اور فیصل کی خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہیں اور دونوں نے مل کر عرب دنیا میں سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کی حکمتِ عملی تیار کی۔ اس حکمتِ عملی میں یہ طے پایا کہ عرب قبائل عثمانی معسکرات پر حملہ کرنے کی بجائے عثمانی فوج کے خلاف 'مارو اور بھاگ جاؤ' کے طریقِ جنگ پر عمل کریں گے۔ اس حکمتِ عملی کا دوسرا اہم ہدف مدینہ سے دمشق تک کی اس ریلوے لائن کو اڑانا تھا جو فلسطین کی جنگ کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ۷ جولائی ۱۹۱۷ء کو اس عرب گوریلا باغیوں نے بحیرۂ احمر پر ایک اہم عثمانی بندرگاہ 'عقبہ' (Aqaba) پر قبضہ کر لیا۔ یہ ایک ایسی کامیابی تھی جو برطانوی جرنیل خواب میں بھی نہ سوچ سکتے تھے۔ عقبہ کی اس کامیابی کے بعد لارنس جنرل ایلن بی سے ملنے کے لیے مصر آیا اور اس ملاقات میں ایلن بی نے لارنس کو مزید سونا اور اسلحہ دینے کا وعدہ کیا۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۸ء تک اس عرب بغاوت نے سلطنتِ عثمانیہ کو مجبور کر دیا کہ وہ تیس ہزار فوج کو محاذِ جنگ سے ہٹا کر اس بغاوت کو کچلنے میں لگا دے اور یہ وہ بڑی کامیابی تھی جو برطانیہ کو اس بغاوت سے حاصل ہوئی۔

عرب باغیوں کی ان کامیابیوں سے جنرل ایلن بی کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنی کم فوج کے ساتھ دمشق کو فتح کر لے۔ ستمبر ۱۹۱۸ء کو ایلن بی دمشق پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب ایلن بی نے یہ حملہ شروع کیا تو عرب باغیوں نے اس حملے میں مدد کے لیے مدینہ دمشق ریلوے لائن کی چار میل کی پٹری بارودی سرنگ سے اڑا دی۔ اس حملے سے عثمانی فوجوں کی جنگی صلاحیت پر بہت برا اثر پڑا اور ان کے لیے دمشق کا دفاع ناممکن ہو گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس بغاوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ عرب باغیوں کی یہ جنگ آزادی کی جدوجہد کی بجائے زیادہ سے زیادہ لوٹ کا مال جمع کرنے کی جنگ بن چکی تھی۔ جنرل ایلن بی کے دمشق پر حملے کے جواب میں عثمانی فوج نے اپنی دفاعی پوزیشن کو مستحکم کرنا شروع کر دیا اور اس کام کے لیے انھوں نے جرمن جرنیل کو مقرر کیا۔ اس فوج کو اسلحہ اور فضائیہ کی مدد بھی حاصل تھی۔

مگیڈو کی جنگ

عالمی تناظر میں عثمانیوں کے لیے حالات انتہائی ناسازگار ہو چکے تھے۔ انور پاشا کے عراق سے فوج نکالنے، امریکہ کی فوج کے یورپ پہنچنے اور شریف حسین کی غداری سے فلسطین میں جنرل ایلن بی کی صورت حال بہت

بہتر ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس نے موقع غنیمت جان کر ستمبر ۱۹۱۸ء میں عثمانیوں کے خلاف حملہ کر دیا۔ یہ جنگ تاریخ میں 'مگیڈو کی جنگ' (Battle of Megiddo) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں عثمانی فوجوں کو شکست ہو گئی اور وہ پسپا ہو گئیں۔ بہت سے ترک فوجی گرفتار ہو گئے۔ برطانوی فضائیہ کی بمباری سے سڑکیں لاشوں سے بھر گئیں۔ مگیڈو کی جنگ میں شکست کے بعد یہ واضح ہو چکا تھا کہ عثمانی ترک مشرق وسطیٰ میں یہ جنگ ہار چکے ہیں اور اب صرف وقت کا انتظار تھا کہ اتحادی فوجیں کب ترکی میں داخل ہوں۔

وسطی طاقتوں کی شکست

دوسری طرف جرمنی میں 'فیلڈ مارشل ہنڈن برگ' (Paul von Hindenburg) یورپی محاذ پر فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۱۸ء کو جرمنی نے ایک بڑا حملہ کر دیا جس سے جرمنی کی فتح واضح نظر آنے لگی۔ اس حملے سے پریشان ہو کر برطانیہ کی وزارتِ جنگ نے جنرل ایلن بی کے نوے ہزار فوجی اسلحہ سمیت واپس بلا لیے۔ اس موقع پر انور پاشا نے... جو عثمانیوں کے وزیر جنگ تھے... فیصلہ کیا کہ عثمانی سلطنت کے وہ علاقے واپس لینے چاہییں جو روس کے ساتھ جنگ میں اس نے کھو دیے تھے۔ اس لیے انور پاشا نے قوقنذ کا محاذ دوبارہ کھول دیا۔ اس نے فلسطین میں موجود فوج کے بہترین دستے نکال کر انھیں قوقنذ کے محاذ پر بھیج دیا۔ اس طرح نہ صرف فلسطین کا دفاع کمزور پڑ گیا بلکہ وہاں موجود ترک فوج میں اسلحہ اور خوراک کی شدید قلت واقع ہو گئی۔ بیماروں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ دوسری طرف امریکہ کی فوجیں یورپ پہنچنا شروع ہو گئیں۔ جرمنی کا وہ حملہ جو کامیابی کی طرف بڑھ رہا تھا، آہستہ آہستہ نہ صرف پسپا ہو گیا بلکہ جرمنی کی شکست کے آثار نظر آنے لگے۔

اب ترک فوجیں پسپا ہو کر ترکی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر آخری عثمانی سلطان محمد ششم نے امریکہ کے صدر 'وڈرو ولسن' (Woodrow Wilson) سے صلح میں مدد کرنے کی اپیل کی مگر اس نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ جنرل ٹاؤن شیڈ جس نے کوت العمارہ میں ترکوں کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے، وہ عثمانیوں کی قید میں تھا۔ اس نے اس صلح کی بات چیت کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ اور اور برطانیہ میں جنگ بندی کا ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ جنگ بندی کے معاہدے سے زیادہ ہتھیار پھینکنے کا معاہدہ ثابت ہوا۔ اس معاہدے میں اتحادی فوجوں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کے جس حصے پر چاہیں قبضہ کر لیں۔ دوسری طرف یورپ کے محاذ پر جرمنی جو فتح کے بہت قریب آ گیا تھا، امریکہ کی تازہ دم فوج کے آنے سے شکست کھا گیا اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۸ء کو جنگ بندی پر تیار ہو گیا۔

معاہدۂ وارسیلس

پہلا معاہدہ جنگ جیتنے والے اتحاد (برطانیہ، فرانس، امریکہ) اور جرمنی کے درمیان فرانس کے شہر 'وارسیلس' میں ہوا۔ یہ معاہدہ مکمل طور پر جرمنی کا استیصال تھا۔ 'معاہدۂ وارسیلس' (Treaty of Versailles) چار بنیادی نکات کے گرد گھومتا تھا۔ پہلا نکتہ یہ تھا کہ یہ جنگ شروع کرنے کا واحد ذمہ دار جرمنی ہے اور تمام قصور جرمنی کا ہے، لہٰذا اس کے بادشاہ پر مقدمہ چلایا جائے۔ دوسرا اہم نکتہ جرمنی کی فوجی صلاحیت میں کمی کرنا تھا۔ جرمنی کی فوج کو صرف ایک لاکھ سپاہیوں اور بحری فوج کو صرف پندرہ ہزار فوجیوں تک محدود کر دیا گیا، حالانکہ جرمنی کی بحری فوج کے پاس اٹھارہ بحری جنگی جہاز اور بارہ تارپیڈو کشتیاں تھیں۔ اسی طرح جرمنی پر کوئی آبدوز رکھنے پہ پابندی لگا دی گئی۔ اس کے علاوہ جرمنی پر رائفل، مشین گن، ٹینک اور ہوائی جہاز بنانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس معاہدے کا تیسرا اہم نکتہ جرمنی کی علاقائی تقسیم تھی۔ جدید جرمنی ۱۸۷۱ء کے انقلاب میں 'جرمینک نسل' کے علاقوں کو جمع کر کے بنایا گیا تھا۔ اس سے پہلے تاریخ میں اس کے کچھ حصے فرانس، سویڈن، پولینڈ اور آسٹریا وغیرہ میں شامل تھے۔ اس معاہدے کے تحت 'لورئن' (Lorraine) اور 'الیساس' (Alsace) کا جرمن علاقہ فرانس کو دے دیا گیا جبکہ 'رائن لینڈ' (Rhineland) کا علاقہ غیر جانب دار کر دیا گیا، 'شمالی شسوگ' (Northern Schleswig) کا علاقہ ڈنمارک کو دے دیا گیا، 'سلیسیا' (Silesia) کا کچھ علاقہ چیکوسلواکیہ کو دے دیا گیا جبکہ سلیسیا کا مشرقی حصہ پولینڈ کو دے دیا گیا، 'یوپن' (Eupen) اور 'ملمیڈی' (Malmedy) کا علاقہ بیلجیم میں شامل کر دیا گیا، 'میمل' (Memel) کا علاقہ لتھونیا کو دے دیا گیا، 'سولڈو' (Soldau) اور مشرقی پروشیا پولینڈ کو دے دیا گیا، 'سار' (Saar Basin) کا علاقہ غیر جانب دار قرار دے کر اس میں نکلنے والا کوئلہ فرانس کو دے دیا گیا اور آسٹریا کو جرمنی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس معاہدے کے چوتھے نکتے کے مطابق اتحادی فوجوں کا ہونے والا تمام جنگی نقصان بھی جرمنی ہی کو پورا کرنا تھا۔ اس نقصان کا تخمینہ ۲۲۶ بلین سونے کے جرمن مارکس لگایا گیا جو بعد میں کم کر کے ۱۳۲ بلین سونے کے جرمن سکے کر دیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں یہ طے ہوا کہ جرمنی اس کی ادائیگی ۵۹ سالہ قسطوں پر ۱۹۸۸ء تک مکمل کرے گا۔

دنیا کی تاریخ میں یہ معاہدہ زمین میں فساد کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس معاہدے کے بعد جرمنی کی حالت اس شخص جیسی ہو گئی جسے ہاتھ پیر باندھ کر گہرے سمندر میں اتار دیا جائے اور اس سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ تیر کر سمندر پار کرے اور اپنی جان بچائے۔ اس معاہدے کے بعد تمام غیر جانب دار مبصرین اور مؤرخین نے اس

معاہدے کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب جرمنی کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ تمام زندگی غلام بن کر رہے یا وہ اس معاہدے کی خلاف ورزی کرے اور دنیا ایک اور جنگ عظیم میں داخل ہو جائے۔ اٹھارہ سال بعد یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی جب جنگ عظیم دوم کا آغاز ہوا۔

ریاستِ اسرائیل کا قیام

ادھر عرب دنیا میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو فیصل اور اس کے ساتھی فتح مند لشکر کی طرح دمشق میں داخل ہوئے۔ جنگ میں برطانیہ کی مدد کرنے کے عوض ان کے لیے بحیرۂ عرب سے فلسطین تک ایک عرب ملک کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کے قریب تھا، مگر جب وہ جنرل ایلن بی سے ملاقات کے لیے پہنچا تو جنرل نے اس پر یہ واضح کر دیا کہ جو وعدہ برطانیہ نے اس سے کیا تھا، اسے پورا کرنا ممکن نہیں۔ اس پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ شام اور لبنان فرانس کی ملکیت رہیں گے اور حجاز، عراق اور فلسطین برطانیہ کے تحت رہے گا۔ اس کے علاوہ فیصل پر یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ فلسطین میں برطانیہ کی زیرِ نگرانی ایک یہودی ریاست قائم کی جائے گی۔ یہ بات سن کر فیصل بہت ناراض ہوا مگر ایک غدار کی ناراضگی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

اسی دوران جنرل ایلن بی نے برطانوی وزارتِ جنگ کو سفارش بھیجی کہ فوجیوں کو اپنے گھروں سے نکلے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں، اگر انھیں واپس اپنے اپنے وطن نہ بھیجا گیا تو فوج میں بغاوت کا خطرہ ہے۔ اس سفارش کو وزارتِ جنگ نے منظور کرتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ سے فوج کا بڑا حصہ واپس بلانے کا حکم دے دیا۔ تاہم اس طرح فوج کم کرنے سے برطانیہ کے مشرقِ وسطیٰ میں اپنے منصوبوں پر عمل درآمد خطرے میں پڑ گیا۔ اسے اب ایک اور اتحادی کی ضرورت تھی اور یہ اتحادی 'یونان' تھا۔ یونان کے وزیرِ اعظم 'انفیریوس وینزیلو' (Eleftherios Venizelos) کی آنکھیں مغربی ترکی کو یونان کا حصہ بنانے پر لگی ہوئی تھی، لہٰذا وہ اپنی فوجیں بھیجنے پر تیار ہو گیا۔

دوسری طرف امتِ مسلمہ کا غدار فیصل یہودیوں کی ریاست کے قیام کے لیے فلسطین سے دست بردار ہونے کو تیار ہو گیا۔ اب یورپ میں صہیونی تحریک 'وائیز مین' (Chaim Weizmann) کی قیادت میں یہودیوں کے لیے ریاستِ اسرائیل کا پرجوش مطالبہ کرنے لگی۔ اس کے جواب میں وزیرِ خارجہ 'آرتھر جے بلفور' (Arthur Balfour) نے ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو صہیونی تحریک کے نام وہ منحوس خط لکھا جو تاریخ میں 'اعلانِ بلفور' (Balfour Declaration) کے نام سے مشہور ہوا اور یہی خط ریاستِ اسرائیل کے قیام کا اعلان ہے۔

معاہدۂ سورہ

جنگِ عظیم اول میں جنگ بندی کے بعد ۱۰اگست ۱۹۲۰ء کو سلطنتِ عثمانیہ اور اتحادیوں (برطانیہ، فرانس اور اٹلی) کے درمیان سورہ (فرانس) کے مقام پر ایک معاہدہ طے پایا جسے 'معاہدۂ سورہ' (Treaty of Sévres) کہا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ دراصل امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھرنے کے مترادف تھا۔ عثمانی سلطان محمد پنجم کی حیثیت اب اتحادیوں کے قیدی کی سی تھی۔ اتحادی اس کو جو حکم دیتے تھے، وہ اس پر دستخط کر دیتا تھا۔ 'معاہدۂ سورہ' کے تحت حجاز، عراق، فلسطین، لبنان اور اردن برطانیہ کو دے دیے گئے جبکہ شام اور اناطولیہ کا جنوب مشرقی حصہ فرانس کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی طرح اناطولیہ کے بعض حصے آرمینیہ اور یونان کے حوالے کر دیے گئے۔ یہ معاہدہ دراصل 'سائیکس پیکو' کے اس خفیہ معاہدے[45] (Sykes-Picot Agreement) کا عملی اظہار تھا جو ۱۹۱۶ء میں فرانس اور برطانیہ کے درمیان امتِ مسلمہ کی تقسیم کے بارے میں طے ہوا تھا۔

مصطفیٰ کمال کا عروج اور امت کا بکھرتا شیرازہ

معاہدہ سورہ اور جنگ بندی کے ساتھ ہی تمام مغربی اقوام مشرقِ وسطیٰ اور ترکی کے عثمانی علاقوں میں اپنے اپنے دعووں کے ساتھ پل پڑیں۔ آرمینیہ کی فوج نے مشرقی ترکی پر قبضہ کر لیا، جنوب مشرق میں 'اڈنہ' کے مقام پر فرانس اور آرمینیہ کی فوج نے قبضہ کر لیا، جنوب مغربی ترکی پر اٹلی کی فوجوں نے قبضہ کر لیا اور مغربی ترکی پر یونان کی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب عثمانیوں کے مرکز ترکی پر پوری دنیا قبضہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ داخلی طور پر اس کی معیشت تباہ ہو چکی تھی، لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ استنبول میں بیٹھے سلطان کی حیثیت اب اتحادی افواج کے قیدی کی سی تھی۔ پورے ترکی میں کوئی مرکزی قیادت موجود نہ تھی۔ یہ ایک ایسا خلاء تھا جسے 'جنرل مصطفیٰ کمال' نے پُر کیا۔ اس نے عسکری اور سِوَل قیادت کو 'ترک قومیت' اور 'آزادی' کے نعرے

---

[45] یہ معاہدہ دراصل ان خفیہ مذاکرات پر مشتمل ہے جو نومبر ۱۹۱۵ء سے مارچ ۱۹۱۶ء کے عرصے میں برطانیہ اور فرانس کے درمیان ہوئے، جبکہ انھیں روس کی رضامندی حاصل تھی۔ ان مذاکرات میں برطانیہ اور فرانس نے خلافتِ عثمانیہ کے ماتحت عرب خطے کو جنگِ عظیم اول کے دوران ہی اپنے درمیان تقسیم کر لیا تھا کہ آئندہ برطانیہ اور فرانس نے ان میں سے کن کن ممالک پر اپنا تسلط قائم کرنا ہے۔ معاہدے کا نام سائیکس پیکو معاہدہ اس لیے پڑا کیونکہ یہ مذاکرات فرانسیسی سیاستدان جورج پیکو (Georges-Picot) اور برطانوی سیاستدان مارک سائیکس (Sir Mark Sykes) کے درمیان ہوئے تھے۔ (م ح)

تلے جمع کیا۔ مصطفیٰ کمال کی تحریک کا مرکزی نقطہ... عرب مسلم دنیا سے دستبردار ہو کر... صرف ترکی کو مغربی طاقتوں سے آزاد کروانا تھا۔ اس نے سلطان کو مغربی طاقتوں کے ہاتھ ایک کھلونا قرار دیا اور کہا کہ وہ ترکی کا سودا کر رہا ہے۔ اس طرح وہ بیک وقت سلطان اور مغرب کی مخالفت کر رہا تھا۔ ترک قوم جو جنگ میں شکست کی وجہ سے صدمے سے دوچار تھی، مصطفیٰ کمال کے نعرے اسے اپنے لیے ایک زندگی محسوس ہوئے۔ ۱۹۱۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں مصطفیٰ کمال کے ساتھیوں نے کامیابی حاصل کر لی۔ اس کامیابی نے کمال کی تحریک کو ایک نئی زندگی دے دی۔ اب انھوں نے اپنا مرکز 'انقرہ' میں بنا کر مغربی طاقتوں کے تسلط سے آزاد ایک جمہوری ترکی کا مطالبہ کر دیا اور معاہدۂ سورہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔

یہاں سے ترکوں کی جنگ نے نیا رخ اختیار کر لیا۔ اب ترکوں کی جنگ کا مرکزی نکتہ دیگر مسلم علاقوں سے دستبرداری کے ساتھ ترک قومیت کی حفاظت تھا اور اس کے تحت مملکتِ ترکی کی حفاظت تھا۔ ان کی تحریک اب قوم پرستوں کے ہاتھ میں تھی جن کا قائد 'مصطفیٰ کمال اتاترک' تھا۔ یہ قوم پرستی کا جذبہ خود خلافت کی موت تھا۔

۱۹۱۸ء میں جب روسی فوجیں آرمینیہ سے واپس چلی گئیں تو وہاں ایک آزاد ریاست قائم ہوگئی۔ آرمینیہ کی نئی حکومت مشرقی ترکی کو آرمینیہ کا حصہ سمجھتی تھی، چنانچہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کے کمزور پڑتے ہی مشرقی ترکی پر قابض ہوگئی تھی۔ اس کے بالعکس مصطفیٰ کمال کی حکومت اسے ترکی کا اپنا حصہ سمجھتی تھی۔ ۱۹۱۹ء کے موسمِ سرما میں ترکوں کی فوج نے 'جنرل کاظم' کی قیادت میں آرمینیہ پر حملہ کر دیا اور پے در پے لڑائیوں میں آرمینیہ کی فوجوں کو شکست دے دی۔ ۱۹۲۰ء میں آرمینیہ کی حکومت نے ترکی کے ساتھ امن معاہدہ کر لیا۔ اسی سال مصطفیٰ کمال نے روس کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ اس طرح ترکی کی مشرقی سرحد محفوظ ہوگئی۔

مشرقی سرحد سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اب ترکی فوج جنوب مغربی سرحد کی طرف متوجہ ہوئی، جہاں آرمینیہ اور فرانس کی فوجیں موجود تھیں۔ ترکی فوج کے حملوں سے فرانس کی پوزیشن شام میں بھی خطرے میں پڑ گئی۔ فرانس کا نیا وزیر اعظم 'الیگزینڈر' (Alexandre Millerand) مصطفیٰ کمال سے معاہدہ چاہتا تھا مگر برطانوی وزیر اعظم نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی مزید فوجیں استنبول بھیج دیں۔ اسی دوران روس کی اشتراکی حکومت نے کمال کی حکومت کی مالی امداد کا فیصلہ کر دیا۔ ۱۹۲۱ء کے موسمِ بہار میں فرانس نے مصطفیٰ کمال کی حکومت سے امن معاہدہ کر لیا۔ اس طرح فرنس نے پہلی بار باضابطہ طور پر مصطفیٰ کمال کی حکومت کو مان لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اتحادیوں کا وہ سورہ کا معاہدہ جو انھوں نے سلطان محمد کے ساتھ کیا تھا،

خود بخود باطل ہو گیا۔ اس سے برطانیہ کی پوزیشن بھی خراب ہو گئی اور اس طرح برطانیہ اور فرانس کا جنگی اتحاد بھی خطرے میں پڑ گیا۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء تک اس معاہدے کے تحت تمام فرانسیسی اور آرمینیائی فوجیں ترکی سے نکل گئیں۔

اب مصطفیٰ کمال کی حکومت کی تمام توجہ سامنے یونان کی فوجوں کی طرف تھی۔ جون ۱۹۲۰ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم لائیڈ جارج نے مصطفیٰ کمال کا زور توڑنے کے لیے یونان کی فوجوں کو ترکی پر حملہ کی ترغیب دی۔ ترک فوج نے یونان کے تین حملوں کو ناکام بنا دیا۔ یونان کے بادشاہ 'کانسٹنٹین' (King Constantine) نے فوج کی قیادت خود سنبھالی اور پہلے ہی حملے میں ترکی فوج کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مصطفیٰ کمال نے اپنی پارٹی سے تین ماہ کے لیے یونان کے خلاف جنگ میں فوج پر مکمل اختیار مانگے جو اسے دے دیے گئے۔ اگست ۱۹۲۲ء کو ترک فوجوں نے 'برسہ' اور 'ازمیر' پر ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ کئی دن کی شدید لڑائی کے بعد یونانی فوجیں شکست کھا کر ازمیر کی طرف پسپا ہو گئیں۔ ترکی فوج بھی اس کے تعاقب میں ازمیر کی طرف بڑھی۔ یونان کے وزیر اعظم نے لائیڈ جارج سے مدد کی اپیل کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ یونانی فوجیں بد حواسی میں مختلف ملکوں کے بحری جہازوں پر بیٹھ کر ازمیر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس بد حواسی میں ازمیر شہر میں اچانک آگ لگ گئی اور ہزاروں لوگ اس آگ میں جل کر ہلاک ہو گئے۔ مصطفیٰ کمال کی فوجیں آدھے جلے ہوئے شہر میں داخل ہوئیں تو وہاں کوئی یونانی سپاہی موجود نہ تھا۔ اب مصطفیٰ کمال کی ساری توجہ برطانیہ کی فوج کی طرف ہو گئی جو استنبول میں موجود تھی۔ برطانوی فوج نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ترکی سے صلح کر لی۔ یوں مصطفیٰ کمال استنبول میں میں فتح مند داخل ہو گیا۔

لوزیان کا معاہدہ

چونکہ مصطفیٰ کمال کی تحریک نے معاہدۂ سورہ کا انکار کر دیا تھا جس کے بعد اس کی حیثیت ختم ہو گئی، لہٰذا برطانیہ اور فرانس کو امتِ مسلمہ کے حصے بٹورنے کے لیے معاہدۂ سورہ کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ برطانیہ ،فرانس اور اٹلی نے سویزرلینڈ کے شہر 'لوزیان' میں ایک اور کانفرنس منعقد کی جس میں سلطان محمد ششم کی بجائے مصطفیٰ کمال کی وطنی پارٹی کو مذاکرات میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو آٹھ ماہ کے مذاکرات کے بعد 'معاہدہ لوزیان' (Treaty of Lausanne) طے پایا۔ اس معاہدے کی رو سے ترکی کو ایک جمہوریہ کی حیثیت سے علیحدہ ملک مان لیا گیا۔ اناطولیہ اور ترکی کے کئی یورپی علاقوں کو ترکی کے ساتھ مان لیا گیا، درۂ دانیال کی بین الاقوامی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا اور باقی سورہ کا معاہدہ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ سورہ کا معاہدہ ہو یا

لوزیان کا معاہدہ، یہ دونوں معاہدے برطانیہ اور فرانس کے درمیاں ہونے والے خفیہ منصوبے 'سایکس پیکو' کی سرکاری شکل تھے جو برطانیہ اور فرانس نے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء کے درمیان امتِ مسلمہ کے ٹکڑے کرنے کے لیے طے کیا تھا۔

امتِ مسلمہ کو کیا ملا؟

جنگِ عظیم اول ختم ہوئی اور امتِ مسلمہ بکھر گئی۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ امت کو آزادی، مساوات، ترقی اور حب الوطنی کے لادین نعرے ملے اور اب انھیں ان نعروں کی بنیاد پر اپنا مستقبل بنانا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ امتِ مسلمہ کو شریف حسین اور اس کے بیٹے عبداللہ اور فیصل ملے جنھوں نے فلسطین اور بیت المقدس پر سودا بازی کر کے اسے یہودیوں کے حوالے کر دیا۔ عربوں کا بادشاہ بننے کا خواب دیکھنے والے اور عرب قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والے خاندان نے خود عربوں کو حجاز، عراق اور اردن میں تقسیم کر دیا۔ شریف حسین حجاز میں، فیصل عراق میں اور عبداللہ اردن میں بادشاہ بنا۔ ۱۹۲۷ء میں شاہ عبدالعزیز آل سعود نے شریف حسین سے حجاز چھین لیا اور وہ ۱۹۳۱ء میں اردن میں جلاوطنی کی حالت میں مر گیا۔ ۱۹۳۳ء میں اس کا بیٹا فیصل عراق میں پراسرار موت مر گیا۔ ۱۹۳۹ء میں فیصل کا بیٹا غازی گاڑی کے حادثے میں مر گیا۔ غازی کے پانچ سالہ بیٹے کو فیصل دوم کے نام سے تخت پر بٹھایا گیا جو ایک کٹھ پتلی بادشاہ تھا۔ ۱۹۵۸ء میں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی جس میں فیصل کو قتل کر دیا گیا۔ یوں امت کا شیرازہ بکھیرنے والا شریف حسین کا خاندان جو عرب دنیا کا بادشاہ بننے کے لیے پوری امت کا سودا کر چکا تھا، صرف اردن تک محدود ہو گیا۔ ۱۹۵۱ء میں فیصل دوم کے بیٹے شاہ عبداللہ کو قتل کر دیا گیا۔ پھر اس کا بیٹا طلال بادشاہ بنا مگر دماغی بیماری کے سبب معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد طلال کا بیٹا شاہ حسین بادشاہ بنا۔ ۱۹۹۹ء میں شاہ حسین کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا شاہ عبداللہ دوم کے خطاب کے ساتھ اردن کا بادشاہ بن گیا جو آج تک موجود ہے۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے پوری قوم کو آزادی، مساوات، جمہوریت اور ترقی کے نعروں پر لگا کر دین سے دور کر دیا۔ ترکی میں عربی رسم الخط ختم کر کے انگریزی رسم الخط کو جاری کر دیا گیا، انگریزی لباس کو اپنانے کی ترغیب دی گئی اور اسی کو ترقی کا زینہ گردانا گیا، دینی شعائر (اذان، پردہ، داڑھی وغیرہ) کو مٹا کر مغربی تہذیب اپنائی گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترکی میں اتاترک کے زیرِاثر ایک لادین آئین نافذ کر دیا گیا جو آج تک نافذ ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دنیا سے رحلت فرمائی تو اپنے پیچھے خلافتِ راشدہ کو چھوڑا۔ تاریخِ اسلام کے مختلف ادوار میں بڑے بڑے مضبوط سلاطین گزرے جن میں غزنوی، سلجوقی، زنگی، ایوبی اور مملوک شامل

ہیں، ان میں سے ہر کسی نے خلافتِ عباسیہ کو قائم رکھنا اپنی ذمہ داری سمجھا۔ جب تاتاریوں کے حملے کے بعد بغداد میں خلافتِ عباسیہ کا سقوط ہو گیا تو اس وقت مصر کے سلطان بیبرس نے ہلاکو خان کو 'عین جالوت' کے مقام پر شکست دینے کے بعد خلافت کا قیام اپنی پہلی ذمہ داری سمجھی اور دوبارہ خلافتِ عباسیہ کو جاری کر کے مسلمانوں کی مرکزیت قائم کر دی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اصل نظام 'خلافت' ہے۔ 'حقوقِ انسانی'، 'مذہب اور سائنس کی جنگ' اور 'عقل اور علم وحی کی جنگ' جیسے نعروں اور اصطلاحات کے بل بوتے پر مغرب نے انقلابِ فرانس میں عیسائیت کو شکست دی تھی، جنگِ عظیم اول کے بعد امتِ مسلمہ کے منافق حکمرانوں نے یہی بے حقیقت نعرے اور سازشی اصطلاحات مسلمانوں پر مسلط کر دیں اور پوری امت کو یہ باور کرایا گیا کہ تمہارے اصل مسائل ان کی وجہ سے ہیں اور اس کا علاج آزادی، مساوات اور ترقی ہے جو جمہوریت کے ذریعہ ہی حاصل ہو گا۔

خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد برطانیہ، فرانس اور روس مسلمانوں کے علاقوں اور وسائل پر قابض ہو گئے۔ اس جنگ میں سب سے اہم اور فیصلہ کن کردار برطانیہ کا تھا۔ مگر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کی فوج کے بغیر برطانیہ یہ فتح حاصل کر سکتا تھا؟ اس کا جواب ماضی، حال اور مستقبل میں سوائے ''نہیں'' کے کچھ نہیں! برطانیہ، روس اور فرانس مل کر بھی اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کو شکست دے سکتے۔ جنگِ عظیم کے پہلے تین سالوں میں برطانیہ اور فرانس کو کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی۔ استنبول پر ناکام حملہ، گیلی پولی کی شکست، کوت العمارہ میں برطانوی فوجوں کی شکست، غزہ کی دو لڑائیوں میں شکست جیسے عوامل چیخ چیخ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ خلافتِ عثمانیہ کو شکست برطانیہ نے نہیں بلکہ تیرہ لاکھ ہندوستانی فوج نے دی ہے۔ ان میں سے چوہتر ہزار اس جنگ میں مرے اور چونسٹھ ہزار زخمی ہوئے۔ اسی تیرہ لاکھ فوج میں پنجاب رجمنٹ، بلوچ رجمنٹ، فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی تمام بٹالینیں شامل تھیں۔ اسی تیرہ لاکھ فوج میں آدھے مسلمان تھے۔ ان مسلمانوں میں سے بلوچ رجمنٹ کے 'خداداد خان'، فرنٹیئر فورس رجمنٹ کے 'میر دست خان'، پنجاب رجمنٹ کے 'شمت خان' نے انگریزوں کے ساتھ لڑتے ہوئے برطانیہ سے بہادری کا سب سے بڑا اعزاز 'وکٹوریہ کراس' (Victoria Cross) حاصل کیا۔ کیا یہ مسلمان تھے؟ انھوں نے بہادری دکھائی تو کس کے لیے؟ جو بہادری کے اعزاز انھیں ملے، وہ کس بہادری کے لیے تھے؟ ان لوگوں کے متعلق قرآن کا فیصلہ واضح ہے اور اس کی تشریح میں علمائے سلف وخلف کے درمیان کوئی اختلاف موجود نہیں۔ جو کوئی بھی کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑے یا کفار کی مدد کرے وہ کفر کی بدترین حالت میں مبتلا ہو گیا۔

تحریکِ شیخ الہند جسے 'ریشمی رومال کی تحریک' بھی کہا جاتا ہے، اپنے مقصد 'ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ' میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی بنیادی وجہ حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃاللہ علیہ کی گرفتاری تھی اور دوسری وجہ امیر افغانستان کی دوغلی پالیسی تھی جس نے اس تحریک کو بروقت عمل کرنے سے روکے رکھا۔ اس پالیسی کے مرتکب امیر حبیب اللہ کو تو کوئی فائدہ نہ ہوا اور وہ ۱۹۱۹ء میں جلال آباد میں قتل ہو گیا، مگر انگریزوں کو سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کا خوب موقع مل گیا۔ مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اگر امیر حبیب اللہ دوغلی پالیسی نہ اپناتا اور مجاہدین کی کھل کر مدد کرتا تو جنگ کے نتائج پر گہرا مثبت اثر پڑ سکتا تھا۔

جنگِ عظیم اول کے اختتام پر برِ صغیر میں برطانیہ کی صورتحال

تحریکِ شیخ الہند کے بعد انگریزوں کو اپنے اس قدیم سوال کا جواب واضح الفاظ میں مل گیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کا مستقبل کیا ہو گا؟ اس کا جواب انگریزوں کی خفیہ رپوٹوں میں یہ تھا کہ اگر جنگِ عظیم جیسے حالات رہے تو انگریزوں کا ہندوستان میں مستقل قبضہ ناممکن ہے۔ اس لیے جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ نے ہندوستان میں ایک ایسے نظام کے نفاذ کی کوشش شروع کر دی کہ جس کی مدد سے ہندوستان کو چھوڑنے کی صورت میں بھی وہ اس پر قابض رہے۔

اسی بنا پر اس نے فوج اور سیاسی نظام میں تبدیلیاں شروع کر دیں۔ ۱۹۲۲ء میں فوج کی چوتھی تنظیمِ نو ہوئی جسے فوج کو 'ہندوستانی بنانا' کہتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں اور پھر ۱۹۴۶ء میں انتخابات کا انعقاد اس بات کی علامت تھا کہ انگریزوں کا اقتدار کمزور ہو چکا تھا۔ یورپ میں ۱۹۲۹ء کے معاشی بحران اور ۱۹۳۹ء میں ہٹلر کی طرف سے جنگِ عظیم دوم کے آغاز نے اس تابوت میں آخری کیل کا کام دیا۔ ۱۹۴۰ء میں تحریکِ پاکستان شروع ہوگئی اور پاکستان بن گیا۔ آج تحریکِ پاکستان کی کامیابی میں مسلم لیگ کے کردار کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرنے والے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس میں مختلف پارٹیاں اور کردار شامل ہیں۔ مسلم لیگ ایک کردار ہے جبکہ اس میں تحریکِ مجاہدین، قبائل کے مجاہدین سے لے کر تحریکِ شیخ الہند تک کے مسلمان بنیادی اور مرکزی کردار ہیں۔ حسنِ ظن کی بنا پر مسلم لیگ کی جدوجہد کو زیادہ سے زیادہ تحفظِ مسلمین کی ایک ایسی جہد وجہد کہا جاسکتا ہے جو اول دن سے آج تک سوالیہ نشانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے، جبکہ مجاہدین وعلماء کی جدوجہد خالصتاً غلبہء دین کی جدوجہد تھی۔ یہ دونوں گروہ اگر اکھٹے تھے تو صرف اس بات پر کہ جو ملک حاصل ہو گا، اس میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہو گا۔ علمائے حق نے اس تحریک کا ساتھ دیا تو تب یہ وہ قوت اختیار کر سکی جس کے نتیجے میں اسے بنگال اور سرحد میں ریفرنڈم میں کامیابی حاصل ہوئی اور تحریکِ

پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو پایا۔

جہادِ افغانستان سوم (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء)

جنگِ عظیم اول کے اختتام اور سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط کے باوجود تحریکِ شیخ الہند نے خطۂ برِ صغیر میں برطانیہ کے خلاف نمایاں اثرات مرتب کیے۔ بہت سی ہندو اور سکھ تحریکیں بھی اس کی مدد کرنے لگیں۔ ہندوستان کی انگریز فوج میں جابجا بغاوتیں ہونے لگیں۔ ان بغاوتوں میں 'سنگاپور بغاوت' سب سے مشہور ہے جس میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان سپاہیوں نے بغاوت کی تھی اور یہ بغاوت پورے سنگاپور میں پھیل گئی تھی۔ اس بغاوت سے نمٹنے کے لیے فرانس اور روس کے بحری بیڑے مدد کے لیے بلانے پڑے۔ اسی طرح لاہور، فیروز پور اور آگرہ میں موجود فوج میں بغاوتیں ہوئیں۔ بنگال میں یہ بغاوت اس حد تک پھیل گئی کہ وہاں کی سول انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ گئی۔ یہ بغاوت ایران، سیستان اور بلوچستان تک پھیل گئی۔ کئی بلوچ قبائل نے انگریزوں سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ برطانوی فوج بلوچستان سے کراچی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی۔

دوسری طرف امیر حبیب اللہ جس نے انگریزوں کے وظیفے کا خوب حق ادا کیا اور افغان عوام کو جنگِ عظیم اول کے دوران جہاد سے دور رکھنے میں کامیاب ہوا، اس کی یہ حکمتِ عملی خود اس کے لیے مضر ثابت ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں اس کے خلاف بغاوت ہوئی اور امیر حبیب اللہ جلال آباد میں قتل ہو گیا۔ اس کی جگہ امان اللہ کو افغانستان کا امیر مقرر کیا گیا۔ امان اللہ نے اپنے امیر بننے کے پہلے ہی دن برطانوی سفیر کو بلا کر 'معاہدۂ گندمک' کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ آج کے بعد افغانستان اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں آزاد ہے۔ افغانستان اب چاہے تو برطانیہ کا ساتھ دے اور چاہے تو روس کا اور چاہے تو کسی کا بھی ساتھ نہ دے۔ امیر امان اللہ کا یہ اعلان جہادِ افغانستان سوم (تیسری افغان جنگ) کا آغاز تھا۔

پہلی اور دوسری افغان جنگ کے برعکس تیسری جنگ میں برطانیہ کے بجائے افغانستان نے حملے میں پہل کی۔ جنگِ عظیم اول کے فوراً بعد یورپ اور برطانیہ کی طاقت کمزور ہوتی دیکھ کر افغانستان کے امیر امان اللہ نے ہندوستان پر تین اطراف یعنی خیبر، کرم اور قندھار سے حملہ کر دیا اور یوں تیسری افغان جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ کے نتائج بہت اہم تھے۔ اس جنگ کے نتیجے میں قبائل میں جہاد کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ جیسے ہی افغان فوج نے ٹل پر قبضہ کیا، خیبر رائفلز اور وزیرستان ملیشیا نے انگریز فوج کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے مجاہدین کا ساتھ دیا۔ مجبوراً انگریز فوج کو آنے والے دو سالوں کے لیے وزیرستان خالی کرنا پڑا اور سلطنتِ برطانیہ کو افغانستان کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا جو 'معاہدۂ راولپنڈی' (Treaty of Rawalpindi) کے نام سے مشہور ہوا۔

معاہدے کی رو سے سلطنتِ برطانیہ نے افغانستان کو آزاد اور خود مختار ریاست تسلیم کیا جو اپنی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں میں خود مختار ہو اور آئندہ کے لیے افغانستان میں دخل اندازی نہ کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ گو افغانستان ہمیشہ سے ہی آزاد رہا مگر گزشتہ ستر سال سے برطانیہ طاقت کے زور پر اس کے داخلی اور خارجی معاملات میں بار بار دخل اندازی کرتا آرہا تھا۔ تاہم جہاد کی برکت سے وہ اپنے مقاصد میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

شہزادہ فضل دین (جنوبی قبائل کا محاذ)

تحریکِ شیخ الہند کا ایک اثر جنوبی قبائل کی جہادی تحریک کے حجم اور رفتار میں اضافہ تھا۔ یہاں ملا پاوِندہ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد کانی گرم کے مقام پر مسعود قبائل کا بڑا جلسہ ہوا جس کی صدارت 'ملا ہمزولہ' عرف 'سرکائی آبا' اور 'مولوی عبدالحکیم' نے کی۔ اس جلسے میں ملا پاوِندہ کی وصیت پڑھی گئی جس میں قبائیلوں کو عام وصیت کے علاوہ اپنے چودہ سالہ بیٹے 'فضل دین' کو جانشین مقرر کرنے کی خواہش کا اظہار تھا۔ تمام قوم نے شہزادہ فضل دین کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا اور ملا پاوِندہ کے تمام اختیارات آپ کو دے دیے، جبکہ سرکاری ملک آپ کے بجائے آپ کے بڑے بھائی 'صاحب دین' کو جانشین بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے پہلے انھوں نے انگریز کو قائل کیا کہ وہ مولوی عبدالحکیم کو مراعات دیں تاکہ وہ فضل دین کی حمایت نہ کریں، تاہم مولوی صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے صاحب دین کو ورغلا کر اسے مولوی عبدالحکیم پر قاتلانہ حملہ کا سجھایا مگر اس حملے میں بھی وہ بچ گئے۔

گھریلو اختلافات سے فارغ ہوتے ہی شہزادہ فضل دین نے کابل کا دورہ کیا جہاں افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان نے آپ کا پر جوش استقبال کیا اور ۲۱ ہزار ۵۰۰ روپے وظیفہ بھی دیا۔ اس وقت انگریز جرمنی کے خلاف جنگ میں پھنس چکا تھا اور امان اللہ بھی انگریزوں سے تنگ آ چکا تھا۔ کابل سے واپسی پر فضل دین نے ایک بڑے جلسے میں حکومت کو ۱۴ دن کا نوٹس دیا کہ وہ بلوچ رجمنٹ کے زیرِ حراست مسعود مجاہدین کو رہا کرے اور مسعود قبیلے کی مراعات بحال کرے۔ میعاد ختم ہوتے ہی مجاہدین نے کجوری پر حملہ کیا جہاں ۱۰ سپاہی قتل اور ۳ زخمی ہوئے۔ اس کے بعد آپ نے مجاہدین کو حکم دیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں فوجی تنصیبات اور قافلوں پر حملوں کا سلسلہ شروع کریں۔ انگریز کا ان حملوں میں اتنا نقصان ہوا کہ وائسرائے ہند نے اعلان کیا: ''مسعود قبیلے کے جرائم کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے اور ان سے حساب چکانے کا دن صرف اتنا دور ہے کہ ہم باہر سے فارغ ہو جائیں''۔

مگر انگریزوں نے عالمی جنگ سے فارغ ہونے سے پہلے ہی مسعود مجاہدین کے خلاف فوج کشی کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے انھیں نقل و حمل کے لیے منزئی سے سرویکائی تک براستہ گومل سڑک درکار تھی۔ جیسے ہی

انگریزوں نے سڑک کی تعمیر شروع کی تو مسعود قبائل نے اعلان کیا کہ گومل کے علاقے میں انگریزوں کو کسی قسم کی سڑک نہیں بنانے دیں گے۔ فروری ۱۹۱۷ء میں ملا ہمزولہ اور شہزادہ فضل دین نے سرویکائی پر بڑے حملے کی تیاری کی۔ اس طرح فریقین کے درمیان بھرپور جنگ چھڑ گئی۔ مجاہدین نے انگریز کو شدید نقصان پہنچاتے ہوئے سرویکائی کے قلعے میں محصور کر لیا، لیکن ٹانک سے کمک پہنچنے اور جہادی لشکر کا راشن ختم ہونے کی وجہ سے محاصرہ توڑنا پڑا۔ اس واقعے کے بعد بھی انگریزوں کے قافلوں پر حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار مئی میں انگریز فوج نے ہوائی جہازوں کی مدد سے جنوبی وزیرستان پر لشکر کشی کی جس کے نتیجے میں انگریز اور مسعود قبائل کے درمیان معاہدہ ہوا کہ انگریز تمام الاؤنس اور مراعات بحال کریں گے اور تمام قیدی رہا کریں گے۔ مزید یہ کہ ان کے علاقے میں کوئی سڑک تعمیر نہ ہوگی۔

جب امان اللہ نے انگریزوں کے خلاف تیسری افغان جنگ چھیڑ دی تو مسعود مجاہدین نے بھی پھر سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس جنگ میں وزیرستان کی پٹھان ملیشیا بغاوت کر کے شہزادہ فضل دین کے ساتھ ہو گئی اور انگریز فوج کو ڈیرہ اسماعیل خان کی سرحد تک دھکیل دیا۔ اس کے بعد شہزادہ فضل دین نے ذاتی وجوہات کی بنا پر علمِ جہاد حاجی مرزا علی خان کے سپرد کر دیا۔

حاجی مرزا علی خان 'فقیر ایپی' (۱۸۹۷ء تا ۱۹۶۰ء)

حاجی مرزا علی خان ولد ارسلان، وزیرستان میں 'حاجی' کے نام سے اور دشمن کے یہاں 'اے پی فقیر' کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کی پیدائش شمالی وزیرستان کے گاؤں 'کم شام' میں ہوئی مگر تعلق وزیروں کی ذیلی شاخ توری خیل سے تھا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ کے والد اپنے دو بڑے بیٹوں کے ہمراہ انگریز کے خلاف جہاد میں مصروف تھے کہ دونوں بیٹے شہید ہو گئے جبکہ خود حاجی صاحب اس وقت جلال آباد میں تھے۔ آپ نے واپس آکر شہزادہ فضل دین کے ساتھ مل کر جہاد شروع کیا۔ شہزادہ فضل دین نے آپ کی صلاحیتوں کو بھانپ کر آپ کو اپنا مشہور گھوڑا دیا۔ شہزادہ فضل دین کو احساس ہو گیا تھا کہ مسعود قوم اب اس قابل نہیں رہی کہ تنِ تنہا مزید اپنے کندھوں پر یہ ذمہ داری ادا کر سکے، لہٰذا انہوں نے حاجی صاحب کو شمالی وزیرستان پر توجہ دینے کو کہا۔ حاجی صاحب نے جلسے جلوس کیے اور چندے وصول کیے اور پھر شمالی وزیرستان میں جہاد کا آغاز کر دیا۔ آپ نے جہاد کے ساتھ ساتھ مدرسے میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ الیگزنڈر پوسٹ، خیسورہ، ارسل کوٹ اور سپلا توئی کے مقامات پر اہم معرکے لڑ کر انگریز کے خلاف شدید مزاحمت کی، یہاں تک کہ صوبہ سرحد کے انگریز گورنر نے اعلان کیا کہ جو شخص اے پی فقیر اور حکومت کے درمیان صلح کرائے گا تو اسے حکومت انعام دے گی۔ اے پی

فقیر کو بھی پیغام بھیجا کہ اگر وہ دوستی کرے تو وزیرستان کو سوات جیسی ریاست بنا دیں گے۔ مگر انگریز کی یہ کوششیں ناکام ہوئیں۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان کی طرف سے سرحد کا گورنر 'مسٹر ڈانڈاس'، پولیٹیکل ایجنٹ اور قبائلی ریزیڈنٹ 'میجر کاکس'، تمام ہی انگریز مقرر ہوئے جنھوں نے برطانوی ہند کے مخالفین کو پاکستان کا بھی مخالف تصور کیا۔ لیکن بد قسمتی سے جب پہلا مسلمان افسر یہاں مقرر ہوا تو اس نے بھی برطانوی پالیسی کو ہی جاری رکھا اور ۱۹۴۷ء کے آخر میں شمالی وزیرستان کے پولیٹیکل ایجنٹ 'عطاءاللہ خان' نے حاجی صاحب کے جلسے پر پاکستانی ایئر فورس کے جہازوں سے حملہ کرایا جس میں قیمتی جانیں جامِ شہادت نوش کر گئیں۔ اس کے نتیجے میں حاجی صاحب نے شمالی اور جنوبی وزیرستان کی ایجنسیوں پر مشتمل آزاد و خود مختار ریاست کا مطالبہ کیا جس کی خارجہ پالیسی، دفاع اور کرنسی پاکستان کے تابع ہوں اور ریاست کا انتظام و انصرام آزادانہ طور پر شریعت کے مطابق ہو۔ لیکن پاکستانی حکومت کی ناسمجھی اور منافقت نے ایسا نہ ہونے دیا۔ آخری عمر میں حاجی صاحب معذور ہو گئے اور اپریل ۱۹۶۰ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

رائل انڈین آرمی کی دوسری تنظیمِ نو (۱۹۲۲ء)

جنگِ عظیم اول کے بعد رائل انڈین آرمی میں نمایاں تبدیلیاں کی گئیں۔ ان تبدیلیوں کو 'فوج کو ہندوستانی بنانے' کا نام دیا گیا۔ اب فوج میں ہندوستانی افسروں کی تعداد بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ دو طرح کے ہندوستانی افسر بھرتی کیے گئے۔ ایک وہ افسر جن کی تربیت انڈین ملٹری اکیڈمی میں کی جاتی تھی، انھیں 'وائسرائے کمیشن' کا نام دیا گیا۔ ان افسروں کو صرف ہندوستانی فوجیوں پر اختیار حاصل تھا۔ جبکہ دوسری طرح کے افسر وہ تھے جنھیں 'کنگز کمیشن' یا 'بادشاہ کا کمیشن' کہا جاتا تھا اور ان کی تربیت 'سینڈ ہارٹس ملٹری اکیڈمی برطانیہ' (Royal Military Academy Sandhurst) میں ہوتی تھی۔ ان افسروں کو ہندوستانی اور برطانوی فوجیوں پر یکساں اختیارات تھے۔

اس فوج کی تنظیمِ نو میں جو دوسری تبدیلی کی گئی، وہ یہ تھی کہ مدراس کی فوج کی پنجابی، پٹھان رجمنٹوں کو ملا کر پہلی، دوسری، آٹھویں، چودھویں، پندرہویں اور سولھویں پنجاب رجمنٹیں بنائی گئیں جو اب پاکستان کی پنجاب رجمنٹ کا حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ بمبئی کی فوج کی ایک سو چوبیسویں، ایک سو ستائیسویں، ایک سو انتیسویں اور ایک سو تیسویں بلوچ انفنٹری اور مدراس فوج کی میکلوڈ کی پلٹن کو ملا کر دس بلوچ رجمنٹ بنا دیا گیا جو اب پاکستان کی 'بلوچ رجمنٹ' ہے۔ اسی طرح گائیڈ کی کور کو گھڑ سوار دستے اور پیادہ فوج بنا کر علیحدہ علیحدہ کر دیا

گیا۔ پیادہ فوج کا نام دس فرنٹیئر فورس رکھا گیا جو اب پاکستان کی فوج کی 'فرنٹیئر فورس رجمنٹ' ہے۔

پاکستان کی ٹینکوں کی رجمنٹوں کی تنظیمِ نو بھی اسی دور میں مکمل ہوئی۔ اس دور میں جب ٹینک ابھی عام نہیں ہوئے تھے تو یہ فوج گھڑ سوار فوج یا 'کیولری' کہلاتی تھی۔ اس فوج میں گھڑ سوار، نیزہ باز دستے (لانسر) کے علاوہ بکتر بند گھڑ سوار دستے (آرمر) اور سادہ گھڑ سوار دستے (ہارس) شامل تھے۔ آج بھی ان رجمنٹوں کو انھی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب ان رجمنٹوں کے پاس گھوڑے کی جگہ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں ہیں۔

نیو ورلڈ آرڈر کا دوسرا دور؛

جنگِ عظیم اول کے اختتام سے جنگِ عظیم دوم کے اختتام تک (۱۹۱۹ء تا ۱۹۴۵ء)

فسطائیت(Fascism)اور جمہوریت کی جنگ

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ جنگِ عظیم دوم کی بنیاد جنگِ عظیم اول کے اختتام پر ہونے والا 'معاہدۂ وار سیلس' تھا، جس کے تحت جرمنی کے اوپر عسکری پابندیاں لگادی گئی تھیں اور اس کے معدنیات سے مالامال علاقے فرانس کو دے دیے گئے تھے۔ پھر اس پر ہی بس نہیں بلکہ جرمنی کو جنگ شروع کرنے کے جرم میں تمام اتحادیوں کے جنگی اخراجات ادا کرنے کے لیے بھی پابند کر دیا گیا تھا۔ جرمنی کی یہ حالت تھی کہ نہ اس کے پاس معدنیات والے علاقے باقی تھے اور نہ ہی اس کے پاس پیسے تھے۔ جرمن قوم کے اندر اس معاہدے کے خلاف شدید ردِ عمل موجود تھا، خصوصاً معاہدے کی اس شق کے خلاف کہ جس میں جرمن قوم کو اس جنگ کا واحد ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ جرمن قوم نے اسے قومی بے عزتی سے تعبیر کیا۔ اس معاہدے نے جرمن قوم کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا کہ یا تو وہ ساری زندگی غلاموں کی طرح ٹیکس ادا کریں یا پھر وہ اس معاہدے کے خلاف بغاوت کر دیں۔ بغاوت کرنے کے لیے انھیں کسی مضبوط قیادت کی ضرورت تھی اور یہ کمی ان کے لیے 'ہٹلر' (Adolf Hitler) نے پوری کر دی۔

ہٹلر اور فسطائیت کا عروج

ہٹلر ۱۸۸۹ء میں آسٹریا میں پیدا ہوا۔ وہ بڑا ہو کر ایک آرٹسٹ بننا چاہتا تھا۔ وہ آرٹسٹ بننے کے لیے آسٹریا کے شہر 'ویانا' آیا مگر آرٹ کالج میں داخلہ نہ لے سکا۔ اس دوران اسے تاریخ، جغرافیہ اور فلسفہ پڑھنے کا موقع ملا۔ اس مطالعہ سے ہٹلر اس نتیجے پر پہنچا کہ یورپ کے مسائل کی دو بڑی وجوہات ہیں؛ ایک جمہوری نظام اور دوسری یہودی قوم۔ اس کے خیال میں یہودی پوری معیشت پر غالب آ چکے ہیں اور ہر سازش اور چال کے پیچھے ان کا ہاتھ ہے۔ دوسرا وہ سوچتا تھا کہ جمہوریت یہودیوں کا نظام ہے جو انسان کو کمزور قیادت دیتا ہے اور وہ قیادت باآسانی یہودیوں کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ ابھی وہ ویانا میں ہی تھا کہ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اول شروع ہو گئی، جس میں شامل ہونے کے لیے ہٹلر جرمن فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس جنگ میں وہ دو دفعہ زخمی بھی ہوا۔ جنگ

میں ہٹلر کی بہادری کی بہت شہرت ہوئی۔ اس کی بہادری کی وجہ سے اسے جرمنی کے سب سے بڑے تمغے 'آئرن کراس' (Iron Cross) سے نوازا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں میدانِ جنگ میں زہریلی گیس کے اثر سے اس کی بینائی وقتی طور پر متاثر ہوئی اور اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ابھی وہ ہسپتال ہی میں تھا کہ اسے جرمنی کی شکست کی اطلاع ملی۔

اس شکست نے ہٹلر کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا اور اس نے سیاست میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم ہٹلر کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ سیاست کے لیے کس پارٹی میں شامل ہو۔ اسی دوران اس کی ملاقات ایک چھوٹی سی 'نازی پارٹی' سے ہوئی جس کے بمشکل پچیس ممبر تھے۔ یہ پارٹی جرمن قوم کو اس مشکل دور سے نکالنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ہٹلر کے عزائم بھی ان سے ملتے تھے۔ اس نے اس پارٹی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دور میں جرمنی کا یہ حال تھا کہ وارسیلس معاہدے نے جرمنی کی معیشت تباہی کے دہانے پر لا کھڑی کی تھی۔ یہ موقع ہٹلر کے لیے موزوں ثابت ہوا۔ اس کی تقریروں نے پورے جرمنی میں آگ لگا دی۔ اس نے مری ہوئی جرمن قوم میں یہ احساس پیدا کیا کہ دنیا کی سب سے افضل قوم جرمن قوم ہے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اس قوم کو غلام بنا سکے، بلکہ پورے یورپ پر حکومت کرنے کا حق صرف جرمن قوم کو ہے۔ اس نے معاہدۂ وارسیلس کو مسترد کر دیا اور اس معاہدے پر دستخط کرنے کا سارا الزام ملک کی سوشلسٹ اور یہودی پارٹیوں پر ڈال دیا۔ اس نے جرمنی کے مسائل کی جڑ یہودیوں کو قرار دیا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ طاقت آنے کے بعد وہ پورے یورپ سے یہودیوں کو نکال دے گا۔ اس نے جرمن قوم سے وعدہ کیا کہ وہ اقتدار میں آ کر وارسیلس معاہدے پر عمل درآمد روک دے گا۔ یہ وہ نعرے اور باتیں تھیں جو ۱۹۲۰ء کی دہائی میں جرمن قوم سننا اور ماننا چاہتی تھی۔

۱۹۳۱ء میں ہٹلر کی پارٹی معمولی اکثریت کے ساتھ پارلیمنٹ میں پہنچی مگر ۱۹۳۳ء میں یہ پارٹی اقتدار میں آنے میں کامیاب ہو گئی۔ اسی سال ہٹلر جرمنی کا چانسلر بن گیا۔ اس نے 'چانسلر' کا خطاب لینے کے بجائے اپنا خطاب 'فیوہرر' (Führer) رکھا جس کا مطلب ہے 'لیڈر'۔ اقتدار میں آنے کے بعد اس کا ہر عمل معاہدۂ وارسیلس کے خلاف جانا شروع ہو گیا۔ اس نے تمام واجبات کی ادائیگیاں روک دیں۔ دوسری طرف اس نے جرمنی کی فوج کو دوبارہ سے منظم کرنا شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے ٹینک، توپوں اور ہوائی جہاز بنانے کا بھی حکم جاری کر دیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس نے رائن لینڈ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۳۸ء میں اس نے بغیر جنگ کے آسٹریا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے برطانوی وزیر اعظم کے ساتھ ایک معاہدے میں چیکو

سلواکیہ کے جرمن حصے پر قبضہ کر لیا اور چند ماہ بعد ہی اس نے سارے چیکو سلواکیہ پر قبضہ کر لیا۔ سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے برخلاف ہٹلر نے 'میسولینی' (Benito Mussolini) کے پیش کردہ 'فسطائیت' (Fascism) کو اپنا منشور بنایا۔ ہٹلر کے عروج کے ساتھ 'فسطائیت' کو بھی یورپ میں عروج ملا اور فسطائیت کے اس عروج سے یورپ میں سرمایہ دارانہ جمہوری نظام خطرے میں پڑ گیا۔ 'فسطائیت' کی بنیاد دو نظریات؛ 'قوم پرستی' (Nationalism) اور 'آمریت' (Totalitarianism) تھے۔ ہٹلر نے ایک طرف جرمن قومیت کو اٹھایا، انھیں سب سے برتر اور سب پر حکمرانی کا مستحق ثابت کیا اور دوسری طرف اس نہج پر جرمنی کو چلایا کہ پوری قوم فردِ واحد کے اشاروں پر چلنے لگی۔

جنگِ عظیم دوم

۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور اٹھارہ دن کی لڑائی میں پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔ پولینڈ پر قبضہ کرنا ہی تھا کہ برطانیہ اور فرانس جنگ میں کود پڑے اور اس طرح جنگِ عظیم دوم کا آغاز ہو گیا۔ اس جنگ میں اٹلی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ جرمنی نے پولینڈ کے بعد فرانس اور اس کے بعد ناروے پر بھی قبضہ کر لیا۔ مغربی یورپ کے بعد جرمنی نے اپنا رخ مشرقی یورپ کی طرف کیا۔ روس پر تین مرتبہ حملہ کیا مگر شدید موسمی حالات کی وجہ سے ماسکو پر قبضہ نہ کر سکا اور یہیں سے اس کی شکست کا آغاز ہوا۔ روس پر حملے کے ساتھ ہی اس نے اٹلی کی مدد سے برطانیہ کے زیرِ قبضہ مصر پر بھی حملہ کر دیا۔

جرمنی کی ان فتوحات کے سامنے جب ۱۹۴۱ء میں برطانیہ کی شکست یقینی نظر آنے لگی تو امریکہ اس کی مدد کے لیے میدان میں آیا۔ جبکہ جاپان نے امریکہ سے دشمنی کی بنا پر جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس طرح ایک جانب برطانیہ، فرانس اور امریکہ کا اتحاد بن گیا اور دوسری جانب جرمنی، اٹلی اور جاپان کا۔ روس کسی اتحاد میں شامل ہوئے بغیر جرمنی کے خلاف لڑ رہا تھا۔ ہٹلر کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے بیک وقت مختلف سمتوں اور مختلف دشمنوں کے ساتھ محاذ کھول دیا۔ ان حالات میں وہ جنگ کو زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکا۔ اسی جنگ میں امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم گرایا تھا۔ روس کے خلاف جرمنی کی شکست نے اتحادیوں کو چاروں اطراف سے جرمنی پر حملہ کرنے کا موقع دیا اور یوں جرمنی کی ہار یقینی ہو گئی۔ مغرب اس جنگ کو 'فسطائیت' کے مقابلے میں 'سرمایہ دارانہ جمہوری نظام' کی فتح قرار دیتا ہے۔

رائل انڈین آرمی؛ جنگِ عظیم دوم میں

جنگِ عظیم دوم میں بھی برطانیہ نے ہندوستان کی رائل انڈین آرمی کو استعمال کیا، یہاں تک کہ رائل انڈین آرمی رضاکارانہ طور پر اپنے آقاؤں کی خدمت کرنے والی تاریخ کی سب سے بڑی فوج ٹھہری۔ جنگِ عظیم دوم میں اس کی اکیس (۲۱) پیادہ ڈویژنوں اور چار (۴) آرمرڈ ڈویژنوں نے حصہ لیا، جو کل 'پچیس لاکھ' جوانوں پر مشتمل تھیں۔ ان جوانوں نے برما، ملایا، عراق، ایران، شام، لبنان، اٹلی، سنگاپور، تیونس، مصر اور مشرقی افریقہ کے محاذوں پر برطانیہ کے لیے خدمات انجام دیں۔ ان فوجیوں میں سے ستاسی ہزار (۸۷۰۰۰) فوجی اس جنگ میں اپنے آقا کے لیے قربان ہوئے اور تیس کو برطانیہ کا فوجی اعزاز 'وکٹوریہ کراس' ملا۔ اس جنگ میں فوجی بھرتی کے لیے سب سے اہم کردار پنجاب میں موجود 'یونینسٹ پارٹی' (Unionist Party) کے سربراہ 'سردار سکندر حیات خان' نے ادا کیا۔

جنگِ عظیم دوم کا حاصل

جنگِ عظیم دوم کے بعد عملاً مغرب کو وہ اہم نتائج حاصل ہوئے جن کے خواب وہ دیکھ رہا تھا۔ ان میں 'اقوامِ متحدہ' کا قیام، ریاستِ اسرائیل کی باضابطہ منظوری، بریٹن ووڈ کا نیا عالمی مالیاتی نظام اور جرمنی اور اٹلی کی فسطائیت کا خاتمہ شامل تھے۔

نیو ورلڈ آرڈر کا تیسرا دور:

روس اور امریکہ کی سرد جنگ (۱۹۴۵ء تا ۱۹۹۱ء)

جنگِ عظیم دوم میں چونکہ روس اور مغربی ممالک دونوں جرمنی اور اس کے اتحادیوں سے ڈسے ہوئے تھے، اس لیے یہ ایسے جانور بن گئے جو جنگل میں طوفان آنے پر ایک ٹیلے پر جمع ہو جاتے ہیں اور جیسے ہی طوفان تھم جائے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ بعینہ یہ مغرب اور روس کے درمیان ہوا۔ جیسے ہی جنگِ عظیم دوم میں جرمنی اور اتحادیوں کا خطرہ ختم ہوا تو یہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے لگے۔ روس اور امریکہ کی اس جنگ کو تاریخ میں 'سرد جنگ' (Cold War) کہا جاتا ہے۔

روس میں 'کیمونسٹ انقلاب' ۱۹۱۷ء میں آیا۔ اس وقت اس انقلاب کا روحِ رواں 'لینن' تھا۔ لینن کے مرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں 'سٹالن' (Joseph Stalin) روس کا انقلابی لیڈر بنا۔ اس نے روس کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور بہت کم عرصے میں روس دنیا کا بڑا صنعتی ملک بن گیا۔ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر اور سٹالن کے درمیان مشرقی یورپ کی تقسیم کے بارے میں ایک خفیہ معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کو 'مولٹوو، ربن ٹروپ معاہدہ' (Molotov-Ribbentrop Pact) کہتے ہیں۔ یہ معاہدہ ایک دھوکہ ثابت ہوا، جب ہٹلر نے ۱۹۴۱ء میں روس پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے بعد روس، امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ اتحاد میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء میں روس نے مشرقی جرمنی سمیت سارے مشرقی یورپ پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضے کے بعد روس نے ان ریاستوں کو روس میں شامل کرنا شروع کر لیا اور کچھ ریاستوں کو بالواسطہ شامل کیا گیا۔ اس ساری ترتیب کو روس نے 'مشرقی اتحاد' کا نام دیا۔ اس اتحاد میں ہنگری، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، بلغرات، رومانیہ اور البانیہ شامل تھے۔

۱۹۴۹ء میں چین میں 'ماؤ زی تنگ' (Mao Zedong) کا کیمونسٹ انقلاب آگیا۔ سٹالن نے چین کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے سے مغرب نے اپنی سلامتی کے لیے خطرات محسوس کرنا شروع کر دیے۔ چین کے اس انقلاب سے پورے جنوب مشرقی ایشیا بالخصوص 'کوریا' اور 'ویتنام' میں ایک انقلاب کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کر دیا۔ امریکہ نے جنوبی کوریا کا ساتھ دیا اور اپنی فوجیں اس کی مدد کے لیے اتار دیں۔ ۱۹۵۹ء میں امریکہ نے ویتنام میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ اس طرح ویتنام کی دس سالہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ روس اور چین کے منصوبے واضح تھے۔ 'سوشلزم' ہر ملک میں اپنا کام فکری

جنگ سے کرتا تھا۔ اُس ملک میں پڑھے لکھے با اثر طبقے کو منظم کر کے وہ مزدوروں کی یونین قائم کرتے تھے، پھر اس ملک میں گوریلا جنگ کا آغاز ہوتا اور اس ملک کو روس یا چین کی مدد ملتی تھی۔ سیاسی انقلاب برپا ہونے کے بعد اس ملک میں مکمل طور پر 'سوشلسٹ انقلاب' برپا کر دیا جاتا تھا۔ امریکہ اور یورپ، روس اور چین کی اس توسیع پسندی سے سخت خائف تھے۔

امریکہ کے مقابلے میں روس نے بھی ایٹمی دھماکہ کیا جسے امریکہ نے اپنی قومی سلامتی کے خلاف جانا۔ یوں دنیا ایک نئی طرز کی جنگ میں داخل ہو گئی۔ اس جنگ کے کئی پہلو تھے لیکن خاص بات یہ تھی کہ دونوں عظیم طاقتوں نے آمنے سامنے آنے کی بجائے اپنے محاذ اپنے ممالک سے دور کسی چھوٹے ممالک کی طرف منتقل کر دیے۔ اس جنگ کی دوسری خاص بات یہ تھی کہ دونوں طاقتوں کی عالمی دنیا میں اپنے اتحادی بنانے کی دوڑ شروع ہو گئی۔ ساتھ ساتھ روس کی بلاواسطہ توسیع پسندانہ پالیسی سے مغرب بالخصوص امریکہ خائف تھا۔

روس کے اس توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف اس وقت امریکی صدر 'ٹرومین' (Harry Truman) نے ایک لائحہ عمل تیار کیا جسے 'ٹرومین لائحہ عمل' (Truman Doctrine) کہتے ہیں۔ اس لائحہ عمل کے مطابق امریکہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ جنوب ایشیائی ممالک کو فوجیں بنانے کے لیے بڑی امداد دے گا تا کہ وہ روس کا مقابلہ کر سکیں۔ اس امداد کو وہ 'منصوبہ برائے باہمی فوجی تعاون' (Mutual Military Assistance Program) کہتے تھے۔ جو اس پروگرام میں شامل ہوتا اسے وہ فرنٹ لائن اتحادی قرار دیتے تھے۔ پاکستان بھی اس میں داخل ہوا۔ اس وقت اس جنگ کا نام ٹرومین نے 'اخلاقی صلیبی جنگ' (Moral Crusade) قرار دیا تھا۔ بھارت نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی کیونکہ وہ روس کی طرف مائل تھا۔ اس وقت پاکستان کے سربراہ لیاقت علی خان اور اس کے بعد جنرل ایوب نے منت سماجت کر کے اپنے آپ کو اس دور کی اخلاقی صلیبی جنگ میں امریکہ کا اتحادی بنایا۔

اس کے تحت پاکستان نے امریکہ کو اپنی سرزمین پر ہوائی اڈے بھی فراہم کیے۔ مشہور جاسوسی جہاز 'یوٹو' (U-2) انھیں اڈوں سے اڑتا تھا۔ ٹرومین لائحہ عمل کے مطابق مشرقی یورپ میں بھی مستقل اڈے قائم کرنے کا فیصلہ ہوا جو بعد میں 'نیٹو' کی شکل اختیار کر گیا۔ اسی دوران کمیونسٹ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کر دیا۔ امریکہ نے اسی لائحہ عمل کے تحت اس جنگ میں براہِ راست اپنی فوجوں کو داخل کیا۔ اس کے نتیجے میں امریکہ کا سب سے بڑا فوجی اڈہ جنوبی کوریا میں بنا۔ اسی دوران امریکہ نے جوش میں آکر کمیونسٹ ویتنام پر حملہ کر دیا جبکہ

روس نے ویتنام کے کمیونسٹ حریت پسندوں کی بھرپور مدد کر کے اسے امریکہ کے لیے دلدل بنا دیا۔ اس جنگ سے امریکہ خالی ہاتھ نکلا بلکہ الٹا اسے بڑا نقصان ہوا اور ۱۹۶۹ء میں اسے فوجوں کو واپس بلانا پڑا۔

ساٹھ کی دہائی میں فرانس کے جرنیل 'اینڈرے بیوفری' (Andre Beaufre) نے معرکۃ الآراء نظریہ پیش کیا جس کی تفصیلات ہم بعد میں بیان کریں گے مگر ان نظریات کے تحت پھر سے امریکہ نے اپنی افواج کی تنظیمِ نو کی۔ اس کے نظریات کے مطابق امریکہ نے روس کی طاقت کو تین طریقوں سے قابو کرنا تھا۔ رعب قائم کر کے جس میں دشمن قدم اٹھانے سے گریز کرے جسے 'ڈیٹیرنس' (Deterrence) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ اگر رعب قائم نہ رہے تو پیش بندی کے طور پر اس قوت میں اتنی صلاحیت ہو کہ دشمن کو اپنے مقاصد حاصل نہ ہوں، اور تیسرا اس دشمن کے گرد حصار قائم کیا جائے تاکہ وہ اپنے آپ کو پھیلا نہ سکے۔

اس کے پیشِ نظر امریکہ نے فوج کی تنظیمِ نو کی اور اپنی فوج کو دنیا کی باون مختلف جگہوں پر تعینات کیا۔ اس طرح دنیا کے گرد امریکہ نے ایک عسکری حصار قائم کیا۔ اسی دوران ساٹھ کی دہائی میں روس کو ایک ہزیمت اٹھانی پڑی جب اس نے اپنی ترتیبِ نو میں 'کیوبا کے ذریعے امریکہ پر میزائل داغنے کی کوشش کی تو امریکہ نے ایٹمی جنگ کی دھمکی دے دی۔ اس پر روس کو اپنے منصوبہ سے دستبردار ہونا پڑا۔ اسے 'کیوبا میزائل تنازعہ' (Cuban Missile Crisis) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں روس جو اپنے توسیع پسندانہ عزائم کو پورا کرنے کے لیے گرم پانیوں کا متلاشی تھا، افغانستان میں داخل ہو گیا جس کا مقصد گوادر کے ساحل تک رسائی حاصل کرنا تھا۔

اس طرح افغانستان میں ایک مرتبہ پھر جہاد شروع ہو گیا۔ جہادِ افغانستان دراصل تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ ہے جب پوری دنیا میں احیائے اسلام کی تحریکیں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہوئیں اور روس کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ امریکہ اور پاکستان نے جب یہ دیکھا کہ مجاہدین کھڑے ہو گئے ہیں جنہوں نے روس کے سامنے بند باندھ دیا ہے تو انھوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مجاہدین کے ساتھ تعاون کیا۔ اس کے نتیجے میں روس کو شکست ہوئی اور یوں ۱۹۹۱ء میں 'یو ایس ایس آر' (USSR) ٹوٹ گیا اور سرد جنگ کا خاتمہ ہوا اور اس کے بعد دنیا یک قطبی دور میں داخل ہو گئی۔

سرد جنگ میں روس اور امریکہ کی حکمتِ عملیاں

سرد جنگ کا آغاز جنگِ عظیم دوم کے بعد ہوا۔ جنگِ عظیم دوم میں روس اور یورپ تباہ ہو گئے اور ان کی معیشت تباہ ہو گئی۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے دونوں ممالک نے اپنے اپنے معاشی پروگرام کا اعلان کیا

اور پوری دنیا کے ممالک کو اس پروگرام میں شامل ہونے کی دعوت دی۔اس طرح سرد جنگ کے تین محاذ تھے؛ ایک سیاسی، دوسرا معاشی اور تیسرا عسکری۔ ان تینوں محاذوں پر امریکہ اور روس ایک دوسرے کے مد مقابل تھے۔ہم ان دونوں ممالک کی حکمتِ عملیوں کا ایک مختصر جائزہ یہاں پیش کرتے ہیں۔

سرد جنگ میں روس کی حکمتِ عملیاں

روس بنیادی طور پر اشتراکیت (سوشلزم) کی دعوت لے کر اٹھا تھا۔ یہ وہ نظریہ تھا جسے جرمنی کے یہودی فلسفی 'کارل مارکس' نے پیش کیا۔ یہ نظریہ بنیادی طور پر یورپ میں صنعتی انقلاب اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ردِ عمل کے طور پر برپا ہوا تھا۔ اس نظام کو اس وقت عروج ملا جب ۱۹۱۷ء میں 'لینن' نے زار روس کا تختہ الٹ کر روس میں اشتراکیت کا نظام قائم کیا۔ لینن کے مرنے کے بعد سوشلزم کے دوسرے بڑے لیڈر 'سٹالن' نے انقلاب کو سیاسی نظریہ کے طور پر اپنایا۔ روس کے زیرِ اثر اشتراکیت دوسرے ممالک میں بھی پھیلنے لگی۔ اشتراکی انقلاب تین مرحلوں میں آتا تھا۔ پہلے مرحلے میں ملک کے نوجوانوں اور پڑھے لکھے طبقے کو روس کے تعلیمی اداروں میں داخلہ دیا جاتا تھا،اس سے اس ملک میں کام کرنے والے پڑھے لکھے انقلابی لوگوں کا ایک گروہ پیدا ہو جاتا تھا۔ دوسرے مرحلے میں اس گروہ کو واپس اس ملک میں بھیج دیا جاتا، جہاں یہ طبقہ انقلاب کی فضاء بناتا تھا۔ یہ گروہ اپنے ملک میں مزدوروں اور محنت کشوں اور پڑھے لکھے طبقے کو متحرک کر کے ملک میں انتشار اور سول نافرمانی کی تحریک پیدا کرتا تھا۔ دوسری طرف گوریلا عسکری کارروائیاں کر کے اس تحریک کو مضبوط کیا جاتا تھا۔ تیسرے مرحلے میں حکومت پر قبضہ کر کے اشتراکی نظام قائم کر دیا جاتا تھا۔ یہ حکمتِ عملی بہت زیادہ کامیاب ہوئی۔ بہت کم عرصے میں اشتراکیت کی یہ تحریک مشرقی یورپ، جنوبی امریکہ، جنوب مشرقی امریکہ اور شمالی، مشرقی اور وسطی افریقہ تک پھیل گئی۔ اشتراکی تحریک کو دو مزید عوامل نے بہت زیادہ مدد دی؛ ایک وطنیت (Nationalism) اور دوسرا جنگِ عظیم دوم کے بعد برطانیہ اور فرانس کی اپنی سامراجی کالونیوں پر گرفت کا کمزور ہونا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشتراکیت نے ان ممالک میں وطنی آزادی کے نام پر گوریلا تحریکوں کا آغاز کر دیا۔ ان میں ویتنام اور الجزائر کی تحریکِ آزادی زیادہ مشہور ہیں۔ اشتراکیت کے اس پھیلاؤ نے سرمایہ دار مغرب کو سخت پریشان کر دیا۔

روس اور چین کی معاشی حکمتِ عملی

سرد جنگ کی دوسری بڑی حکمتِ عملی معاشی حکمتِ عملی تھی۔ اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام کی ضد تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام آزاد تجارت کا حامل تھا؛ ایک ایسا نظام جس کے تحت معیشت میں حکومت کی کم سے کم مداخلت ہو اور سرمایہ دار جہاں چاہے اور جیسے چاہے سرمایہ کاری کرے، جبکہ اشتراکیت اس نظام کو غریب اور مزدور طبقے کا استیصال سمجھتا تھا اور حکومت کو ہر فرد کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار گردانتا تھا۔ اس لیے انھوں نے جو نظام وضع کیا، وہ مکمل طور پر حکومتی کنڑول سے چلتا تھا۔ اس پالیسی کو 'نیشنلائزیشن' کی پالیسی کہا جاتا ہے۔ اس میں وزارتِ معیشت پورے ملک کی ضرورت کا اندازہ لگا کر خام مال کی فراہمی، صنعت کی ترقی اور مارکیٹ کی مانگ کی منصوبہ بندی کرتی ہے۔

یہ اندازِ معیشت پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانی عرصے میں اور اس کے بعد ۱۹۶۵ء تک بہت کامیابی سے چلتا رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ دونوں جنگوں کے بعد روس اور باقی دنیا میں معاشی تباہی کے سبب ترقی کی بہت زیادہ گنجائش موجود تھی، اس لیے مانگ بھی بہت زیادہ تھی۔ تاہم ۱۹۶۵ء کے بعد جب جنگِ عظیم دوم کے نقصان پورے ہو گئے تو یہ نظام جمود کا شکار ہو گیا اور پھر یہی جمود اس کے زوال کا سبب بنا۔ اس جمود کی ایک اور بڑی وجہ یہ تھی کہ روس نے بڑی مشین اور اسلحہ کی صنعت پر زیادہ توجہ دی جبکہ روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں اس کے لیے دوسری ترجیح تھیں۔ اس کے سبب روزمرہ کی چیزوں کی مارکیٹ پر گرانی ہو گئی اور لوگوں میں اضطراب بہت بڑھ گیا۔ نتیجتاً روزمرہ کی چیزوں کی مانگ بھی زیادہ ہوئی اور منافع بھی۔ اس کے بالعکس اسلحہ روزمرہ کی چیز نہ تھا۔ صورتحال یہ ہو گئی کہ بہت سا اسلحہ تو سٹور میں پڑا ہوا تھا جبکہ لوگوں کے کھانے کے لیے آٹا موجود نہ تھا۔ پھر روزمرہ کی چیزوں میں بھی کوئی توازن نہ تھا۔ کچھ چیزیں تو اتنی زیادہ بنادی جاتیں جن کی مانگ نہ ہوتی جبکہ زیادہ مانگ والی چیزیں بازار میں موجود ہی نہ ہوتیں۔ ٹارچ کا سیل نہ ملتا تھا جبکہ مہنگا شیمپو موجود تھا۔ اس نظام کو ٹھیک کرنے کی کوشش ہی نہ کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اربوں روپوں کا مال سٹوروں میں سڑ رہا تھا اور اربوں ہی روپوں کا سامان مارکیٹ میں پڑا تھا جس کی کوئی مانگ نہ تھی۔ جہادِ افغانستان کے نتیجے میں یہ نظام مزید جمود کا شکار ہوا، روسی معیشت پر بھاری ضرب پڑی اور روس کے پاس جنگ لڑنے بلکہ خود اپنے داخلی معاملات کو بھی ٹھیک طرح سنبھالنے کے لیے پیسے نہ رہے۔ روس جیسی صورتحال اس کے اتحادیوں کی بھی تھی۔ البتہ چین نے اس معیشت کو بہت دانائی سے چلایا، اس لیے اس کا روس جیسا حال نہ ہوا۔

سرد جنگ میں امریکہ کی سیاسی حکمتِ عملی

سرد جنگ میں امریکہ اور مغرب کے سامنے بہت سے چیلنج تھے۔ان کا سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ اشتراکیت کے پھیلنے سے مغرب کی وہ ترقی جو اس نے امتِ مسلمہ کو لوٹ کر صنعتی انقلاب سے حاصل کی تھی، خطرے میں پڑ گئی۔ یہ صورتحال ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ دوسری طرف روس نے مشرقی یورپ پر قبضہ کر لیا تھا۔ تیسری طرف وہ جنوب مشرقی ایشیا، جنوبی امریکہ اور افریقہ کے بیشتر ممالک میں بھی اپنے نظام کا نفاذ کر چکا تھا۔اس سارے نظام سے نمٹنے کے لیے امریکہ نے یورپ کے ساتھ مل کر اشتراکیت کی ناکہ بندی اور اس کو محدود کرنے کی ایک جامع حکمتِ عملی تشکیل دی۔ اس حکمتِ عملی کا خالق امریکہ کا اس وقت کا صدر ٹرومین تھا۔ ٹرومین کے بعد آنے والے صدور نے اس کو مزید ترقی دی۔ اس میں 'آئیزن ہاور' (Dwight Eisenhower) سر فہرست ہے۔ یہ حکمتِ عملی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عسکری تھی۔ یہ پالیسی ہر علاقے کے حساب سے علیحدہ علیحدہ تشکیل دی گئی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں امریکہ نے 'سیٹو'[46] (SEATO) کے نام سے جاپان، فلپائن، انڈونیشیا، جنوبی کوریا اور جنوبی ویتنام سے معاہدے کیے۔ جنوبی کوریا اور جنوبی ویتنام میں تو اس نے بلاواسطہ اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ دوسری طرف اس نے فلپائن، جاپان اور آسٹریلیا سے فوجی اڈے قائم کرنے کے لیے جگہیں حاصل کر لیں۔ اور تیسری طرف جو ملک عسکری طور پر کمزور تھے، انھیں اشتراکیت کے خلاف جنگ کرنے کے لیے عسکری امداد بھی فراہم کی۔

اسی قسم کا دوسرا اتحاد 'سینٹو'[47] (CENTO) یا 'بغداد پیکٹ' (Baghdad Pact) کہلاتا ہے۔ اس معاہدے میں عراق، ایران، ترکی اور پاکستان شامل تھے۔ اس معاہدے کے تحت امریکہ نے پاکستان کو اشتراکیت کے خلاف صفِ اول کا اتحادی قرار دیا اور فوجی امداد بھی دی۔ پاکستان نے روس کے خلاف امریکہ کو اڈے بھی فراہم کیے۔ عراق بعث پارٹی کے انقلاب کے بعد اس معاہدے سے نکل گیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ترکی اور پھر ۱۹۷۹ء میں شیعہ انقلاب کے بعد ایران بھی اس معاہدے سے نکل گیا۔ صرف صفِ اول کا غلام پاکستان باقی بچا جس نے بعد میں افغانستان میں اپنا کردار نبھایا۔

---

[46] South East Asia Treaty Organization (SEATO)

[47] Central Treaty Organization (CENTO)

تیسرا اتحاد 'نیٹو'[48] (NATO) کا اتحاد کہلاتا ہے جس میں امریکہ سمیت تمام یورپی ممالک کو شامل کیا گیا۔ یہ ایک مکمل معاشی اور عسکری اتحاد تھا۔ اس اتحاد کے تحت امریکہ نے یورپ کی جنگِ عظیم دوم میں ہو نے والے نقصانات کو پورا کرنے کے لیے 'مارشل پلان' (Marshall Plan) کا اعلان کیا[49]۔ یہ یورپ کی تنظیمِ نو کا منصوبہ تھا۔ اسی منصوبے کے تحت یورپ میں ترقی کے دروازے کھولے گئے جس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

امریکہ کا معاشی نظام؛منڈی کی معیشت(یہودیوں کی عالمگیر حکومت کی تکمیل)

سرد جنگ میں امریکہ کی سب سے بڑی کامیابی پوری دنیا میں اپنا نیا معاشی نظام قائم کرنا تھا جسے آج 'منڈی کی معیشت' (Market Economy) کہا جاتا ہے۔ یہ وہی نظام تھا جو دورِ تنویریت کے مفکرین نے مغرب کو دیا تھا اور جس کا نفاذ انقلابِ فرانس کے بعد مغرب میں ہونا شروع ہو گیا تھا۔اس وقت سے آج تک یہ نظام انھی اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہے جنھیں گود لیے یہ پیدا ہوا تھا۔ اس میں وہی کمپنیوں کی تجارت، وہی بینکوں کا سودی نظام، وہی 'ایڈم سمتھ' کے آزاد معیشت کے نعرے اور وہی انسان کی ترقی کے سبز باغ ہیں۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دراصل یہودی سرمایہ داروں کا بنایا ہوا اور خوب سوچا سمجھا نظام ہے۔اس نظام کے ذریعے یہودیوں نے نہ صرف دنیا کے ممالک کو معاشی طور پر ایک دوسرے پر منحصر کر کے 'عالمگیریت' (Globalism) کے نئے نظریے کو جنم دیا بلکہ پوری دنیا کو ایک ایسے کنٹرول کرنے والے نظام کا غلام بنا لیا جس سے نکلنا بظاہر عام آدمی کے بس سے باہر ہے۔ عالمی معیشت کو ایک دوسرے پر منحصر بنانے سے معیشت اب ایک بہت بااثر عسکری آلہ بن گئی۔ اگر کسی قوم کو شکست دینا ہو تو اس پر معاشی پابندیاں لگا دینے سے آدھی سے زیادہ جنگ فوج کو کسی حرکت میں لائے بغیر ہی جیتی جا سکتی ہے۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد جب یورپ مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا تو اس کی نظریں ۱۹۳۳ء میں سعودی عرب اور مشرقِ وسطیٰ میں دریافت ہونے والے تیل کے ذخائر پر لگ گئیں۔ امریکہ اور مغرب کی کوشش تھی کہ یورپ کو دوبارہ سے اپنی عظمتِ رفتہ پر بحال کیا جائے اور مشرقِ وسطیٰ میں دریافت ہونے والے تیل پر قبضہ کیا

---

[48] North Atlantic Treaty Organization (NATO)

[49] یہ منصوبہ بھی امریکی صدر ٹرومین ہی کی پالیسی کا حصہ تھا جسے امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ 'جورج مارشل' (George Marshall) نے ۱۹۴۷ء میں پیش کیا تھا اور اسی کی نسبت سے اسے 'مارشل پلان' کہا جاتا ہے۔

جائے۔تاہم ان تمام مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے بے پناہ سرمایہ درکار تھا جو ان کے پاس نہ تھا کیونکہ جنگ عظیم دوم نے معیشت کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ یورپ کے کسی بھی ملک کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ملک کی بحالی کے لیے کام کر سکے۔اس سے پہلے بھی جب جنگِ عظیم اول کے بعد پوری دنیا کے ترقی یافتہ ممالک نے اپنے اپنے ممالک میں درآمدات پر پابندیاں لگا دی تھیں تو اس کے نتیجے میں یورپ ۱۹۲۹ء میں 'شدید معاشی بحران' (Great Depression) کا شکار ہو گیا تھا، آزاد تجارت کا مغربی نظریہ شکست کھا گیا تھا اور زیادہ پیداوار کرنے والے ترقی یافتہ ممالک کے لیے عالمی منڈیوں کے مواقع بند ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے بھی مغربی ممالک کو نمٹنا تھا اور عالمی منڈیوں میں اپنے لیے جگہ بھی پیدا کرنی تھی۔

ان تمام سوالات اور مسائل کو حل کرنے کے لیے ۱۹۴۵ء میں امریکہ کے شہر 'بریٹن وڈز' (Bretton Woods) میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں اس وقت کے معاشی نظام میں بڑے پیمانے پر ردوبدل کرنے کی تجاویز پیش کی گئیں۔ یہ تجاویز بظاہر بے ضرر اور انسان دوست محسوس ہوتی تھیں مگر حقیقت میں یہ پوری دنیا کو غلام بنانے کا منصوبہ تھا۔اس کانفرنس میں ترقی یافتہ مغربی ممالک بلائے گئے۔انھوں نے مل کر جو نظام تشکیل دیا، اسے 'منڈی کی معیشت' کہتے ہیں۔ سرد جنگ جہاں روس کی نظریاتی اور عسکری آزادی کو محدود کرنے کا نام تھا تو دوسری طرف یہ جنگ روس کے معاشی نظام اور امریکہ کے منڈی کی معیشت کے نظام کے درمیان بھی جنگ تھی۔

منڈی کی معیشت میں سرمائے کا نظام

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد مغربی ممالک کو تعمیرِ نو اور ترقی کے لیے لامحدود سرمایہ اور آزاد تجارتی منڈیاں درکار تھیں۔ 'بریٹن وڈز کانفرنس' (Bretton Woods Conference) دراصل انھی دو مسائل کو حل کرنے کے لیے بلائی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں ڈالر اور سونے کے بندھن کے علاوہ کرنسی، بینک اور کمپنیوں کو نئی منڈیوں سے جوڑنے کے لیے کئی اہم اقدامات کا فیصلہ ہوا۔ یہاں ہم انھی اقدامات، ان کے تاریخی پسِ منظر اور ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔

بینک اور کرنسی کا باہمی تعلق

انقلابِ فرانس سے پہلے پورے یورپ میں سونے اور بینکوں کا کرنسی (ثمن) کی قدر کے تعین میں کوئی اختیار نہ تھا۔ پھر ۱۸۱۲ء میں یورپ میں ہر ملک کی کرنسی کی قدر گو سونے سے ہی متعین ہوتی تھی مگر اس کا اختیار

بینک کو دے دیا گیا۔ یہیں سے یہودیوں کی عالمگیر حکومت کے خواب کی تعبیر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس منصوبے کا پہلا ہدف سونے کو کرنسی کی قدر متعین کرنے والے معیار کے طور پر ختم کرنا تھا۔ اس ہدف کی تکمیل کے لیے ۱۹۰۵ء میں امریکہ میں پہلی بار 'پرائز بانڈ' کا اجرا کیا گیا۔ پرائز بانڈ سے حاصل ہونے والی رقم سے ۱۹۱۳ء میں امریکہ نے 'فیڈرل ریزرو' (Federal Reserve) کے نام سے اپنا مرکزی بینک بنایا۔ اس بینک نے ۱۹۳۵ء میں دنیا کا ۷۰ فیصد سونا خرید کر اپنے پاس رکھ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں 'بریٹن وڈز کانفرنس' میں عالمی طاقتوں کے درمیان یہ طے پایا کہ ڈالر کو سونے سے منسلک کر دیا جائے اور باقی دنیا کی کرنسی کو ڈالر کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ اس نظام کو 'بریٹن وڈز کا نظام' (Brettonwoods System) کہتے ہیں۔ اس نظام کے تحت امریکہ کسی بھی رکن ملک کے مطالبے پر پابند تھا کہ اسے ڈالر کے عوض سونا ادا کرے۔ لیکن جب ۱۹۷۱ء میں فرانس نے امریکہ سے اپنی کرنسی کے عوض سونے کا مطالبہ کیا تو امریکہ نے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح 'بریٹن وڈز کا نظام' بظاہر ناکام ہو گیا یا اسے جان بوجھ کر ناکام بنا دیا گیا۔ پھر ۱۹۷۶ء میں یہ طے پایا کہ ہر کرنسی کو ڈالر سے آزاد کر دیا جائے اور ہر ملک کی کرنسی کی قدر کو 'اوپن مارکیٹ' میں عالمی طلب اور رسد پر چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح کرنسی ایک انتہائی پیچیدہ نظام (Price Index) کے تابع کر دی گئی جس کا کل اختیار ان کے اپنے ہاتھ میں تھا اور ہے۔ بین الاقوامی کرنسی کا سونے سے علیحدہ ہونا تاریخِ انسانی کا بہت اہم واقعہ ہے اور یہ مغرب اور یہودیوں کی عالمی حکومت کی تکمیل ہے۔ جب سونا معیار ہی نہ رہا تو اب جس کاغذ کے ٹکڑے کو یہ چاہیں پانچ ہزار کر دیں اور جس کو چاہیں، ایک کر دیں۔

بینکوں میں اعشاری نظام کا اجراء

کرنسی کے سونے سے علیحدہ ہوتے ہی گویا یہودیوں اور مغرب کی مراد بر آئی۔ اس نظام نے مغرب کے لیے لامحدود دولت پیدا کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اب سونا کرنسی کی قدر متعین نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ بینکوں کا ایک نیا نظام متعارف کرایا گیا۔ دنیا کے ہر ملک میں ایک 'سٹیٹ بینک' بنایا گیا۔ اس سٹیٹ بینک کا کام اپنے ملک میں کرنسی کی قدر کا تعین کرنا اور اسے کنٹرول کرنا تھا اور اس کا دوسرا کام دوسرے عالمی بینکوں کے ساتھ بین الاقوامی قوانین کے تحت رابطہ رکھنا تھا۔ اس کا طریقہ یہ بنایا گیا کہ ملک کے سٹیٹ بینک کے تحت تجارتی بینک بنائے گئے۔ ان تجارتی بینکوں کو پابند کیا گیا کہ وہ اپنے صارف سے حاصل شدہ رقم کا بیس فیصد سیکیورٹی کی مد میں سٹیٹ بینک میں جمع کرائیں۔ باقی اسّی فیصد میں سے بیس فیصد صارف کو واپس کرنے کے لیے رکھ کر ساٹھ فیصد رقم کو بینک اپنی تجارت یا صارف کو قرضے فراہم کرنے کے لیے استعمال کر لے۔ اس کے ساتھ ساتھ سٹیٹ

بینک تجارتی بینکوں کو یہ بھی اجازت دیتا تھا کہ کل جمع شدہ رقم کے دس گنا تک کی رقم تجارت یا قرض کے طور پر فراہم کی جاسکتی ہے۔ اس عمل کو 'تخلیقِ زر' کا عمل کہتے ہیں اور بینکوں کے اس نظام کو 'اعشاری نظام' (Fractional Banking) کہا جاتا ہے۔ ہم یہاں اس عمل کی تفصیل میں نہیں جائیں گے، اس کے لیے فنی کتب سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ہم یہاں اس بینکاری نظام کے فردی اور عالمی معیشت پر اثرات کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلے یہ ہوا کہ بینک کی تخلیقِ زر کی وجہ سے پوری دنیا میں لا محدود کرنسی تخلیق ہوگئی۔ یہ کرنسی کسی سونے کی طاقت کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ یہ صرف کاغذ کی ایک پرچی ہے جسے سٹیٹ بینک کے گورنر کے دستخط کے ساتھ جاری کیا جاتا ہے۔اس تخلیقِ زر کی وجہ سے پوری دنیا میں بظاہر ترقی کی راہیں کھلیں۔ پچھلے بیس سال میں دوبئی، ہانگ کانگ اور سنگاپور جیسے شہر بنائے گئے۔ تجارتی بینکوں نے گزشتہ بیس سالوں میں تجارتی قرضوں کا سیلاب برپا کر دیا۔ آج حالت یہ ہے کہ شاید ہی کوئی ملک اور فرد ایسا بچا ہو جو ان عالمی بینکوں کے قرضوں میں دب کر غلام نہ بن چکا ہو۔ دوسری طرف مغرب کی عالمی کمپنیاں ان بینکوں سے قرضے لے کر پوری دنیا کے وسائل پر قبضہ کر چکی ہیں۔

سٹیٹ بینکوں کا کرنسی کنٹرول

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ سٹیٹ بینکوں کا کام کرنسی اور تجارتی بینکوں کو کنٹرول کرنا ہے۔ اس کے لیے سٹیٹ بینک تجارتی بینکوں سے بیس فیصد سیکیورٹی رکھواتے ہیں۔ اسی طرح سٹیٹ بینک بھی عالمی بینکوں میں اپنی سیکیورٹی رکھواتے ہیں۔یوں یہ نظام تجارتی بینکوں سے عالمی بینکوں تک ایک دوسرے سے منسلک ہے۔اگر کوئی شخص دنیا میں کسی بھی جگہ ایک روپیہ بھی بینک میں جمع کراتا ہے تو اس کا کچھ نہ کچھ حصہ دنیا کے عالمی بینکوں میں ضرور جمع ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سٹیٹ بینک کرنسی کی قیمت کس طرح کنٹرول کرتا ہے؟ کرنسی دو طریقے سے کنٹرول ہو تی ہے؛ پہلا طریقہ ملکی مارکیٹ میں کرنسی کا کنٹرول اور دوسرا طریقہ بین الاقوامی مارکیٹ میں کرنسی کا کنٹرول ہے۔ کرنسی کے کنٹرول کا سادہ سا فارمولا یہ ہے کہ جب تجارتی بینک کرنسی چھاپ چھاپ کر مارکیٹ میں پھیلا دیتے ہیں تو اس عمل سے کرنسی کی طلب کم ہو جاتی ہے اور اس کی قدر بھی کم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اشیاء کی قیمت زیادہ ہو جاتی ہے اور صارف کی قوتِ خرید کم ہو جاتی ہے۔اس عمل کو 'مہنگائی' (Inflation) کہتے

ہیں۔اس کے برعکس جب مارکیٹ میں کرنسی کی مقدار کم ہو جائے گئ تو اس کی طلب بڑھے گی جس سے کرنسی کی قدر میں اضافہ ہو گا، صارف کی قوتِ خرید بڑھے گی اور اشیاء کی قیمتیں کم ہو جائیں گی۔

ملکی کرنسی کے نظام کو ملک کا سٹیٹ بینک دو عوامل کی مدد سے کنٹرول کرتا ہے؛ پہلا شرحِ سود (Interest Rate) کو کم یا زیادہ کرنا اور دوسرا پرائز بانڈ کو بیچنا یا خریدنا۔ اگر مارکیٹ میں کرنسی کی قدر زیادہ ہو جائے تو سٹیٹ بینک شرحِ سود کو زیادہ کر دیتا ہے جس سے عام صارف کو بینک سے قرضہ لینے میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اور پیسہ مارکیٹ کی بجائے تجارتی بینکوں میں رہ جاتا ہے۔ دوسری طرف سٹیٹ بینک تجارتی بینکوں کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ وہ اس کرنسی سے سٹیٹ بینک کے جاری شدہ پرائز بانڈ خرید لیں۔اس عمل سے کرنسی تجارتی بینکوں سے سٹیٹ بینک میں چلی جاتی ہے۔ جب سٹیٹ بینک دیکھتا ہے کہ اب مہنگائی اور کرنسی کی قیمت میں توازن آگیا ہے تو وہ شرحِ سود میں کمی کر دیتا ہے اور پرائز بانڈ واپس لے کر اس کی جگہ کرنسی جاری کر دیتا ہے۔اس طریقے سے کرنسی دوبارہ مارکیٹ میں جانا شروع ہو جاتی ہے۔

شکل ۱: سٹیٹ بینک کی طرف سے کرنسی کی قدر بڑھانے کا عمل

شکل ۲: سٹیٹ بینک کی طرف سے کرنسی کی قدر گھٹانے کا عمل

بین الاقوامی سطح پر کرنسی کی قدر کا تعین اس ملک کی درآمدات اور برآمدات کے درمیان توازن سے قائم ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح کوئی ملک اشیاء درآمد کرتا ہے، اسی طرح برآمد بھی کرتا ہے۔دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ سال بھر میں مجموعی طور پر ملک کی درآمدات زیادہ تھیں یا برآمدات۔ پھر ہر ملک دنیا کے کئی ممالک کے ساتھ دوطرفہ تجارت کرتا ہے جس میں ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ممالک کی کرنسیوں سے تبادلہ ہوتا ہے۔ ملک کی مجموعی تجارت کا حساب لگانے کے لیے تمام ملکوں کی کرنسیوں کا ایک دوسرے کے مقابلے میں قدر کا اندازہ لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔اس حساب کتاب کے لیے عالمی قانون کے تحت پیچیدہ فارمولہ مقرر کیا گیا ہے۔

یہ فارمولا کچھ اس طرح ہے کہ دنیا بھر میں صارفین کے لیے روزمرہ اشیائے صرف کی ایک فہرست مرتب کی جاتی ہے جسے 'سودے کی ٹوکری' (Goods Box) کہتے ہیں۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہر ملک اس ٹوکری میں اپنے ملک کی کتنی مصنوعات برآمد کرنے کے لیے ڈالتا ہے اور کتنی اشیاء باہر کے ملکوں سے درآمد کرنے کے لیے اس ٹوکری سے نکالتا ہے۔ اگر اس ملک کی برآمدات درآمدات سے زیادہ ہوں گی تو اس ملک کی کرنسی کی طلب خود بخود زیادہ ہوگی جس سے اس ملک کی کرنسی کی قدر بھی خود بخود زیادہ ہو جائے گی، جیسا کہ آج ڈالر (Dollar)، پونڈ (Pound) اور یورو (Euro) کی صورتِ حال ہے۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ جدید منڈی کی معیشت کے تحت بینکوں کا یہ نظام قائم ہونے سے پوری دنیا کی معیشت کو ایک دوسرے پر منحصر کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کسی دور دراز گاؤں میں بھی ایک روپیہ بینک میں رکھواتا ہے تو اس کا ایک حصہ ضرور ریاستی بینکوں سے ہو کر عالمی بینکوں میں جاتا ہے۔ دوسری طرف اس ایک روپے کا ساٹھ فیصد حصہ یعنی ساٹھ پیسے بینکوں کو تخلیقِ زر کے ذریعے پیسے کو دس گنا زیادہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ پھر تخلیقِ زر سے حاصل ہونے والے پیسے سے بینک فرد، تجارتی کمپنیوں اور ملکوں کو قرضے دیتے ہیں۔ اس قرضے سے ایک طرف غریب ممالک اس نظام کے غلام بن جاتے ہیں تو دوسری طرف یہودیوں کی عالمی کمپنیاں خوراکی مواد پر قبضہ کر کے دنیا کو اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔

منڈی کی معیشت کا تجارتی نظام

سرمائے کی فراہمی اور کرنسی کے نظام کو منظم کرنے سے منڈی کی معیشت کا اصل ہدف دنیا کی تجارت پر قبضہ کرنا تھا۔ تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ دنیا کے وسائل اور منڈیوں پر قبضہ کیا جائے۔ اس کے لیے 'ایڈم سمتھ' کا 'آزاد معیشت'[50] کا نظریہ نئی تشریحات کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اب آزاد معیشت کا مطلب یہ ٹھہرا کہ کسی ریاست کا اپنی ہی تجارت پر کنٹرول ختم کر دیا جائے اور ہر ملک بین الاقوامی کمپنیوں کو

---

[50] 'آزاد معیشت' کیا ہے؟ اس حوالے سے حصہ اول، باب دوم میں 'سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی فلسفہ' کے تحت بات ہو چکی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج مغرب جس 'آزاد معیشت' کی بات کرتا ہے اور جس کے نام پر اس نے پوری دنیا کی معیشت کو جکڑ رکھا ہے، وہ قطعاً وہ معیشت نہیں ہے جس کا فلسفہ ایڈم سمتھ نے پیش کیا تھا۔ بلکہ مغرب نے ایڈم سمتھ کے فلسفہ کو استعمال کیا اور اس کی تشریح اپنی مرضی کے مطابق کی۔ نتیجہ کیا ہوا: ظلمات بعضها فوق بعض!

تجارت کرنے کے لیے اپنی منڈیوں تک رسائی دے۔ یہ تجارتی نظام کس طرح کام کرتا ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلا قدم: منڈی کی معیشت کا قیام

۱۹۴۷ء میں عالمی تجارت کو کنٹرول کرنے کے لیے 'گیٹ' (GATT)[51] کے نام سے ایک ادارہ بنایا گیا جسے ۱۹۹۵ء میں 'ڈبلیو ٹی او' (WTO)[52] کا نام دے دیا گیا۔ سب سے پہلے ہر ملک کو اس کا ممبر بن کر اس ادارے کے قوانین کا پابند اور اس ادارے کی ہدایات کے مطابق اپنے ملک کی تجارت میں تبدیلیاں لانا ہوتی ہیں۔ 'ڈبلیو ٹی او' ہر ملک پر لازم کرتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں منڈی کے معاشی ادارے قائم کرے۔ ان اداروں کی پہلی قسم تجارتی بینک ہیں جن کا مقصد معاشرے کے افراد اور تجارتی کاروبار کو اس نظام کے ساتھ جوڑنا ہے۔ دوسری قسم سٹیٹ بینک ہے جو تجارتی بینکوں اور دیگر اداروں کو آپس میں جوڑتا ہے اور ان کے تعلقات کی نگرانی کرتا ہے۔ تیسری قسم 'بازارِ حصص' (Stock Market) ہیں جو دراصل ایسی کمپنیاں ہیں جو دیگر تجارتی کمپنیوں کے حصص یعنی مالکانہ حقوق کی خرید و فرخت کا کام سرانجام دیتی ہیں۔ ان اداروں کے قیام سے ملک میں منڈی کی معیشت کا نظام قائم ہوتا ہے۔

دوسرا قدم: ریاستی معیشت کی آزادی

ریاستی معیشت کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ 'ڈبلیو ٹی او' کے تمام رکن ممالک اپنی ریاست میں گورنمنٹ کے تمام تجارتی ادارے پرائیویٹ کمپنیوں کو بیچ دیں اور بیرونی درآمدات اور عالمی کمپنیوں پر قائم پابندیاں ختم کر دیں۔ اس عمل کو تین مراحل میں تقسیم کیا گیا؛ پہلا مرحلہ 'لبرلائیزیشن' (Liberalization) ہے یعنی تجارت کو آزاد کرنا، دوسرا 'سٹیبلائیزیشن' (Stabilization) ہے جس سے معیشت کو مستحکم کیا جاتا ہے، اور تیسرا 'پرائیوٹائیزیشن' (Privatization) کہلاتا ہے جس کا مطلب ملکی اداروں کی نجکاری کرنا ہے۔

---

[51] General Agreement on Tariffs and Trade (GATT)

[52] World Trade Organization (WTO)

- **پہلا مرحلہ: لبرلائیزیشن (آزادیٔ تجارت)**

اس مرحلے میں ممالک کو اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ تمام ایسے قوانین تبدیل کر دیں جو آزادیٔ تجارت کی راہ میں حائل ہوں۔ عام طور پر ملک بیرونی زرِ مبادلہ حاصل کرنے اور ملکی مصنوعات کی ترقی اور فروغ کے لیے درآمد شدہ غیر ملکی مصنوعات پر ٹیکس عائد کرتا ہے جسے 'کسٹم ڈیوٹی' (Custom Duty) یا 'ٹیرف' (Tariff) کہتے ہیں۔ اسی طرح ہر ملک اپنی مصنوعات کو برآمد کر کے زرِ مبادلہ حاصل کرنے کے لیے زمینداروں اور کارخانہ داروں کو مراعات دیتا ہے تاکہ عالمی منڈی میں ان مصنوعات کی قیمت باقی ممالک کی مصنوعات سے مقابلہ کر سکے۔ مثلاً ہم اپنے ملک میں حکومت کی جانب سے کپاس کی مصنوعات اور گندم کی پیداوار پر 'سبسڈی' (Subsidy) کے اعلانات سنتے ہیں۔ 'سبسڈی' سے مراد یہ ہے کہ جتنی گندم کسان باہر فروخت کرے گا، حکومت اسے اس کی قیمت کا دسواں یا بیسواں حصہ اپنی طرف سے ادا کرے گی۔ یہ ٹیرف اور سبسڈی لبرلائیزیشن (آزادیٔ تجارت) کی راہ میں وہ رکاوٹیں ہیں جنھیں دور کیے بغیر آزاد تجارت کا ہدف حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ لٰہذا لبرلائیزیشن کے مرحلے میں ہر ملک کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ ٹیرف اور سبسڈی ختم کرے۔

ایسی آزاد تجارت سے ظاہر ہے کہ فائدہ صرف عالمی کمپنیوں کے مالک دنیا کے آٹھ امیر ممالک کو ہی ہونا تھا جبکہ بقیہ غریب اور غیر صنعتی ممالک نے بدترین غلامی میں جکڑا جانا تھا۔ اپنے آپ کو ترقی یافتہ امیر ممالک اور باقی ممالک کو تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کہنے والوں نے گزشتہ صدیوں میں تیسری دنیا کے ممالک پر حملے کر کے ان کے قدرتی اور انسانی وسائل پر ناجائز قبضہ کیا، انھی وسائل سے اپنے ممالک میں صنعتی انقلاب برپا کیا اور مادی دوڑ میں اتنے آگے نکل گئے کہ ان کا مقابلہ کرنا اب تیسری دنیا کے بس میں نہیں رہا۔ الٹا ٹیرف، سبسڈی اور دیگر ایسے اقدامات جن سے ہو سکتا تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک اپنی معیشت کو سنبھالا دیتے، انھیں آزاد تجارت کے خوبصورت نام کے تحت روک دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد تجارت کا مطلب امیر ممالک کے لیے آزاد لوٹ کھسوٹ اور اجارہ داری ہے۔

آزاد تجارت کے نتیجے میں حکومتیں اپنی ریاست پر سے اختیار کھو بیٹھتی ہیں۔ جو حکومت اپنے کسانوں، مزدوروں، کارخانہ داروں اور تاجروں کو کسی قسم کا فائدہ نہ دے سکے اور جو اپنے ہی ملک میں بیرونی ممالک کی تجارت پر پابندیاں نہ لگا سکے یعنی جس کا اندرونی اور بیرونی اقتدارِ اعلیٰ ختم ہو جائے، کیا وہ آزاد ریاست کہلانے کی

حقدار ہو سکتی ہے۔ اب تو یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی اور اس کا مشاہدہ روز مرہ زندگی میں بھی ہو رہا ہے۔ پاکستان میں ۲۰۰۸ء کا اقتصادی بحران اس کی واضح مثال ہے۔

- **دوسرا مرحلہ: سٹیبلائیزیشن (استحکامِ معیشت)**

آزادئ تجارت کا قانون نافذ ہوتے ہی ملکی معیشت کو یکدم دھچکا لگتا ہے کیونکہ ملک کی منافع بخش صنعت، تجارت اور زراعت کو اس کے حجم سے کئی گنا بڑی بے رحم و کرم دیو ہیکل عالمی صنعت و تجارت کے مقابلے میں میدان میں اتارنے سے ملک اندرونی طور پر شدید بحران کا شکار ہوتا ہے۔ ایسے میں یہی عالمی ادارے جو ملکی معیشت تباہ کرنے کے موجب بنے تھے، اب ہمدرد کی صورت میں قرضہ فراہم کرتے ہیں تاکہ ان کے بقول معیشت کو سہارا مل سکے۔ یہاں بھی وہی خوشنما شعار کا چکر ہے۔ کہنے کو استحکام ہے لیکن یہ بھاری سود اور طویل المیعاد قرضوں کی شکل میں زنجیرِ غلامی کو مزید کسنا ہے۔

- **تیسرا مرحلہ: پرائیوٹائیزیشن (نجکاری)**

جب استحکامِ معیشت کے عمل سے ملک کا پہیہ بمشکل چلنے لگتا ہے تو ملکی اداروں کو بیچنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ نجکاری کا مقصد قومی صنعتی، زرعی اور تجارتی اداروں کو حصوں میں تقسیم کرکے اقوامِ عالم کے سامنے فروخت کے لیے پیش کرنا ہے۔ بہانہ یہ بنایا جاتا ہے کہ اول تو یہ ادارے حکومتی تحویل میں رہنے کی وجہ سے ہی مالیاتی دھاندلی اور پیشہ ورانہ غفلت کا شکار ہوتے ہیں جس سے یہ منافع بخش ہونے کی بجائے الٹا حکومت پر بوجھ بن جاتے ہیں جبکہ حکومت کے تو خود دوسرے اتنے مسائل ہیں کہ ان اداروں کی طرف توجہ نہیں دے پاتی اور نہ ہی یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ دوم یہ کہ سرکاری سرپرستی کے سبب نجی ادارے بہتر کارکردگی کے باوجود عالمی معیشت کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ سوم یہ کہ ان اداروں کے کچھ حصص کو عالمی اداروں کو فروخت کرنے سے ملک میں زرِ مبادلہ آئے گا اور روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے۔ لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ عالمی کمپنیاں حکومتوں کو رشوتیں دلا کر غیر منافع بخش اداروں کے بجائے منافع بخش اداروں کی نجکاری کرواتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ حکومتیں زیادہ حصص عالمی کمپنیوں کے لیے مختص کرواتی ہیں اور وہ بھی ان کی اصل قیمت سے نہایت ارزاں نرخوں پر۔ اس طرح نجی تجارتی اور صنعتی اداروں کے بعد کامیاب قومی منافع بخش ادارے بھی عالمی کمپنیوں کی تحویل میں چلے جاتے ہیں اور ملک پوری طرح غلام بن کر رہ جاتا ہے۔

بریٹن وڈز کانفرس کے عالمی ادارے

لبرلائیزیشن (آزادئ تجارت)، سٹیبلائیزیشن (استحکامِ معیشت) اور پرائیوٹائیزیشن (نجکاری) کے ایجنڈے کو پورا کرنے کے لیے 'بریٹن وڈز کانفرنس' نے تین ادارے قائم کیے۔ پہلا ادارہ 'گیٹ' کے نام سے قائم ہوا جو ۱۹۹۵ء میں 'ڈبلیوٹی او' میں تبدیل ہوگیا۔ اس کا کام دنیا کی تجارت کو آزاد کرانا ہے یعنی ٹیرف اور سبسڈی کا خاتمہ کرانا اور لائیسنس، معیار بندی جیسے کڑے قوانین بنانا جن کے ذریعے ...ان کی اصطلاح میں... تجارت آزاد رہے۔

دوسرا ادارہ 'بین الاقوامی مالیاتی فنڈ' (IMF)[53] ہے۔ اس کا مقصد عالمی معیشت اور کرنسیوں کے شرحِ مبادلہ کو کنٹرول کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ غریب ممالک کی منڈیوں کو آزاد کرانے کے لیے سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ جو ممالک کساد بازاری کا شکار ہوں یا جنھیں صنعتی ترقی یا قومی ضروریات کے لیے سرمائے کی ضرورت ہو، انھیں یہ ادارہ مختلف شرائط پر قرضے کی صورت میں سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ جو ممالک بھی اس کے رکن بنتے ہیں، ان پر دو چیزیں لازم ہوتی ہیں؛ پہلی یہ کہ انھیں اپنے ذخائر میں سے ۲۵ فیصد سونا اور ۷۵ فیصد قومی کرنسی اس ادارے کے یہاں جمع کروانا ہوتی ہے اور دوسرا ان ممالک کو اپنی منڈیاں آزاد کرنا ہوتی ہیں۔

تیسرا ادارہ 'ورلڈ بینک' (World Bank) ہے۔ اس کا مقصد بھی غریب ممالک کو معیشت کے استحکام اور نجکاری کے لیے قرضے کی فراہمی ہے۔

اس طرح بریٹن وڈز کے یہ تینوں ادارے بین الاقوامی اور ملکی سطح پر معیشت کے پورے نظام کو کنٹرول کرتے ہیں۔ آج پوری دنیا کی معیشت ان تینوں اداروں کی بدولت مغرب (صلیبی صہیونی اتحاد) کے قبضے میں جاچکی ہے۔

سرد جنگ میں امریکہ کے عسکری نظریات اور امریکی فوج کی تنظیمِ نو

ہم اوپر عرض کرچکے ہیں کہ سرد جنگ میں امریکہ کی حکمتِ عملی اشتراکیت کے پھیلاؤ کو روکنا اور اسے محدود کرنا تھا۔ ایک طرف اس نے اپنے کیمپ میں شامل ممالک کو اس قابل بنانے کے لیے معاشی اور عسکری امداد فراہم کی اور دوسری طرف اس نے اپنی عسکری قوت کو مختلف طریقوں سے مکمل طور پر منظم کرنا شروع کیا۔ دنیا کی تاریخ میں اس سے قبل اس انداز سے کوئی فوج بھی منظم نہیں ہوئی تھی۔

---

[53] International Monetary Fund (IMF)

امریکی فوج کو تین مقاصد کے لیے تیار کیا گیا:

- پہلا مقصد یہ تھا کہ کوئی دشمن امریکہ کے خلاف کارروائی کا ارادہ بھی کرے تو اسے اس قابل نہ چھوڑا جائے کہ وہ اپنے ارادے کی تکمیل کرے۔ اسے 'پیش بندی کا نظریہ' کہا جاتا ہے۔
- دوسرا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی دشمن امریکہ کے خلاف جارحانہ کارروائی کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو اس دشمن کو یہ باور کرادیا جائے کہ اسے فائدے سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا، اسے 'رعب کا نظریہ' کہتے ہیں۔
- تیسرا مقصد یہ تھا کہ اگر ان دونوں کارروائیوں کے باوجود دشمن جنگ کے لیے تیار ہو تو اس کے ساتھ محدود پیمانے پر روایتی جنگ کی جائے۔ اسے 'محدود جنگ کا نظریہ' کہتے ہیں۔

ان تینوں مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے امریکی فوج کی تنظیم کی گئی ہے۔ امریکہ کی اس فوج کی تنظیم میں تین اہم عسکری نظریات کا بڑا کردار ہے۔ یہ تین نظریات مندرجہ ذیل ہیں:

- 'موہان' (Alfred Thayer Mahan) کا بحری طاقت (Sea Control) کا نظریہ
- 'لڈل ہارٹ' (Henry Liddell Hart) کا بالواسطہ رسائی (Indirect Approach) کا نظریہ
- 'اینڈرے بیوفری' (Andre Beaufre) کا ایٹمی زمانے میں بالواسطہ حکمتِ عملی (Indirect Strategy) کا نظریہ

موہان کا نظریہ

امریکی بحریہ کے وائس ایڈمرل موہان Mahan نے ریٹائر ہونے کے بعد 1890ء میں اپنی مشہورِ زمانہ کتاب 'تاریخِ انسانی پر سمندری قوت کے اثرات' (The Influence of sea power upon History) لکھی جس کی بدولت وہ ایک تاریخ دان کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ اس کتاب نے امریکی حکومت کی حکمتِ عملی انقلابی حد تک بدل کر رکھ دی، یہاں تک کہ اس وقت کے امریکی صدر 'روزویلٹ' (Theodore Roosevelt) نے اپنی تمام تر توجہ بحری طاقت کے حصول پر مرکوز کر دی۔

اپنی کتاب Race to the Swift میں جدید دور کا عسکری ماہر 'رچرڈ سمکن' لکھتا ہے کہ ''جتنے بھی عسکری نظریات آج تک پیش ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی کوئی نہ کوئی حد ہے، لیکن موہان کے نظریے کی کوئی حد نہیں''۔

معیشت و عسکریت کا باہمی ربط

موہان اپنی کتاب میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ نہ تو معیشت کی مضبوطی عسکری قوت کے بغیر ممکن ہے اور نہ عسکری قوت معیشت کے بغیر حاصل کی جا سکتی ہے۔ گویا عسکری قوت میں اضافے اور معیشت کی مضبوطی کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ اس بات کو وہ تاریخی حوالوں ____ خصوصاً انگلستان اور یورپ کی تاریخ سے ____ ثابت کرتا ہے۔

سمندروں پر قبضے (Sea Control) کا نظریہ

مزید وہ کہتا ہے کہ عالمی طاقت بننے کے لیے سمندر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، لٰہذا سمندر پر سیاسی اور عسکری غلبہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ یعنی عالمی طاقت بننے کے لیے سمندروں بالخصوص بحری تجارتی گزرگاہوں پر مکمل قبضہ (sea control) حاصل کرنا ضروری ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ کی مدد سے موہان یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیا کی اہم ترین بندر گاہیں کمزور ممالک میں موجود ہیں، جبکہ وہاں سے دنیا بھر کا مالِ تجارت گزرتا ہے۔ ان پر قبضہ کرنے سے خود بخود دنیا کی تجارت امریکہ کے ہاتھوں میں آجائے گی۔ لٰہذا امریکہ کو چاہیے کہ کسی نہ کسی طرح ان بندر گاہوں پر سیاسی برتری حاصل کرے اور جہاں سیاسی برتری حاصل کرنا ممکن نہ ہو، وہاں عسکری قبضہ کرے۔ ان اہم بندرگاہوں کو اس نے 'تزویراتی مراکز' (Strategic Points)[54] کا نام دیا ہے۔ موہان کے مطابق ایسے مقامات کا انتخاب کرنا چاہیے جو بڑے سمندروں کے بجائے چھوٹے سمندروں پر واقع ہوں، جن کے قریب تجارتی گزرگاہیں بھی ہوں اور وہ جغرافیائی اعتبار سے ایسے 'تزویراتی خطوط' تشکیل دیتے ہوں جہاں سے دوسروں پر حملہ بھی کیا جاسکے اور دوسروں کے مقابلے میں اپنا دفاع بھی کیا جاسکے۔ اس نے امریکی حکومت کو مشورہ دیا کہ اس حکمتِ عملی کو امریکہ سے متصل

[54] یہاں 'تزویراتی مراکز' (Strategic Points) سے مقصود وہ مقامات ہیں جو جنگی حکمتِ عملی کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوں۔

سمندروں میں فی الفور نافذ کیا جائے۔ آج امریکی بحری افواج کے تنظیمی ڈھانچے اور دنیا کے اہم بحری مقامات پر ان کی موجودگی کو دیکھنے سے امریکی سیاست پر اس نظریے کے اثرات خود بخود ظاہر ہو جاتے ہیں۔

لڈل ہارٹ کا بالواسطہ رسائی کا نظریہ

پہلی جنگِ عظیم کے دوران عسکری ٹیکنالوجی میں اچانک ترقی ہوئی جس کے سبب نہایت مہلک و مؤثر ہتھیار وجود میں آ گئے۔ مگر اس کی مناسبت سے فوجوں کی تربیت نہ کی جا سکی، جس کا نتیجہ Attrition Warfare یا **'تباہی کے طریقۂ جنگ'** کی صورت میں نکلا۔ یہ وہ طریقۂ جنگ ہے جس میں حملے کا بنیادی مقصد دشمن کے حجم کو اتنا نقصان پہنچانا ہوتا ہے کہ اس کی مادی طاقت تباہ ہو جائے اور وہ جنگ لڑنے کی سکت کھو بیٹھے۔ یہاں 'حجم' سے مراد تمام افرادی، صنعتی اور عسکری قوت اور تمام تر وسائل واسباب ہیں۔ گویا دشمن کی فوج، فوجی ساز و سامان، شہری آبادی، کارخانے، ڈیم سبھی کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔[55] اس طریقۂ جنگ میں دونوں اطراف کو بے تحاشہ تباہی اور نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور فتح اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب دشمن اپنے امن و سکون اور اپنی بقاء کے بدلے شکست برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس طریقۂ جنگ کو عسکری اصطلاح میں بعض اوقات 'بے مقصد ذبح خانہ' کہا جاتا ہے، کیونکہ بہت سے ایسے عسکری اہداف جنہیں بہت کم تباہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے، یوں بہت زیادہ تباہی کے بعد ہی حاصل ہو پاتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں عملاً یہی 'ذبح خانہ' دیکھنے کو ملا، جب یورپ کی مختلف کافر اقوام نے ایک دوسرے پر دیوانہ وار حملے کر کے یورپ، افریقہ اور ایشیا کے بہت سے علاقوں کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا اور ہولناک قتل و غارت کی۔

اس جنگ کے بھیانک نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے بہت سے عسکری ماہرین نے نئے نظریات پیش کیے جنھیں **'چالبازی کا طریقۂ جنگ'** (Maneuver Warfare) کہا گیا۔ ان میں سب سے

---

[55] ظاہر ہے کہ یہاں ہم کفار کے جنگی نظریات اور طریقوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، تاکہ ان کو سمجھ کر ان کا بہتر طور پر مقابلہ کر سکیں۔ البتہ ہم خود جنگ کے لیے جو بھی حکمتِ عملی اختیار کریں گے اس کے لیے ہمیں شریعت سے رجوع لازم ہو گا اور جائز شرعی اہداف اور ناجائز اہداف میں فرق کرنا ہو گا۔

زیادہ مقبولیت مشہور عسکری ماہر لڈل ہارٹ کے **'بالواسطہ رسائی کے نظریے'** (Indirect Approach) کو حاصل ہوئی۔

نظریے کی تفصیل

لڈل ہارٹ کا نظریہ یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ آمنے سامنے براہِ راست مقابلے کی بجائے اس کے کمزور ترین عضو پر اپنے مضبوط ترین عضو سے حملہ کیا جائے تاکہ دشمن کا جسم اپنی جگہ سے ہل جائے (dislocateہوجائے) اور نتیجتاً اس کے لڑنے کا ارادہ (Will to Fight) ہی سلب ہو جائے۔اس کی سادہ مثال یہ ہے کہ بیل کو سینگوں سے پکڑنے کی بجائے شیر اپنے مضبوط جبڑے سے اس کی گردن دبوچ لیتا ہے جس سے بیل لڑکھڑا جاتا ہے اور پھر نہ وہ اپنے سینگ استعمال کرنے کی حالت میں ہوتا ہے اور نہ ہی اپنے پاؤں۔اس طرح دشمن پر براہِ راست (Direct) سامنے آکر حملہ کرنے کی بجائے بالواسطہ (Indirectly) یا مڑ کر حملہ کیاجاتا ہے۔ یوں بہت کم وقت اور کم قوت سے جنگ جیتی جاسکتی ہے۔

دشمن کو لڑکھڑانے (Dislocation) کے طریقے

لڈل ہارٹ اپنے نظریے میں کہتا ہے کہ دشمن کے ارادۂ جنگ کو ختم کرنے کے لیے مادی اور نفسیاتی محاذ،دونوں پر لڑنے کی ضرورت ہے، جو کہ چار طریقوں سے ممکن ہے:

- محاذِ جنگ کو یکدم تبدیل کرنا۔
- دشمن کی قوت کو منتشر کردینا۔
- اس کی رسد کو کاٹ دینا۔
- اس کی واپسی کے راستوں کو بند کرنا۔

یہ چاروں، حملے کے بالواسطہ طریقے ہیں جن سے مقصود دشمن پر سیدھا حملہ کرکے اسے تباہ کرنے کے بجائے،اس کے آزادانہ کام کرنے کی صلاحیت کو محدود کرنا (Restriction of Freedom of Action)ہے،جبکہ اپنے سامنے تمام دروازے کھلے رکھنا ہے۔اس طرح دشمن کی قیادت کوشدید نفسیاتی دھچکا لگتا ہے،اس کا ذہن مفلوج ہو جاتا ہے اور نتیجتاً بہت سی مادی قوت رکھنے کے باوجود بھی دشمن لڑکھڑا جاتا ہے۔یوں بڑے سے بڑے دشمن پر بآسانی قابو پایا جاسکتا ہے۔

یہ نظریہ مغرب میں بہت مقبول ہوا اور دوسری جنگِ عظیم میں اسی کو استعمال کیا گیا۔مگر یہ نظریہ خالصتاً عسکری نظریہ تھا جس کے اثرات بھی صرف عسکری میدان تک محدود رہے۔

اینڈرے بیوفری کا ایٹمی زمانے میں بالواسطہ تزویرات کا نظریہ

اینڈرے بیوفری (Andre Beaufre) ایک فرانسیسی جرنیل تھا جس نے نیٹو (NATO) کی تنظیمِ نو میں اہم کردار ادا کیا تھا۔یہی وہ شخص تھا جس نے 1955ء میں الجزائر کی جنگ اور 1956ء میں نہرسویز کے تنازعے میں اپنی فوج کی قیادت کی تھی۔1963ء میں اس نے ''ایٹمی زمانے میں بالواسطہ تزویرات (Indirect Strategy) کا نظریہ'' پیش کیا جسے اس کے پیش رو اور عسکری ماہر لڈل ہارٹ نے دورِ جدید کا بہترین نظریہ قرار دیا۔بیوفری کے مطابق اس کا نظریہ لڈل ہارٹ اور موہان کے نظریات کا تسلسل اور ان دونوں کا وسیع تر تصور ہے۔اس نے دونوں نظریات کی خوبیوں کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں محض عسکری میدان تک محدود رکھنے کی بجائے قوت کے تمام سرچشموں پر یکساں طور پر لاگو کیا۔

بیوفری اور لڈل ہارٹ کے نظریات کے مابین فرق

بیوفری اپنے اس نظریے اور لڈل ہارٹ کے بالواسطہ رسائی کے نظریے کا فرق بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لڈل ہارٹ کا نظریہ صرف عسکری نوعیت کا حامل، ایک خاص خطے میں مقید اور چالبازی کے طریقۂ جنگ(Maneuver warfare) تک محدود تھا۔بیوفری نے لڈل ہارٹ کے نظریے سے 'دشمن کی آزادنہ حرکت کو محدود کرنے' کا تصور لیا اوراسے وسعت دیتے ہوئے موہان کے 'سمندروں پر قبضے کے نظریے' کے ساتھ ملا دیا، جس سے پورے کرۂ ارض پر محیط ایک زیادہ جامع نظریہ وجود میں آیا۔اس نے یہ بھی واضح کیا کہ اگر اس نظریے پر عمل کیا جائے تو ایٹمی جنگ کے امکانات کو کافی حد تک محدود کیا جاسکتا ہے۔

بیوفری نے اس نظریے کو 'بالواسطہ' اس لیے کہاہے کہ اس میں فوجوں کی آپس میں لڑائی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق دشمن کے گرد تین حصار قائم کیے جاتے ہیں۔ان میں سے دو حصار دشمن کے علاقے سے باہر ہوتے ہیں، جبکہ تیسرا دشمن کے علاقے

کے اندر ہوتا ہے اور وہ بھی صرف ضرورت کے وقت قائم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اصلاً دشمن کو بیرونی دو حصاروں کی مدد سے ہی شکست دی جاتی ہے۔

بیوفری کے نظریے کے اہم نکات

- بیوفری کے نظریے کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ پیش بندی (pre-emptive) طریقۂ جنگ اپنانے کا داعی ہے۔ یعنی وہ خطرہ کھڑا ہونے سے قبل ہی اس کا سدِ باب کرنے کی راہ تجویز کرتا ہے۔
- بیوفری کے مطابق اگر دیگر ممالک کے گرد حصار قائم کر کے ان کی کام کرنے کی صلاحیت کو محدود کر دیا جائے تو دنیا میں بڑی قوتوں کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔
- دوسروں کی کام کی صلاحیت کو محدود کرنے سے بڑی طاقتیں محدود پیمانے کی مادی قوت کو محدود جغرافیائی خطے میں استعمال کرتے ہوئے اپنے وسیع اہداف حاصل کر سکیں گی۔

بیوفری کے نظریے کی تطبیق

بیوفری اپنے نظریے کی تطبیق بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے جس کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ سب سے پہلے دنیا میں عسکری رعب قائم کرنے والی ایک قوت ہونی چاہیے جو ہر وقت دشمن پر نفسیاتی دباؤ ڈالتی رہے۔ یہ قوت ایٹمی بھی ہونی چاہیے اور غیر ایٹمی بھی۔ اسے وہ 'عالمی عسکری رعب قائم کرنے کی قوت' (Millitary Deterrent Force) کہتا ہے۔ یعنی دشمن کو کسی بھی اقدام سے روکے رکھنا۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب دشمن کو یہ دکھائی دے کہ اگر اس نے حالت امن سے نکلتے ہوئے کوئی بھی اقدام کیا تو اس کے جواب میں اسے کئی گنا زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس عسکری قوت میں جوہری اور روایتی دونوں قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں۔ اور جدید عالمی نظام میں امریکہ نے یہ طاقت اپنی افواج کے ساتھ ساتھ نیٹو اور اقوام متحدہ کی افواج کو ملا کر تشکیل دی ہے۔ اس حصار کا دائرہ عالمی ہے۔

اس قوت کا ہدف دشمن کے کام کرنے کی صلاحیت کو اس طرح محدود کرنا ہے (Restriction of Freedom of Action) جیسے 'بونوں' نے 'گولیور' کو باندھ دیا تھا۔ بونوں اور گولیور کی حقیقت مغربی ثقافت میں بچوں کی ایک خیالی کہانی ہے جس میں گلیور نامی شخص ایک جزیرے میں جاتا ہے جہاں کے باشندے اس کے انگوٹھے سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ گلیور جب تھک ہار کر سو جاتا ہے تو یہ انگوٹھے بونے باریک رسیوں کے ذریعے اس کے جسم کے تمام حصوں کو گردا گرد زمین سے ٹھونک دیتے ہیں۔ جب وہ جاگتا ہے تو

اپنے آپ کو حرکت کرنے سے قاصر پاتا ہے۔ اسی طرح یہ قوت دشمن کے گرد ایک بیرونی حصار بن جاتی ہے۔ یہ حصار زیادہ تر موہان کے سمندری کنڑول کے ذریعے بنتا ہے۔

۲۔ اس دائرہ کے اندر ایک اور غیر عسکری حصار قائم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ حصار غیر عسکری ہے مگر اس کا مقصد عسکری ہوتا ہے۔ اس میں سیاسی، اقتصادی اور سماجی ذرائع کو دشمن کا ارداۂ جنگ ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ محاذ ہر قوم کے لیے مختلف ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس حصار کو قائم کرنے میں سرکاری و نیم سرکاری ادارے، غیر سرکاری ادارے NGO's، پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنیاں، UNO اور خفیہ ادارے وغیرہ مدد دیتے ہیں۔ اس حصار کا دائرہ علاقائی ہوتا ہے۔

بیوفری کہتا ہے کہ اگر رعب رکھنے، بیرونی عسکری حصار قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اندرونی حصار میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر میڈیا کے ذریعے دشمن کے نظریات کو باطل اور غلط تسلیم کروالیا جائے، اس پر اقتصادی پابندیاں لگادی جائیں تو دشمن کے لڑنے کا عزم (Will to Fight) اس حد تک کمزور پڑ جائے گا کہ وہ لڑنے کا سوچ بھی نہ سکے گا۔ یہ عمل رعب قائم کرنے والی طاقت کے دائرے اور سیاسی محاذ کے حصاروں کے درمیان یعنی تنازعے کے جغرافیائی دائرے کے باہر ہونا چاہیے۔

۳۔ اس کے باوجود اگر دشمن جنگ چھیڑتا ہے تو ان سابقہ دو حصاروں کی بدولت اس جنگ کا دائرہ مخصوص جغرافیائی حصے تک ہی محدود رہے گا اور وہاں بھی محدود پیمانے پر جنگ (Limited War) لڑی جائے گی۔ تیسرا اندرونی حصار ہے جس کا دائرہ دشمن کا ملک یا ملک کا کوئی حصہ ہوتا ہے۔ یہ جنگ ''چالبازی'' طریقۂ جنگ کے تحت لڑی جاتی ہے جو کہ مادی قوت، نفسیاتی قوت اور وقت پر منحصر ہے۔ اگر مادی قوت میسر ہے تو نفسیاتی دباؤ کی ضرورت نہیں اور دشمن کو کم سے کم وقت میں مادی قوت سے ہی شکست دی جاسکتی ہے۔ اور اگر مادی قوت کم ہے تو دونوں یعنی مادی اور نفسیاتی قوتوں کو برابر استعمال کر کے دشمن کو شکست دینی چاہیے۔ چالبازی کے لیے اس نے دو طریقے تجویز کیے ہیں۔

ا۔ پہلا طریقہ Piecemeal maneuver کہلاتا ہے یعنی مرحلہ وار چال کے ذریعہ۔ اس میں چالبازی طریقۂ جنگ کی تمام چالوں کو حسب ضرورت استعمال کر کے دشمن کو بتدریج شکست دی جاتی ہے۔ ٹکڑوں میں فتح حاصل کرنے پر بیوفری اس لیے زور دیتا ہے کہ جنگ اپنے مخصوص جغرافیائی علاقے سے نکل کر کہیں بین الاقوامی نہ بن جائے۔

۲۔قوت کم ہونے کی صورت میں وہ کہتا ہے کہ ماؤزے تنگ کے گوریلا جنگ کے نظریہ کو اپنانا چاہیے جس میں مقامی ہمنوا گوریلا قوت کو تنازعے کے گرد کھڑا کرنا چاہیے۔ساتھ ساتھ ہر سطح پر نفسیاتی اور اخلاقی حربوں کا استعمال جاری رہنا چاہیے۔

تین حصار

بیوفری کے نظریے پر عمل کرتے ہوئے دشمن کے گرد تین حصار بن جاتے ہیں اور اس کے آزادانہ کام کرنے کی صلاحیت اتنی محدود ہوجاتی ہے کہ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بیوفری کے نزدیک اصل جنگ بیرونی دو حصاروں میں لڑی جاتی ہے، جبکہ تیسرے دائرے کو صرف بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت ہی استعمال کیا جاناچاہیے۔

بیوفری کے مطابق اگرمغربی قوتیں درج ذیل تین عوامل کو قائم رکھیں تو بالواسطہ حکمتِ عملی کا توڑ کرنا ناممکن بات ہے:

- پہلا یہ کہ مغربی تہذیب کی فوقیت اور برتری کا اتنا پرچار کیا جائے کہ تمام دنیا والے یہ یقین کرلیں کہ مغربی نظام کے بغیر یہ دنیا چل ہی نہیں سکتی۔پھر فوقیت اور برتری کے اس تاثر کو اگلی نسلوں میں منتقل کرنے کا بھی خاص اہتمام کیا جائے۔
- دوسرا یہ کہ دشمن کی طرف سے آنے والے تمام ممکنہ خطرات کو بتدریج نشانہ بنا کر ختم کیا جائے۔
- تیسرا یہ کہ بیرونی رعب قائم رکھنے والی قوت کو مل جل کر انتہائی مضبوط بنایا جائے۔ یعنی امریکی افواج کے ساتھ نیٹو اور اقوامِ متحدہ کی افواج بھی مل کر کام کریں، اور ان کے علاوہ بھی ایک مشترکہ عالمی تنظیم بنائی جائے۔

اس طرح اس حکمتِ عملی کو شکست دینا بیوفری کے نزدیک ناممکنات میں سے ہوجاتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس حکمتِ عملی کے ذریعے تمام دنیا پر اور بالخصوص مسلمانوں پر ____ جن کی مثال وہ جگہ جگہ دیتا ہے____ اس قدر رعب طاری ہو جائے گا کہ کوئی قابلِ ذکر قوت مغرب کے مقابلے میں سر نہیں اٹھا سکے گی،نہ ہی اس بارے میں سوچنے کی جرأت کرے گی۔

خلاصہ کلام: مغرب اور امریکہ کا طریقہ ء جنگ

موہان نے ۱۸۹۰ء میں جب اپنا سمندر پر قبضے کا نظریہ پیش کیا تھا، اس وقت امریکہ سپر طاقت نہیں تھا بلکہ ایک معاشی طاقت کے طور پر ابھر رہا تھا اور اسے اپنی تجارت کو مزید فروغ دینے کے لیے دنیا میں بندر گاہوں اور سمندری قبضے کی ضرورت تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بحیرۂ روم کا راستہ سلطنتِ عثمانیہ کے ہاتھوں سے نکل کر برطانیہ کے قبضے میں آیا تھا۔ دوسری طرف لڈل ہارٹ نے اپنا نظریہ اس وقت پیش کیا جب صنعتی ترقی کے باعث فوجی جدید ہتھیاروں کو استعمال کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ بیوفری کا نظریہ اس وقت آیا جب مغرب اور امریکہ روس کے خلاف سرد جنگ لڑ رہے تھے۔ موہان سے بیوفری تک ساٹھ سال کے عرصے میں امریکہ ان نظریات پر عمل نہ کر سکا تھا، مگر اب سرد جنگ کے پینتالیس سالوں میں امریکہ نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان تینوں نظریات کا مکمل استعمال کیا۔

اگر ہم اوپر دیے گئے تینوں نظریات کا بغور جائزہ لیں تو ہمیں ان نظریات میں چند اصولی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ یہ تینوں نظریات دشمن کی جنگ کرنے کی صلاحیت ختم کرنے کے لیے بالواسطہ اقدام اور محدود سے محدود جنگ کے ذریعے اپنا ہدف حاصل کرنے پر زور دیتے ہیں۔ تینوں نظریات اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ دشمن کے جنگ کرنے کے ارادے کو ختم کرنے کا طریقہ اس کے کام کرنے کی آزادی کی صلاحیت کو کم کرنا ہے۔ موہان اس کے لیے سمندر پر قبضہ کرنے پر زور دیتا ہے اور دشمن کے گرد ایک ایسا حصار بنانے پر زور دیتا ہے جو پوری دنیا میں کسی بھی دشمن کو امریکہ یا مغرب کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے سے روک دے۔ لڈل ہارٹ نے بلاواسطہ جنگ کی بجائے بالواسطہ رسائی کا طریقہ اپنانے کو کہا۔ بیوفری نے نہ صرف پہلے دو نظریات کو اکٹھا کیا بلکہ اس میں سیاسی معاشی نظام کو بھی جوڑ کر معیشت کو ایک عسکری آلہ بنا دیا۔ ساتھ ہی اس نے دنیا کے گرد تین حصار بنانے کا نظریہ پیش کیا۔ یہ تینوں نظریات سرد جنگ میں امریکہ کی فوج کی تنظیمِ نو اور روسی حکمتِ عملی کی روک تھام میں بہت مددگار ثابت ہوئے۔ اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ ان نظریات کے مطابق امریکہ نے اپنی فوج کو کس طرح منظم کیا۔

امریکی فوج کی تنظیم

امریکہ کی فوج کو اس انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ اس میں ان تین سطحوں کی جنگ کرنے کی صلاحیت موجود ہو جو موہان، لڈل ہارٹ اور بیوفری کے نظریات بتاتے ہیں، یعنی پیش بندی، رعب قائم کرنا اور دشمن کو لڑکھڑا دینے سے دشمن کی جنگ کرنے کی صلاحیت ختم کر کے اس کا ارادۂ جنگ ختم کر دینا۔ امریکی فوج کا ڈھانچہ

دو حصوں میں منظم کیا گیا ہے؛ ایک 'روایتی فوج' اور دوسرا 'متحدہ کمان' (Unified Combatant Command)۔

امریکہ کی روایتی فوج

امریکہ کی روایتی فوج کو دیگر روایتی افواج کی طرح ترتیب دیا گیا ہے۔ اس ترتیب کا فائدہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی فوجی امریکی فوج میں بھرتی ہوتا ہے تو وہ روایتی فوج کے کسی بھی شعبے میں بھرتی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک سپاہی فضائیہ میں بھرتی ہوا ہے تو وہ فضائیہ کا ہی رکن رہے گا، اس کی تنخواہ فضائیہ ہی ادا کرے گی مگر ڈیوٹی وہ کسی بھی متحدہ کمان کے تحت دے سکتا ہے۔

روایتی امریکی فوج کو پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؛ ہر حصے کے اپنے اپنے مقاصد ہیں جنھیں ہم یہا ں اختصار کے ساتھ بیان کر رہے ہیں:

1. امریکی بری فوج
2. امریکی بحری فوج
3. امریکی فضائیہ
4. امریکی میرین فوج (US Marine)
5. امریکی کوسٹ گارڈ(US Coast Guard)

امریکی بری فوج

امریکی بری فوج کے چار مقاصد ہیں:

1. اندرون ملک امریکہ کا دفاع کرنا۔
2. پوری دنیا میں امریکہ کا غیر ایٹمی یا روایتی فوجی رعب قائم کرنا۔
3. دوسرے ملکوں پر عائد امریکی اور اقوام متحدہ کی پابندیوں پر عمل درآمد کرانا۔
4. ضرورت پڑنے پر میرین فوج کے ساتھ کسی ملک پر حملہ کرنا۔

بری فوج کے نو سروس ہیڈ کوارٹر ہیں جن میں سے تین آپریشنل (Operational)، پانچ تھیٹر (Theatre) اور ایک موڈیولر (Modular) ہیڈ کوارٹر کہلاتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ چار کور ہیڈ کوارٹر ہیں۔ اس فوج کی تعداد گیارہ لاکھ بارہ ہزار سات سو (۱۱۱۲۷۰۰) ہے، جس میں سے دو لاکھ پانچ ہزار

(۲۰۵۰۰۰) محفوظ (reserve) فوج ہے جبکہ باقی تعداد مستعد فوج ہے[56]۔ امریکی بری فوج دو حصوں میں تقسیم ہے؛ ایک امریکہ میں مقیم فوج جو امریکہ کے دفاع کے لیے ہے اور دوسرا حصہ عالمی روایتی رعب قائم رکھنے والی فوج ہے جس کے مراکز جرمنی، کوریا، قطر اور افریقہ میں ہیں۔

امریکی بحری فوج

امریکی بحریہ کے درج ذیل مقاصد ہیں:

1. دنیا میں ایٹمی رعب قائم کرنا
2. دنیا میں روایتی رعب قائم کرنا
3. امریکی میرین فوج کو خشکی پر اتارنا
4. روایتی بحری جنگ کرنا۔

امریکی بحریہ کے سپاہیوں کی کل تعداد چار لاکھ تینتیس ہزار پانچ سو (۴۳۳۵۰۰) ہے[57]۔ امریکی بحریہ چھ بحری بیڑوں پر مشتمل ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

1. امریکہ کا دوسرا بحری بیڑا[58] شمالی بحر اوقیانوس میں،
2. تیسرا بحری بیڑا مشرقی بحر الکاہل میں،
3. چوتھا بحری بیڑا جنوبی بحرِ اوقیانوس میں،
4. پانچواں بحری بیڑا بحر ہند، خلیجِ فارس اور بحیرۂ احمر میں،
5. چھٹا بحری بیڑا بحیرۂ روم میں، اور
6. ساتواں بحری بیڑا مغربی بحر الکاہل میں۔

ان امریکی بحری بیڑوں کی تعیناتی سے خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح امریکہ نے پوری دنیا کو گھیر رکھا ہے۔

---

[56] یہ اعداد و شمار امریکی بری فوج کے ۲۰۰۹ء میں جاری کردہ کتابچے سے اخذ کیے گئے ہیں۔

[57] یہ اعداد و شمار امریکی بحریہ کی سرکاری ویب سائٹ www.navy.mil پر ۱۲ جنوری ۲۰۱۱ء کو نشر کیے گئے تھے۔

[58] یہاں عدد شماری سے اشتباہ نہ ہو کیونکہ امریکہ کا پہلا بحری بیڑا جنگ عظیم دوم کے بعد مرمت کے لیے ہٹا لیا گیا تھا اور مرمت کے بعد اسے تین کا عدد دے دیا گیا۔ اب وہ امریکہ کی بحریہ کا تیسرا بحری بیڑا ہے۔

امریکی فضائیہ

امریکی فضائیہ کے سپاہیوں کی کل تعداد پانچ لاکھ کے قریب ہے[59]۔امریکی فضائیہ کے درج ذیل مقاصد ہیں:

1. امریکہ کا فضائی دفاع کرنا
2. متحدہ کمان کے ساتھ مل کر جنگوں میں امریکی بحریہ، بری اور میرین فوج کی مدد کرنا۔
3. روایتی اور ایٹمی رعب رکھنے والی فوج کی مدد کرنا۔

امریکی فضائیہ دس حصوں میں تقسیم ہے اور ہر حصے میں نوے لڑاکا طیارے، اکتیس پٹرول بھرنے کے جہاز اور تیرہ جاسوسی کے جہاز ہوتے ہیں۔

امریکی میرین فوج

اگر امریکہ کی پیش بینی یا رعب رکھنے یا لڑ کھڑانے کی حکمتِ عملی ناکام ہو جائے تو روایتی جنگ کے لیے امریکہ نے 'میرین فوج' کے نام سے ہر دم تیار فوج کا انتظام کر رکھا ہے جس کا کام فوراً روایتی حملہ کرنا ہے۔یہ فوج عموماً روایتی رعب قائم رکھنے والی امریکی بحریہ کے بیڑے پر موجود رہتی ہے۔یہ ایک سریع الحرکت فوج ہے جو تین ڈویژن میرین سپیشل فورس، میرین ہیلی کاپٹر فورس اور میرین محفوظ فورس پر مشتمل ہے اور اس کے کل سپاہیوں کی تعداد دو لاکھ تِرتالیس ہزار (۲۴۳۰۰۰) ہے[60]۔

امریکی کوسٹ گارڈ

یہ امریکہ کی سب سے چھوٹی فوج ہے جس کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔اس فوج کا مقصد امریکہ کے ساحلی علاقوں کی حفاظت کرنا ہے۔

امریکی فوج کی متحدہ کمان

امریکی فوج کی دوسری ترتیب مذکورہ بالا چھ روایتی فوجوں کو لڑائی میں استعمال کرنے کا نام ہے۔یہ 'متحدہ جنگی کمان' (Unified Combatant Command) کہلاتی ہے۔امریکہ کی یہ متحدہ کمان 'دس

---

[59] امریکی رسالے 'ایئرمین' (Airman Magazine) نے ۲۰۱۰ء کے اپنے خصوصی شمارے میں یہ اعداد و شمار نشر کیے تھے۔

[60] یہ اعداد و شمار امریکی وزارتِ دفاع کی طرف سے اکتوبر ۲۰۱۰ء میں جاری کردہ رپورٹ کے مطابق ہیں۔

کمانوں' پر مشتمل ہے۔ یہ کمانیں جغرافیہ اور متعین کام کی بنیاد پر ترتیب دی گئی ہیں۔ دس میں سے چھ کی بنیاد جغرفیہ ہے اور وہ یہ ہیں:

1. امریکہ کی شمالی کمان(United States Northern Command)
2. امریکہ کی جنوبی کمان(United States Southern Command)
3. امریکہ کی کمان برائے بحر الکاہل(United States Pacific Command)
4. امریکہ کی وسطی کمان(United States Central Command)
5. امریکہ کی یورپی کمان(United States European Command)[61]
6. امریکہ کی افریقی کمان(United States African Command)

جبکہ چار کمانوں کی بنیاد متعین کام ہے اور وہ یہ ہیں:

1. مشترکہ افواج کی کمان(United States Joint Forces Command)
2. خصوصی عملیات کی کمان (United States Special Operations Command)
3. حکمتِ عملی کی کمان(United States Strategic Command)
4. رسد و کمک کی کمان(United States Transportation Command)

امریکہ کی یہ متحدہ کمان ہی دراصل دنیا کے گرد وہ گھیرا ہے جو امریکہ نے بنا رکھا ہے۔ ہم اسے قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

امریکہ کی جنوبی و شمالی کمان

امریکہ کی داخلی کمان دو حصوں پر مشتمل ہے؛ شمالی کمان اور جنوبی کمان۔ شمالی کمان کا ہیڈکوارٹر امریکی ریاست 'کولیراڈو' (Colorado) میں ہے۔ یہ کمان ۲۰۰۲ء میں منظم کی گئی۔ اس کمان کا مقصد امریکہ کی شمالی ریاستوں، کینیڈا اور اس کے آس پاس کے سمندر کی نو سو کلو میٹر تک حفاظت کرنا ہے۔ جنوبی کمان کا ہیڈ

[61] سرمایہ دارانہ نظام کی داخلی کمزوریوں، سود کی نحوست اور گیارہ ستمبر سے آج تک مجاہدین کی ضربوں کے نتیجے میں امریکی معیشت بیٹھنا شروع ہو گئی ہے اور اس کے اثرات اس کی فوج پر بھی پڑ رہے ہیں۔ اسی کا ایک مظہر یہ ہے کہ گزشتہ سال امریکہ نے پیسے بچانے کے لیے اپنی یورپی کمان کو ختم کر دیا ہے۔ ان شاء اللہ ایک ایک کر کے امریکہ کی باقی فوجی کمان بھی ختم ہوں گی۔

کوارٹر 'میامی، فلوریڈا' (Miami, Florida) میں ہے۔اس کا مقصد وسطی و جنوبی امریکہ اور کیریبین (Caribbean) ممالک میں رہنے والی ۳۲ قوموں کی حفاظت کرنا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ خلیجِ میکسیکو (Gulf of Mexico)، کیریبین سمندر اور بحر اوقیانوس کے کچھ حصے کی حفاظت کرنا ہے۔اس میں بری فوج، بحریہ اور فضائیہ افواج شامل ہیں۔

امریکہ کی کمان برائے بحر الکاہل

یہ امریکہ کی سب سے بڑی کمان ہے۔ اس کا مرکز 'ہوائی' (Hawaii) میں ہے۔ یہ ۱۹۴۷ء میں وجود میں آئی تھی۔اس کا مقصد ۱۹۵۲ء میں فلپائن اور نیوزی لینڈ، ۱۹۵۴ء میں جنوبی کوریا اور ۱۹۶۰ء میں جاپان کے ساتھ ہونے والے مشترکہ دفاع کے معاہدے میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کمان میں بری، بحریہ، فضائیہ اور میرین کے دستے شامل ہیں۔

امریکہ کی وسطی کمان

یہ کمان ۱۹۸۳ء میں بنائی گئی تھی۔اس کا ہیڈ کوارٹر امریکی ریاست 'فلوریڈا' کے شہر 'ٹیمپا' (Tampa) میں واقع 'میک ڈل بیس' (MacDill Air Force Base) میں ہے۔ نیز اس کا ایک اہم اڈہ قطر میں واقع ہے۔اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ یہ مشرقِ وسطیٰ، وسطی ایشیاء، جزیرۂ عرب، پاکستان، افغانستان اور مصر میں امریکہ کے مفادات کی حفاظت کرے۔ عراق اور افغانستان کی جنگ لڑنا بھی اسی کمان کی ذمہ داری ہے۔ اس میں بری فوج، بحریہ، فضائیہ، میرین اور سپیشل فورس کے دستے شامل ہیں۔

امریکہ کی یورپی کمان

اس کا ہیڈ کوارٹر 'سٹوگٹ، جرمنی' (Stuttgart, Germany) میں ہے۔ یہ کمان ۱۹۵۲ء میں بنائی گئی۔ اس کا مقصد امریکہ کے مفادات کا دفاع کرنا اور نیٹو کا حصہ بن کر روس کے خلاف سرد جنگ میں یورپ کا دفاع کرنا ہے۔ اس کمان کا علاقہ پورا یورپ، گرین لینڈ اور آئس لینڈ کے علاقے ہیں۔اس کی ذمہ داریوں میں بحیرۂ روم میں امریکی مفادات کا دفاع کرنا بھی شامل ہے۔ امریکہ کی چھٹی بحریہ اس کا حصہ ہے۔ اس میں بری فوج، بحریہ، فضائیہ، میرین اور سپیشل فورس کے دستے شامل ہیں۔

امریکہ کی افریقی کمان

یہ امریکہ کی سب سے چھوٹی کمان ہے۔ اس کا مرکز بھی 'جرمنی' سے ہی کام کر رہا ہے۔ افریقہ کے اندر اس کا مرکز 'جبوتی' (Djibouti) ہے جہاں اس کے تین ہزار سپاہی تعینات ہیں۔ اس کے مقاصد میں افریقہ میں امریکی مفادات کی حفاظت کرنا، ۵۳ افریقی قوموں کے ساتھ عسکری تعلقات رکھنا، 'دہشت گردی' کے خلاف آپریشن کرنا، منشیات کی سمگلنگ کے خلاف آپریشن کرنا اور افریقہ میں چین کے مفادات پر نظر رکھنا شامل ہے۔

مشترکہ افواج کی کمان

یہ کمان ۱۹۹۹ء میں بنی تھی۔ اس کا مقصد امریکہ کی تمام فوجوں کی مشترکہ منصوبہ بندی کرنا اور مشترکہ تربیت کرنا ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر امریکی ریاست 'ورجینیا' (Virginia) میں ہے۔

خصوصی عملیات کی کمان

امریکہ کی خصوصی عملیات کی کمان ایک کمانڈوطرز کی فوج ہے جو پوری دنیا میں کمانڈو طرز کے آپریشن کرتی ہے۔ اس میں امریکی رینجرز، ڈیلٹا فورس وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا ہیڈ کوارٹر امریکی ریاست 'فلوریڈا' میں ہے۔

حکمتِ عملی کی کمان

یہ کمان ۱۹۹۲ء میں بنائی گئی اور اس کا ہیڈ کوارٹر امریکی ریاست 'نیبراسکا' (Nebraska) میں ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کے لحاظ سے یہ انتہائی اہم کمان ہے۔ اس کی ذمہ داریوں میں عسکری نوعیت کی مصنوعی سیاروں کی دیکھ بھال، میزائیل دفاع کا انتظام، معلومات کی فراہمی، عالمی سطح پر حکمتِ عملی بنانا، عالمی رعب کو قائم رکھنا اور عام تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا مقابلہ کرنا شامل ہیں۔

رسد و کمک کی کمان

یہ کمان ۱۹۸۷ء میں بنائی گئی اور اس کا ہیڈ کوارٹر امریکی ریاست اِلّینوئے' (Illinois) میں ہے۔ اس کی بنیادی ذمہ داری باقی تمام کمانوں کو سہولیات فراہم کرنا ہے۔

امریکی فوج کا طریقہء جنگ

اگر ہم کلازوٹ، موہان، لڈل ہارٹ اور بیوفری کے نظریات کو غور سے سمجھ گئے ہیں تو ہم باآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امریکہ کی فوج دو مقاصد کے تحت جنگ کرتی ہے۔ پہلا مقصد پوری دنیا کی افواج کی آزادی کو محدود کرنا ہے۔اس کام کے لیے اس نے بین الاقوامی گھیرا بنا رکھا ہے۔اس گھیرے کو بنانے میں پورا یورپ 'نیٹو' کی شکل میں اس کے ساتھ ہے۔اس گھیرے میں قوت کی تطبیق تین طریقوں سے ہوتی ہے۔اول یہ کہ اگر دشمن کوئی حرکت کرنا چاہے تو اس کو یہ باور کرادیا جاتا ہے کہ جو حرکت وہ کرنے لگا ہے،اس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔دوم یہ کہ سیاسی گھیرا بنایا جاتا ہے اور اس سیاسی گھیرے میں عموماً وہ ممالک آتے ہیں جن کی سرحدیں امریکہ کے دشمن ملک کے ساتھ ہوتی ہیں۔ان ممالک کا کام اس دشمن کی سیاسی اور معاشی ناکہ بندی کرنا ہوتا ہے۔اس طرح زیادہ تر دشمن امریکی نظریہ کے مطابق لڑکھڑا جاتا ہے اور ہتھیار پھینک دیتا ہے۔اس کی بہترین مثال پاکستان کے اس کردار کی ہے جو امریکہ کے ساتھ مل کر امارتِ اسلامیہ افغانستان کو گرانے کے لیے اس نے ادا کیا۔ سوم یہ کہ ان معاشی اور سیاسی پابندیوں پر عمل درآمد کرایا جاتا ہے جو امریکہ نے کسی ایسے ملک پر لگا رکھی ہوں جس سے امریکہ کو یہ خوف ہو کہ وہ کسی بھی وقت امریکہ کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ یہ امریکہ کی پیش بندی کی حکمتِ عملی ہے۔

جب دشمن اوپر دیے ہوئے کسی طریقے سے ہتھیار نہ پھینکے اور لڑنے پر تیار ہو جائے تو امریکہ کی میرین فوج کو حرکت دی جاتی ہے۔خارجی طور پر رعب قائم کرنے والا گھیرا اور سیاسی گھیرا قائم رہتا ہے، جبکہ داخلی طور پر میرین فوج اس دشمن کے علاقے میں اتر کر لڑائی شروع کر دیتی ہے جو روایتی جنگ سے گوریلا جنگ تک کسی بھی قسم کی کارروائیاں کر سکتی ہے۔اس جنگ کو امریکی عسکری اصطلاح میں 'محدود جنگ' (Limited War) کہتے ہیں اور اس محاذ کو 'جنگ کا تھیٹر' (Theater of War) کہتے ہیں۔امریکہ نے سرد جنگ میں روس کے ساتھ اسی عسکری حکمتِ عملی اور اسی فوج کو استعمال کیا۔اب یہی حکمتِ عملی امریکہ و نیٹو مجاہدین کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔

سرد جنگ کا حاصل

افغانستان میں روس کی شکست کے بعد ۱۹۹۱ء میں سرد جنگ ختم ہو گئی اور امریکہ دنیا میں سب سے بڑی طاقت بن گیا، البتہ اس دوران ہونے والے واقعات نے امتِ مسلمہ کے سامنے دشمن کا اصل چہرہ ظاہر کر دیا۔

سرد جنگ دراصل دنیا کے گرد عسکری اور معاشی گھیراؤ کا نام ہے جسے قائم کرنے میں امریکہ کامیاب ہوا۔ اب صہیونی صلیبی اتحاد اپنے عالمگیر غلبے کو مکمل کرنے کے لیے آخری مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔

نیو ورلڈ آرڈر کا چوتھا دور؛

جہادِ مجاہدین اور نیو ورلڈ آرڈر (۱۹۹۱ء تا ۲۰۱۱ء)

۱۹۹۱ء میں سرد جنگ کا اختتام ہوگیا جس کے نتیجے میں سویت یونین (روس) ٹوٹ گیا۔ انقلابِ فرانس کے بعد بننے والے صلیبی صہیونی اتحاد 'اسرائیل، امریکہ اور مغرب' کے سامنے بظاہر اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور ان کی عالمگیر حکومت بن چکی تھی۔ اس عالمگیر حکومت کے تمام ادارے نہ صرف مکمل ہو چکے تھے بلکہ مکمل طور پر فعال بھی تھے۔ اس اتحاد کے خیال میں اب کوئی رکاوٹ ان کو اپنے مقاصد کو حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ اشتراکیت کی شکست کے بعد اب دنیا کی تین بڑی معیشتیں (روس، چین اور بھارت) اس بات پر مجبور ہوگئی تھیں کہ وہ یہودیوں کے بنائے ہوئے معاشی نظام 'منڈی کی معیشت' میں داخل ہو جائیں۔ تاہم انھیں اس وقت دھچکہ لگا جب مسلم ممالک کی حکومتوں کے علی الرغم امتِ مسلمہ کے بیٹے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے امریکہ و مغرب کے صلیبی صہیونی اتحاد کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے ہوئے اسے دنیا بھر میں نشانہ بنانا شروع کر دیا اور امریکہ و مغرب کے عالمی نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

یہاں سے صلیبی صہیونی اتحاد ایک نئی جنگ میں داخل ہوگیا اور ان کی عالمی حکومت نئے خطرے سے دوچار ہوگئی۔ وہ امت جسے صلیبی صہیونی اتحاد نے خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد اپنا اور اپنے نیو ورلڈ آرڈر کا غلام بنالیا تھا، اس کے جوانوں نے ایک صدی سے بھی کم میں انگڑائی لی اور مقابلے کے لیے میدان میں نکل آئے۔ اس جنگ کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں مدمقابل قوتوں میں ایک طرف دنیا کی تمام عالمی طاقتیں تھیں جبکہ دوسری طرف امتِ مسلمہ کے وہ نوجوان تھے جنھیں اپنی ریاستیں بھی پناہ دینے کو تیار نہ تھیں، تاہم اس کے باوجود مغرب ان سے محض اس وجہ سے خوف زدہ تھا کہ انھوں نے اس کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ چیز مغرب کے صلیبی صہیونی اتحاد کے لیے موت تھی۔

یہاں ہم مختصراً ان تمام واقعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس نئی جنگ میں پیش آئے۔

جہادِ افغانستان اور القاعدہ و طالبان کی تحریکِ جہاد کی اٹھان

روس کے خلاف افغانستان میں اٹھنے والی تحریکِ جہاد نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے مرکز کا کام دیا۔ اس جہاد میں شرکت کے لیے عرب و عجم کے لاکھوں نوجوانوں نے افغانستان کی طرف ہجرت کی اور وہاں روس کے

خلاف معرکہ آرائی میں حصہ لیا۔ مجددِ جہاد شیخ عبداللہ عزام رحمہ اللہ کی کوششوں سے عرب دنیا میں جہادی بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی جس نے مسلمان نوجوانوں میں سقوطِ خلافتِ عثمانیہ کے پون صدی بعد دوبارہ احیائے خلافت کا ولولہ پیدا کر دیا۔ آپ نے اس وقت افغانستان میں روس کے خلاف بر سرِ پیکار مجاہدین کو اندلس کی آزادی تک جہاد جاری رکھنے کا فتویٰ دیا اور مسلمان مجاہدین میں یہ فکر راسخ کی کہ جب تک پوری امتِ مسلمہ مغرب کے تسلط سے آزاد نہیں ہو جاتی، جہاد جاری رہے گا۔

یہ وہ فکری رہنمائی تھی جس نے مجاہدین کو امریکہ و مغرب کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس دوران افغانستان کے محاذ نے ایک اہم تربیتی مرکز کا کام دیا جہاں سے لاکھوں نوجوانوں نے جہادی تربیت حاصل کی اور روس کے جانے کے بعد وہ اس تربیت کے ساتھ اپنے اپنے ممالک واپس لوٹے۔ نیز افغانستان نے مصر، شام، فلسطین اور اردن وغیرہ میں ۶۰ء اور ۷۰ء کی دہائی سے جاری جہادی تحریکات سے تعلق رکھنے والے مجاہدین و علماء کو ایک دوسرے کے تجربات سے سیکھنے اور فائدہ اٹھانے کا موقع بھی فراہم کیا۔[62]

اسی محاذ نے امتِ مسلمہ کو شیخ اسامہ بن لادن رحمہ اللہ کی صورت میں وہ عبقری شخصیت فراہم کی جس نے برابر بیس سال تک اس جنگ میں مغرب کے خلاف امتِ مسلمہ کی قیادت کی اور جماعت 'قاعدۃ الجہاد' کی بنیاد رکھی۔ اسی محاذ پر روسی انخلاء کے بعد امارتِ اسلامیہ کے قیام کے لیے عالی قدر امیر المومنین ملا محمد عمر حفظہ اللہ کی قیادت میں طالبان تحریک کھڑی ہوئی جس نے آگے چل کر افغانستان میں امارتِ اسلامیہ کو قائم کیا۔

خلیج جنگ، امریکی افواج کی حجاز میں آمد اور امریکہ کے خلاف اعلانِ جہاد

افغانستان سے روس کے بھاگ جانے کے دو سال بعد ۱۹۹۰ء میں عراق نے کویت پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں اقوامِ متحدہ نے عراق پر پابندیاں عائد کر دیں اور امریکی صدر جارج بش سینیئر نے کویت کی حفاظت کے بہانے سر زمینِ حجاز میں امریکی افواج داخل کر دیں۔ ایک سال کے اندر جنگِ خلیج ختم ہو گئی اور عراق کویت سے نکل گیا مگر اس دوران امریکی افواج کا سر زمینِ حجاز میں داخلہ مغرب کے خلاف مجاہدین کی جنگ کے لیے ایندھن

---

[62] واضح رہے کہ روس کے خلاف افغان جہاد سے قبل بھی عرب دنیا میں اور خصوصاً مصر اور شام میں جہادی تحریکات کام شروع کر چکی تھیں اور مغربی آقاؤں کے وفادار حکمرانوں اور افواج کے خلاف پنجہ آزمائی کے دوران ہزاروں جانوں کی قربانیاں دے چکی تھیں۔ یہ تحریکات معاشرے میں اپنی دعوت کے حامی پیدا کر پائیں، نوجوانوں میں مزاحمت کا جذبہ بھی بیدار کر گئیں لیکن نظام الٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ نیز یہ تحریکات مسلمانوں کو غلام بنانے والے عالمی نظام کے خلاف جنگ کی نسبت اس نظام کے مقامی آلہ کاروں کے خلاف جنگ میں زیادہ مشغول رہیں۔

ثابت ہوا۔ شیخ اسامہ بن لادن رحمہ اللہ نے اسلامی ممالک کے سفر کر کے سعودی حکومت کے اس اقدام کے خلاف علمائے کرام کو متحد کرنے کی سعی کی، لیکن سعودی حکومت نے ایک نہ مانی۔ الٹا شیخ اسامہ بن لادن رحمہ اللہ کے سعودیہ میں داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ اس موقع پر شیخ اسامہ بن لادن رحمہ اللہ نے امریکہ کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا اور پوری امت کو امریکہ کے خلاف کھڑے کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ سعودیہ میں داخلے پر پابندی کے بعد آپ اور آپ کے ساتھی مجاہدین سوڈان چلے گئے۔

صومالیہ پر امریکہ کا حملہ اور مجاہدین کا دفاع

اسی دوران ۱۹۹۱ء میں صومالیہ میں امریکی غلام 'سعد برے' کی حکومت کو وہاں کے مسلمانوں نے الٹا دیا۔ یہ دیکھتے ہوئے اقوامِ متحدہ نے امریکی اشاروں پر صومالیہ میں امریکی فوج کی قیادت میں امن فوج (UNITAF)[63] بھیج دی۔ یہ فوج ۱۹۹۳ء میں صومالیہ میں داخل ہوئی، تاہم اسے منہ کی کھانا پڑی۔ شیخ اسامہ بن لادن رحمہ اللہ نے سوڈان سے مجاہدین کو صومالیہ میں اس فوج کے مقابلے کے لیے بھیج دیا۔ انھوں نے صومالی مجاہدین کے ساتھ مل کر موغادیشو کی لڑائی میں 'امن فوج' کے ۱۳۱ امریکی فوجیوں اور ۲۴ پاکستانی فوجیوں کو قتل کیا اور امریکیوں کی لاشیں سڑکوں پر گھسیٹیں۔ یہ مناظر دیکھ کر دنیا میں کہرام مچ گیا اور نتیجتاً اقوامِ متحدہ کا یہ مشن ناکام واپس بلا لیا گیا۔ عملی میدان میں مجاہدین کی طرف سے امریکہ کو لگنے والی یہ پہلی بڑی ضرب تھی۔

الجزائر میں جہاد کا آغاز

مغربِ اسلامی (افریقہ) میں جہاں ایک طرف صومالیہ میں مسلمانوں نے امریکی غلاموں کو ماننے سے انکار کر دیا، وہاں دوسری طرف الجزائر میں مسلمانوں نے فرانسیسی غلاموں کو ماننے سے انکار کر دیا اور ۱۹۸۹ء کے انتخابات میں مذہبی جماعت 'الجبهة الإسلامية للإنقاذ' کو پسند کیا۔ تاہم فرانس کے احکامات پر اس کی غلام الجزائری فوج نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور الجبهة الإسلامية للإنقاذ کے اکثر قائدین کو گرفتار کر لیا جن میں قائدِ جماعت 'شیخ عباسی مدنی' اور 'شیخ علی بلحاج' شامل تھے۔ الجزائری فوج کے الجزائر پر قبضے اور مسلمان قائدین کی گرفتاری نے چنگاری کا کام دیا اور وہاں قابض فوج کے خلاف ۱۹۹۱ء میں تحریکِ جہاد کا آغاز ہو گیا۔ اس تحریک میں وہ الجزائری مجاہدین بھی آشامل ہوئے جنھوں نے اس سے قبل افغانستان میں روس کے خلاف جہاد میں حصہ

[63] United Task Force (UNITAF)

لیا تھا۔ الحمدللہ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۵ء کے آغاز تک الجزائر کا یہ جہاد بہت خوبی سے بڑھتا رہا۔ مجاہدین نے الجزائر کے نئے حاکم فرانسیسی غلام 'بوضیاف' کو قتل کر دیا اور الجزائری فوج کو بھی خاصہ نقصان پہنچایا۔ اس وقت فرانس اور الجزائر کی خفیہ تنظیموں نے چال چلی اور مجاہدین کی صفوں میں اپنے بندے داخل کر دیے، جس کی وجہ سے ۱۹۹۵ء کے بعد یہ تحریک شر پسندوں کے ہاتھ میں چلی گئی جنھوں نے عام عوام تک کو شہید کیا اور مخلص مجاہدین میں سے کئی کو شہید اور دوسروں کو گرفتار کرلیا۔ یہ حالات ۱۹۹۵ء سے لے کر ۱۹۹۷ء تک رہے جب اس شر پسند تکفیری ٹولے کا زور ٹوٹ گیا۔

اس وقت بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الجزائر میں مجاہدین کی تحریک ناکام ہو گئی، تاہم عالمی تحریکِ جہاد پر اس کے بہت سے اثرات مرتب ہوئے۔ مجاہدین نے الجزائر کے اس تجربے سے بہت کچھ سیکھا اور دوسرے علاقوں میں ان خامیوں کا ازالہ کیا جو یہاں رہ گئی تھیں، اور خود الجزائر میں بھی صحیح فکر وعقائد کے حامل مجاہدین دوبارہ منظم ہوئے۔

قوقاز، بوسنیا اور کشمیر میں تحریکِ جہاد کی اٹھان

دو صدیوں سے قوقاز میں جاری روسی جارحیت کے مقابلے کے لیے ۹۰ء کی دہائی میں مجاہدین نے دوبارہ منظم ہونا شروع کیا اور ۱۹۹۴ء میں امیر شامل بسایوف رحمہ اللہ اور امیر خطاب رحمہ اللہ کی قیادت میں مجاہدین نے قوقاز کے صوبے 'گروزنی' کے دفاع کے لیے روسی فوج کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا۔ الحمدللہ دو سال کی جدوجہد کے نتیجے میں اگست ۱۹۹۶ء میں مجاہدین نے 'گروزنی' سے روسی فوج کو مار بھگایا اور وہاں اسلامی امارت قائم کر دی جو کچھ عرصہ قائم رہی۔ اس کے ساتھ ہی قوقاز کے دوسرے صوبوں میں بھی مجاہدین نے تحریکِ جہاد برپا کر دی۔

نیز نوے کی دہائی کے آغاز ہی میں یورپ کے مسلم علاقے بوسنیا پر صلیبی سربیا اور کروایشیا نے حملہ کیا اور وہاں کی مسلم آبادی کا بڑے پیمانے پر قتلِ عام اور مسلمان خواتین کی عصمت دری کا بھیانک سلسلہ شروع کیا۔ ایسے میں جب تمام مسلم ممالک کی افواج خاموش تماشائی بنی رہیں یا اقوامِ متحدہ کی فوج کا جزو بن کر بوسنیا گئیں اور عالمی طاقتوں کے ایجنڈے پورے کیے، اس ظلم کے خلاف پوری امت سے مجاہدین امڈ امڈ کر بوسنیا پہنچنے لگے اور ہر قسم کی معاشی و عسکری پابندیوں کے باوجود اپنے مظلوم بھائیوں کا دفاع شروع کیا اور جلد ہی سربیا کی فوج کو بہت سے علاقوں سے پیچھے دھکیل دیا۔ حالات کا رخ بدلتا دیکھ کر اور یورپ کے قلب میں مجاہدین کو جگہ بناتا دیکھ

کر عالمی برادری حرکت میں آئی اور جنگ بندی کروادی اور بوسنیا کی مقامی قیادت کو معاہدوں کے ماکرانہ جال میں پھنسا کر اس مبارک جہاد کے ثمرات کماحقہ سمیٹنے کے مواقع ختم کر دیے۔

تیسری جانب افغان جہاد کے آخری دور ہی میں کشمیر کی سمت جہاد بھی امت کی توجہ کا مرکز بنا اور بہت سے عرب اور پاکستانی مجاہدین اپنے کشمیری بھائیوں کے دفاع کے لیے بھارتی فوج کے خلاف لڑنے کشمیر میں داخل ہوئے۔ یہ عرصہ کشمیر کی جہادی تحریک کے عروج کا عرصہ تھا اور بھارتی فوج اس عرصے میں شدید مشکلات کا شکار رہی۔ مگر پاکستانی فوج اور خفیہ اداروں کی سازشوں نے اس تحریک کو بھی اندر ہی اندر سے کمزور کیا اور اسے ایک شرعی جہاد کی بجائے ایک وطنی جنگ میں تبدیل کرنے کے علاوہ مختلف ذرائع سے اس تحریک کا گلا بھی گھونٹا تاکہ یہ تحریک کبھی کسی منطقی نتیجے تک نہ پہنچ پائے۔

افغانستان میں عالی قدر امیر المومنین ملا محمد عمر حفظہ اللہ کی قیادت میں امارت اسلامیہ کا قیام

افغانستان میں روس کے انخلاء کے بعد جب مجاہدین کے مختلف گروہ آپس میں لڑنے لگے تو اللہ تعالی نے اپنے چنیدہ بندوں کو کھڑا کیا جو جاہ و حشم کے طلبگار نہ تھے اور جنھوں نے اپنے جہاد کا مقصدِ وحید 'اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کو قائم کرنا' بنا رکھا تھا۔ ۱۹۹۱ء میں امیر المومنین ملا محمد عمر حفظہ اللہ کی قیادت میں طالبان کی تحریک نے قندھار سے آغاز کیا اور پانچ سال کے عرصے میں افغانستان کے اکثر علاقوں میں اپنا نظام قائم کر کے امیر المومنین کی قیادت میں امارتِ اسلامیہ قائم کر دی۔ امارتِ اسلامیہ کی بدولت افغانستان میں شریعت کا نفاذ عمل میں آیا اور مکمل امن قائم ہو گیا۔ سقوطِ خلافتِ عثمانیہ کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب نیو ورلڈ آرڈر کے مقابلے میں مسلمانوں نے اپنا نظمِ سیاسی قائم کیا جو ۲۰۰۱ء تک قائم رہا۔ صلیبی صہیونی اتحاد کو مسلمانوں کی یہ مملکت مسلسل کھٹکتی رہی جو ان کے عالمی غلبے اور نیو ورلڈ آرڈر کے تسلط سے محفوظ تھی، لہٰذا انھوں نے اس کے خلاف حملے کی منصوبہ بندیاں شروع کر دیں۔

امریکہ پر مجاہدین کا حملہ

اسی دوران جب امریکہ امارتِ اسلامیہ افغانستان پر حملے کے لیے پر تول رہا تھا اور اپنی تیاری مکمل کر چکا تھا، تو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو مجاہدین نے پیشگی قدم اٹھاتے ہوئے امریکہ کے خلاف تاریخ ساز کارروائی کی۔ مجاہدین نے نئی حکمتِ عملی اپناتے ہوئے امریکہ کو اسی کی سرزمین میں ضرب لگائی اور اس کی معیشت اور عسکریت کے نشانوں

'ورلڈ ٹریڈ سنٹر' (World Trade Centre) اور 'پینٹاگون' (Pentagon) کو نشانہ بنایا۔ یہ ایک ایسی کارروائی تھی کہ صلیبی صہیونی اتحاد اس کی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کارروائی نے صلیبی صہیونی اتحاد اور امتِ مسلمہ کی جنگ میں مزید تیزی پیدا کر دی اور مغرب کے نیو ورلڈ آرڈر کو حقیقی دہشت میں مبتلا کر دیا۔ جدید تاریخ میں ۱۱ ستمبر کو مجاہدین کے حملے ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی وہ موڑ ہے جہاں سے صلیبی صہیونی اتحاد کا 'نیو ورلڈ آرڈر' اپنے زوال کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔[64]

افغانستان پر امریکہ کا حملہ اور مجاہدین کا دفاع

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں کے بعد امریکہ بدمست ہاتھی بن گیا اور امریکی صدر بش نے 'صلیبی جنگ' اور 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے نام پر امتِ مسلمہ کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا اور پوری دنیائے کفر کو اس جنگ میں امت اور مجاہدینِ اسلام کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ یوں دنیا میں اس جنگ کا کھلے بندوں اعلان ہو گیا جس کا آغاز ایک دہائی قبل ہو چکا تھا اور جس کے محاذ اس سے قبل صومالیہ، الجزائر، بوسنیا اور قوقاز میں سج چکے تھے اور جس میں امتِ مسلمہ کے مجاہد بیٹے کینیا، تنزانیہ میں واقع امریکی سفارت خانوں اور سی آئی اے کے مراکز کو، نیز یمن کے ساحل کے نزدیک امریکی جنگی بحری بیڑے کو اپنی مبارک ضربوں سے برباد کر چکے تھے۔

امریکہ نے پورے مغرب کے ساتھ مل کر افغانستان کی امارتِ اسلامیہ پر حملہ کر دیا اور پورے ملک کو ٹام ہاک اور ڈیزی کٹر میزائیل برسا کر تخت و تاراج کر دیا۔ امریکہ اپنے زعم میں تھا کہ تین ہفتے میں وہ افغانستان سے مجاہدین کا خاتمہ کر دے گا، مگر اسے اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب کئی سال گزر جانے کے بعد بھی وہ بالفعل ایک انچ زمین پر مکمل تمکین حاصل نہ کر سکا۔ طالبان نے حکمتِ عملی کے طور پر پسپائی اختیار کی اور نئے سرے سے منظم ہو کر گوریلا جنگ کا آغاز کیا۔ آج گیارہ سال سے زائد گزر جانے کے بعد بھی امریکہ ہر چڑھتے سورج کے ساتھ افغانستان کی دلدل میں مزید دھنستا جا رہا ہے اور بحمد اللہ طالبان مستحکم اور مضبوط ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

---

[64] ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں کے دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کے احاطے کے لیے تو پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ البتہ جو شخص بھی دل کی آنکھوں سے ۲۰۰۱ء کے بعد کے حالات کا جائزہ لے گا تو یقیناً وہ جان لے گا کہ ان حملوں نے دنیا کی معیشت اور سیاست پر کس قدر گہرے اثرات مرتب کیے اور عالمی طاقت کے توازن کو کس طرح متزلزل کیا۔ اس کے علاوہ جو شخص مزید گہرائی سے مطالعہ کرے گا تو اسے یہ بھی دیکھنے کو ملے گا کہ ان حملوں نے کتنے ہی انسانوں کی انفرادی زندگیوں تک میں تبدیلی پیدا کر دی۔ (م۔ح)

عراق پر امریکی حملہ اور مجاہدین کے ہاتھوں شکست

ایک طرف امریکہ نے اپنی طاقت کے زعم میں ۲۰۰۱ء میں افغانستان پر حملہ کیا تو دوسری طرف ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملہ کر دیا۔ جس طرح افغانستان پر حملہ امریکہ کو مہنگا پڑا، اسی طرح عراق پر حملہ بھی اس کے لیے نہایت برا ثابت ہوا۔ صدام حسین کی حکومت تو الٹ گئی مگر شیخ ابو مصعب زرقاوی رحمہ اللہ کی قیادت میں مجاہدین کی ایک ایسی تحریک کھڑی ہوئی جس نے چند ہی سالوں میں امریکیوں اور اس کے اتحادیوں کو بھاری جانی ومالی نقصان پہنچایا اور وہ انخلاء پر مجبور ہوگئے۔ ایک ایک کر کے تمام اتحادی فوجیں عراق سے نکل گئیں اور امریکی افواج اکیلی رہ گئیں۔ اس پر دنیا بھر میں اور بالخصوص امریکہ میں بے انتہاء تنقید ہوئی حتیٰ کہ امریکی ریٹائرڈ جرنیل 'ولیم اوڈوم' (William Odom) نے یہاں تک کہا کہ 'یہ جنگ امریکہ کی تاریخ میں بدترین اسٹریٹیجک غلطی ہے'۔ اس کے مقابلے میں مجاہدین نے اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے عراق کے شمالی علاقے میں امارتِ اسلامیہ قائم کی۔ البتہ باقی عراق پر امریکہ نے اپنے غلام روافض کو مسلط کر دیا، اور حکومت اور فوج دونوں ان کے ہاتھ میں دے دیں۔ یہ حکومت اور فوج امریکی مفادات کے تحفظ اور اسلام دشمنی کی بنا پر مجاہدین کے خلاف صف آراء ہوگئے اور تاحال معرکہ جاری ہے۔

دیگر اسلامی خطوں میں مجاہدین کی فتوحات

۱۱ ستمبر کے مبارک حملوں کے بعد دنیا کے مختلف خطوں میں جاری جہادی تحریکات کو مہمیز ملی، گویا ان میں نئی جان پیدا ہوگئی۔ اس حوالے سے برِصغیر کے بعد سب سے زیادہ اثرات مغربِ اسلامی میں ہوئے جہاں کئی ممالک میں مجاہدین کو تقویت ملی اور وہ ایک قوت بن کر ابھرے۔ 'صومالیہ' اس حوالے سے قابلِ ذکر ہے کیونکہ وہاں مجاہدین کی جماعت حرکۃ الشباب المجاھدین نے صومالیہ کے قریباً ۹۰ فیصد پر قبضہ کر کے وہاں شریعت کے مطابق اسلامی امارت قائم کی، جس کے خلاف امریکی و فرانسیسی سرپرستی میں ارد گرد کے افریقی صلیبی ممالک نے صومالیہ پر چڑھائی کر دی اور معرکہ تاحال جاری ہے۔ اس کے علاوہ 'الجزائر' میں بھی مجاہدین دوبارہ منظم ہوئے اور فرانس کی غلام الجزائری حکومت اور فوج کے خلاف جہاد کا آغاز کیا بلکہ اپنے جہاد کو 'مالی' تک وسعت دی اور ایک مرحلے میں پورے شمالی مالی پر قبضہ کر لیا۔ آج وہاں مجاہدین اور ان کے قدیم فرانسیسی دشمنوں کے مابین براہِ راست معرکہ پھر سے شروع ہے۔ 'نائیجیریا' میں بھی مجاہدین نے وہاں کی صلیبی حکومت اور فوج کے خلاف تحریکِ جہاد کو کھڑا کیا۔ پھر اس سب سے زیادہ اہم واقعہ عالمِ اسلامی کے قلب میں واقع اس کی دو تاریخی

سرزمینوں، نبوی بشارتوں کی سرزمینوں میں نہایت مضبوط و منظم جہادی تحریکات کا کھڑا ہونا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے جزیرہء عرب کے علاقے یمن میں مجاہدین کو قوت دی اور ایک مرحلے میں وہ اس کے دو اہم صوبوں پر قابض ہو گئے۔ آج بھی امریکہ اور اس کی اتحادی مقامی فوج کے خلاف یمن کے مجاہدین کا معرکہ جاری ہے اور مجاہدین الحمدللہ اچھی صورتِ حال میں ہیں۔ دوسری جانب، فلسطین کے دروازے اور برکت والی زمین، شام میں جہاد کا شرارہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی آگ کی شکل اختیار کر گیا جس نے پوری امت میں ایمانی جذبات بھڑکا دیے اور آج یہ مبارک جہادی تحریک شام کے بہت سے علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ بحال کرا چکی ہے۔ یہ ایک معرکہ تنہا ہی پورے عالمِ اسلامی کا نقشہ تبدیل کر دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے، اور یقیناً اللہ کے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔

اختتامیہ

نیو ورلڈ آرڈر؛ حل کیا ہے؟

نیو ورلڈ آرڈر کیا ہے؟(عالمگیر حکومت کا نظام)

ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ اولڈ ورلڈ آرڈر کا نظام خاندان، قبیلے، قوم اور بادشاہت (یا مسلمانوں کے لیے خلافت) سے ملا ہوا تھا اور اس نظام کی بنیاد اپنے اپنے دین کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ نیو ورلڈ آرڈر کے نظام نے بتدریج یہ سب کچھ بدل دیا۔ اب نیو ورلڈ آرڈر نے دو ادارے بنائے؛ پہلا جمہوری ریاست اور دوسرا کمپنی۔ پھر ایک جغرافیہ میں رہنے والے انسان کو ان دونوں اداروں کے ساتھ ایک خاص ترتیب کے ذریعے جوڑ دیا۔ جب انسان ایک خاص ترتیب کے ساتھ کمپنی اور ریاست کے نظام سے جڑ گیا تو اس کو ریاست کے ذریعے عالمی اداروں یعنی اقوام متحدہ، ڈبلیو ٹی او، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے خاص ترتیب کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ اس نظام کی تین سطحیں ہیں:

1. نیو ورلڈ آرڈر کا نظام؛ فردِ واحد اور معاشرے کی سطح پر
2. نیو ورلڈ آرڈر کا نظام؛ ریاست کی سطح پر
3. نیو ورلڈ آرڈر کا نظام؛ عالمی سطح پر

نیو ورلڈ آرڈر کا نظام: فردِ واحد اور معاشرے کی سطح پر

معاشروں کا قیام دو قسم کے تعلقات پر منحصر ہے؛ ایک فرد اور اجتماعی نظم کے درمیان قائم ہونے والا تعلق اور دوسرا مرد اور عورت کے درمیان قائم ہونے والا تعلق۔ ان چاروں کے باہمی رابطے سے ہی معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ جمہوریت نے ان باہمی رابطوں کے لیے مختلف نظریات پیش کیے جن سے معاشرے کی فطری ساخت بگڑ کر رہ گئی۔

فرد: انسان سے ہیومن اور ہیومن سے پیشہ ور

آسمانی ادیان کے تابع انسان اپنے آپ کو 'عبد' تصور کرتا تھا جس کا مقصد خیرات اور عبادات کے ذریعے اپنے رب کی رضا حاصل کرنا تھا۔ انقلابِ فرانس سے پہلے یورپ میں بھی یہی نظریہ رائج تھا، لیکن انقلاب کے بعد یورپ کا انسان عبد نہ رہا بلکہ ایسا 'ہیومن' بن گیا جس کا مقصد مادی ترقی کرنا طے پایا۔ اس ترقی کے لیے اسے سرمایہ درکار تھا اور پھر اس سرمائے میں مسلسل اضافہ کرنا مقصود تھا۔ اسی کام کے لیے اب اسے اپنی زندگی کا ہر لمحہ بسر کرنا تھا۔ اپنے سرمائے کو زیادہ کرنے اور ترقی کرنے کے مقصد کے لیے اسے کسی دینی اخلاقیات کی ضرورت نہ رہی بلکہ اسے 'پیشہ ورانہ اخلاقیات' اپنانا تھیں۔ 'پیشہ ور' انسان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیشے

کے مطابق ایمانداری کے ساتھ ہیومنز کو سروس یعنی خدمات فراہم کرے جس کے عوض اسے سرمایہ ملتا ہے۔ یہ خدمات اسے بلا تفریقِ دین، مذہب، رنگ اور نسل کے ہر وقت تمام ہیومنز کو فراہم کرنا ہوتی ہیں، چاہے وہ خدمات کافروں کی خاطر اور مسلمانوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ 'پیشہ ورانہ نظریہ' (Professionalism) سے مسلمانوں میں عقیدۂ موالات و برائت ختم ہو کر رہ گیا۔

مرد وزن کی مساوات

چونکہ اب 'ہیومن' کا مقصد اپنے سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ کرنا ہے اور ہیومن دونوں مرد وزن ہیں اور چونکہ آزادی اور مساوات ہیومن کے بنیادی مقاصد میں سے ہیں، لہٰذا جمہوری نظام میں عورت اور مرد کو سرمایہ کمانے کے برابر مواقع میسر ہونے چاہییں۔ جمہوری ریاست کے شہری 'ہیومن' کو یہ باور کرایا گیا کہ سرمایہ کی بڑھوتری کے لیے عورت کو اس کے روایتی دائرے سے نکالنا ہوگا کیونکہ گھر بیٹھے رہنے سے سرمائے میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ باور کرایا گیا کہ عورت اور مرد دونوں کو اپنی اپنی ملازمت اختیار کرنی چاہیے، جس طرح مرد پیشہ ور ہے اسی طرح عورت کو بھی پیشہ ور بننا چاہیے۔ رہی گھریلو ذمہ داریاں تو انھیں بھی پیشہ ورانہ انداز میں پورا کیا جائے۔ شروع میں تو چاہیے کہ مرد اور عورت دونوں برابر ذمہ داری ادا کریں اور جیسے ہی بچہ تین ساڑھے تین سال کا ہو جائے تو اسے نرسری کی پیشہ ور استانیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ ویسے بھی ان بچوں کو پیشہ ور ہیومن بنانے کے لیے سکول کی تعلیم ضروری ہے تاکہ اسی عمر سے یہ تعلیم و تربیت دی جائے جس کی بدولت وہ بہتر پیشہ ور بن سکے۔

اس طرح یہ معاشرے انسانی معاشروں کے بجائے 'سول سوسائٹی' اور 'کارپوریٹ معاشرے' میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے جن میں تمام ہیومن بلا تفریقِ جنس کمپنیوں کے مینیجر، وکلاء، ڈاکٹر اور انجنیئر بننا شروع ہو گئے۔ سول سوسائٹی اور کارپوریٹ معاشرے کا قیام جمہوری سرمایہ دارانہ ریاست کا لازمی تقاضہ ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر کا نظام قبائلی اور خاندانی نظام کی ضد ہے

قدیم زمانے سے گھرانے اور خاندان معاشرے کی اکائی اور فطری قوت تھے جن کی بنیاد مرد اور عورت کے باہمی تعلق پر قائم تھی۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت نے اس فطری قوت کو توڑنے اور اکائی کی ساخت تبدیل کرنے پر بھرپور توجہ دی۔ اس قوت کا ربط تین طریقوں سے قائم تھا؛ ایک نکاح یا ازدواجی رشتوں سے، دوسرا اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد سے اور تیسرا اولاد اور یتیموں کی رضاعت اور پرورش سے۔ اس قوت کو توڑنے کے

لیے آزادیٔ نسواں اور مساوات کے نام پر قانون سازی کی گئی، خاتون کے لیے کمائی کے زبردستی مواقع ایجاد کیے گئے اور حکومتی عملداری سے ایسے ماحول کو تحفظ بھی فراہم کیا گیا جس سے عورت اس اکائی کی ذمہ داریوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ملازمت کے بہانے گھر سے نکالنا، خاندانی منصوبہ بندی کی آڑ میں سرے سے اولاد سے ہی چھٹکارا حاصل کرنا، جدید تعلیم کے بہانے کم عمری سے ہی بچوں کو ماں کے پیار، ذاتی توجہ اور نگرانی سے نکال کر نرسریوں کے غیر فطری ماحول کے سپرد کر دینا، پیشہ ور تعلیم دے کر انھیں خاندان سے زیادہ پیشے کا وفادار بنانا، یتیموں کو معاشرے میں ضم کرنے اور رضاعت کا انتظام کر کے ماں کی محرومی کم کرنے کی بجائے ان کے لیے علیحدہ ادارے قائم کر دینا، اسی طرح گھر میں حکیم و دانا بزرگ والدین کو نئی نسل سے دور کر کے معمر افراد کے لیے قائم کردہ اداروں کی تحویل میں دینا اور تعددِ ازدواج کو ہر حال میں جرم قرار دے کر جنسی بے راہ روی کا دروازہ کھولنا، یہ تمام جمہوریت کے وہ اقدامات ہیں جس سے خاندان کی اکائی کو توڑ دیا جاتا ہے۔

جمہوری ریاست دراصل معاشرتی قوتوں کا انحطاط اور غیر ذمہ دار معاشرے کا قیام ہے

معاشرے میں قدیم زمانے سے خاندانوں اور قبائل پر مشتمل فطری قوتیں پائی جاتی تھیں جو معاشرے کے افراد کی نگرانی کے ساتھ ساتھ ان کے مسائل بھی حل کرتی تھیں۔ اسلام نے ان فطری قوتوں کو ختم کرنے کی بجائے انہیں شریعت کا پابند کر کے معاشرے کی تطہیر کی اور پھر انہی قوتوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سونپ کر معاشرے کے تحفظ کا بندوبست کیا۔ اسی معاشرے کے ذمے احکامِ شریعت کی تطبیق، حدود اللہ کا نفاذ اور جہاد کے لیے افراد اور وسائل فراہم کرنا تھا۔ حکومت اس بات کی نگرانی کرتی تھی کہ یہ کام سرانجام دیے جا رہے ہیں۔

اس کے برعکس جمہوری نظام نے ایسا معاشرتی نظام متعارف کرایا جس میں معاشرے کی حقیقی اور اصل قوتوں سے اختیارات چھین کر نئی تخلیق کردہ قوتوں کو سونپ دیے گئے جن کا معاشرے سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ اس مقصد کے تحت یونین کونسل، پولیس اور بیوروکریسی کا نظام قائم کیا گیا اور اس کے ذریعے... اپنے رائج کردہ نظامِ تعلیم اور پارٹی سازی کی مدد سے... معاشرے کی لگام غیر فطری قوتوں کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اصل قوتیں یا تو مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئیں یا ان کا سارا زور اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھنے کے لیے ان مصنوعی قوتوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے اور نئے نظام میں اپنے آپ کو منوانے میں صرف ہوا۔ جبکہ معاشرے کے بقیہ افراد کو معاش کی تلاش اور سرمائے کی بڑھوتری پر لگا دیا گیا۔

نتیجتاً معاشرے کی تمام تر ذمہ داری ایسے طبقے کو منتقل ہوگئی جو دراصل اس ذمہ داری کو نبھانے کے لیے نہیں بلکہ جمہوری ریاست کی عملداری قائم کرنے کے لیے بنا تھا اور یوں پورا معاشرہ غیر ذمہ دار معاشرہ بن گیا۔ اس کا عملی مظاہرہ مسلم معاشروں میں اس وقت محسوس ہوتا ہے جب معاشرے کی کوئی قوت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنے لگتی ہے تو جمہوری ریاست کا 'لاء اینڈ آرڈر' (Law And Order) اس کے خلاف حرکت میں آجاتا ہے۔

غیر مسلح معاشرہ، بے بس معاشرہ

اصل قوتوں کا زور توڑ کر 'لاء اینڈ آرڈر' نافذ کرنے والی ریاستی مشینری کے تسلط کا فطری نتیجہ تھا کہ وہ معاشرہ جو پہلے جہاد کے لیے افراد اور وسائل فراہم کرتا تھا، اب غیر مسلح ہو جائے۔ غیر مسلح ہونے سے معاشرے اور ریاستی مشینری میں طاقت کا توازن بدل گیا۔ اب معاشرہ چاہنے کے باوجود بھی جرائم اور فحاشی کے سامنے بے بس دکھائی دیتا ہے اور ریاست بے دھڑک ہر باطل نظریے، ہر فحش تہذیب کو جب چاہے رائج کر دیتی ہے۔

اپنے مرکز سے کٹا ہوا معاشرہ

سرمایہ دارانہ جمہوری ریاست کے کارپوریٹ معاشرے میں مسجد، مدرسہ اور دارالافتاء کی کوئی اہمیت نہیں، جبکہ اسلامی معاشرے میں ان اداروں کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ مسجد میں معاشرے کا اللہ تعالیٰ سے اجتماعی تعلق قائم ہونا اور عوام کے لیے احکامِ شریعت کا بیان ہونا، مدارس کا مسلم بچوں کو اسلام کی تعلیم سے بہرہ ور کرنا اور دارالافتاء کا دین کی روشنی میں زندگی کے مسائل کا حل پیش کرنا؛ یہ تمام ذمہ داریاں مسلم معاشرے کے یہ ادارے ہی سرانجام دیتے تھے، حتیٰ کہ قاضی کے نظام کے تحت فوجداری مقدمات بھی یہیں طے ہوتے تھے۔ جدید جمہوری معاشرے میں اس مرکز کی اہمیت پرانے زمانے کی یاد دلانے والی نمائشی عمارت سے زیادہ نہ رہی۔

نیو ورلڈ آرڈر کا نظام؛ ریاست کی سطح پر

جمہوری ریاست کا قیام نیو ورلڈ آرڈر کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اس ریاست کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو کبھی بھی اللہ کی مخلوق نہ بننے دے اور اس کو ترقی کے مقصد پر قائم رکھے، آئین کی تشکیل کر کے انقلابِ فرانس میں طے کی ہوئی انفرادی و اجتماعی انسانی خواہشات کی حفاظت کرے، اسے بزورِ شمشیر نافذ کرے اور اس کے خلاف ہر اٹھنے والی آواز کو کچل دے۔ اس کے لیے 'لاء اینڈ آرڈر' اور 'ریاست کی رٹ' (Writ of the

(State) قائم کرنا جیسی اصطلاحات استعمال کی گئیں۔ جمہوری ریاست کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ اس میں رہنے والے تمام انسانوں سے ان کے انتظامی اختیارات لے لیے جائیں اور ان کو غیر مسلح اور کمزور معاشرے میں تبدیل کر دیا جائے۔ جمہوری ریاست کی ایک اہم ذمہ داری جس کے سبب اسے تخلیق کیا گیا، سرمایہ دارانہ نظام کی خدمت گزاری ہے۔

لاء اینڈ آرڈر

انتظامی سطح پر ریاست آئین کی بالادستی قائم کرتی ہے جو دراصل انسان کے اجتماعی 'ارادۂ کل' کا نام ہے۔ آئین کی بالادستی کے نام پر انسان کے بنائے ہوئے قوانین انسانوں پر نافذ کر دیے جاتے ہیں جو کہ 'الحكم بغير ما أنزل الله' (اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات سے ہٹ کر فیصلے کرنے) کی عملی شکل ہے۔ ان قوانین کے نفاذ کے لیے جمہوری نظام کی اکائی یعنی ضلعی سطح کے تین اداروں ضلعی بیوروکریسی، عدالت اور پولیس کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ان تینوں کو معاشرے کی اصل طاقتوں سے زیادہ اختیارات دے کر معاشرے میں اتارا جاتا ہے تاکہ وہ جمہوری ریاست کا 'لاء اینڈ آرڈر' یعنی 'قانون اور نظم' معاشرے پر مسلط کر دیں۔

ریاست کی عملداری (رٹ آف دی سٹیٹ)

جمہوریت ریاست 'رٹ' کو وہی مرتبہ دیتی ہے جو مسلمان اللہ کے حکم کو دیتا ہے۔ جب بھی کوئی قوت ہیومنز کے 'ارادۂ کل' (آئین) کے خلاف آواز بلند کرتی ہے تو ریاست کی رٹ قائم کرنے کے نام پر پوری سرکاری مشینری اس آواز کو دبانے کے لیے حرکت میں آجاتی ہے۔

جمہوری ریاست اور ضابطوں کی قید

نظام کی لگامیں اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے جمہوری ریاست سخت قسم کے احکامات جاری کرنے کی بجائے متعدد قسم کے ضابطے وضع کرتی ہے۔ ان ضابطوں اور قیود کا مقام معاشرے اور اداروں کی نظر میں اتنا اونچا کر دیا جاتا ہے کہ معاشرے اور اداروں کا مقصد خود ان ضابطوں کو لاگو کرنا رہ جاتا ہے۔ اس طرح انصاف کی فراہمی اور حقوق وواجبات کی ادائیگی جیسے اصل مقاصد ان ضابطوں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ ضابطوں کے اس گرداب میں انسان پھنس کر رہ جاتا ہے۔

جمہوری ریاست اور سرمایہ دارانہ نظام کا جوڑ

پھر جمہوری ریاست دراصل سرمایہ دارانہ نظام کے اجتماعی اور سیاسی نظم کا نام ہے۔ جمہوریت کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کو وہ حکومت میسر آجاتی ہے جو اس کے مفادات کے تحفظ کو یقینی بنائے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں چونکہ ہیومن کے درمیان باہمی معاملات کو منظم کرنے کے لیے کوئی نظم نہ تھا، لہٰذا جمہوری نظام کو اس کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس طرح قرونِ وسطی میں شروع ہونے والی اقتصادی تبدیلیاں جو بعد میں سرمایہ دارانہ نظام کی شکل اختیار کر گئیں اور حقوقِ انسانی کی جنگ جو بعد میں جمہوری نظام کی شکل اختیار کر گئی، ریاست کی سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ انقلابِ فرانس کے بعد تو جمہوریت کے ذمے باقاعدہ سرمایہ دارانہ نظام کی حفاظت و تنفیذ اور انتظام وانصرام سونپ دیا گیا۔ جمہوری ریاست کا مقصد 'ارادۂ عمومی' کو 'ارادۂ کل' کے تابع کرنا تھا۔ چونکہ ارادۂ کل انسان کی ترقی چاہتا ہے جو سرمائے کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا جمہوریت 'ارادۂ کل' کے نام پر پورے معاشرے کو سرمائے کی بڑھوتری پر لگا دیتی ہے۔ اور جو بھی اس سے انحراف کرے، جمہوریت اس کے پیچھے 'ارادۂ کل' ہی کے نام پر لگ جاتی ہے یہاں تک کہ یا تو وہ اس ارادے کے تابع ہو جائے یا معاشرے سے ہی الگ ہو جائے اور پھر اسے جائے پناہ بھی میسر نہ ہو۔

جمہوری ریاست کا پہلا کام فرد کو منڈی کی معیشت سے جوڑنا

جیسا کہ اوپر ذکر کیا کہ جمہوری ریاست کی ایک اہم ذمہ داری ملک میں ایسے تعلیمی ادارے قائم کرنا ہے جن میں تربیت پانے کے بعد مرد اور عورت انسان کی بجائے 'پیشہ ور ہیومن' بن جائیں اور سرمایہ دارانہ معاشرے کو اپنی خدمات پیش کریں۔ ان پیشہ وروں میں 'اینٹرپرنیورشپ' (Entrepreneurship) کی صفت ہونی چاہیے۔ 'اینٹرپرنیورشپ' کا مطلب یہ ہے کہ پیشہ ور زیادہ سرمایہ کمانے کے لیے اپنی خدمات میں نت نئی جہتیں پیدا کرے اور اس کے لیے خطرہ مول لے۔ جس ہیومن میں یہ صلاحیت نہ ہو، وہ اس نظام میں بہت پیچھے رہ جائے گا۔

ریاست کو منڈی کی معیشت سے جوڑنا

سرمایہ دارانہ جمہوری ریاست مختلف طریقوں سے منڈی کی معیشت کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اس سلسلے میں جدید جمہوری ریاستوں کی ذمہ داریاں متعین کی جاچکی ہیں۔ بنیادی ذمہ داری تو یہ ہے کہ جمہوری ریاست اپنے ملک میں جدید معیشت کا نظام قائم کرے۔ اس کے لیے مختلف قسم کے اقدامات کیے جاتے ہیں۔

پہلے قدم پر جدید معیشت کی منڈیاں قائم کی جاتی ہیں جن میں تجارتی بینک، سٹیٹ بینک، بازارِ حصص اور زر کی اوپن مارکیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ پھر تمام قانونی رکاوٹیں ہٹا کر ایسی قانون سازی کرنی ہوتی ہے جو اس معیشت کی حوصلہ افزائی کرے۔ پھر نجکاری کا عمل شروع کر کے منافع بخش اداروں کو عالمی کمپنیوں کے ہاتھ فروخت کرنا ہوتا ہے۔ کسانوں اور صنعت کاروں کو دی گئی مراعات واپس لے کر ان پر زرعی اور صنعتی ٹیکس لاگو کیا جاتا ہے۔ ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے معاونت لازم کر دی جاتی ہے۔ پھر ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا جاتا ہے جو بلا امتیازِ جنس مرد اور عورت کو پیشہ ور بنا دے۔ **اس طرح فرد، معاشرے، معاشی اداروں اور ریاست کو ایسے مربوط جال نما نظام کے تحت عالمی اداروں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے جس سے یہ ممالک نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔**

نیو ورلڈ آرڈر کا نظام؛ عالمی سطح پر

فرد، ریاست اور منڈی کو عالمی نظام سے جوڑنا (عالمگیریت)

جب جمہوری ریاست فردِ واحد، معاشرہ اور معیشت کو اپنے ساتھ جوڑ لیتی ہے تو اس کے بعد جمہوری ریاست اپنے آپ کو اقوامِ متحدہ، عالمی تجارتی ادارے، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ساتھ جوڑ کر عالمی نظام سے منسلک کر دیتی ہے۔ انگریزی میں اس عمل کے لیے 'گلوبلائزیشن' (Globalization) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جسے اردو میں 'عالمگیریت' کہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قدیم زمانے سے لوگوں کے عالمی تعلقات رہے ہیں، چاہے وہ مذہبی و ثقافتی نوعیت کے ہوں یا جنگی اور تجارتی۔ قریشِ مکہ کی تجارت، اسلام کی آفاقی دعوت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عالمی فتوحات اسی پر گواہ ہیں۔ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دنیا کی تمام اقوام نے کسی نہ کسی موقع پر ایک دوسرے کے ساتھ عالمی تعلقات قائم کیے ہیں۔ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ معاشروں کی اُس عالمگیریت اور مغرب کی جدید عالمگیریت کے درمیان بنیادی فرق کیا ہے؟

معاشروں کے درمیان عالمی تعلقات دراصل فطری عمل کے نتیجے میں قائم ہوتے تھے جس میں اقوامِ عالم کے درمیان افکار و علوم کے تبادلے کے ساتھ ساتھ خرید و فروخت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ بنیادی طور پر ہر ملک و قوم کا انحصار زیادہ تر اپنی معیشت اور غلے پر ہوتا تھا جبکہ وہ اجناس اور اشیاء جو ان کے یہاں نایاب ہوتے تھے دوسرے ممالک سے خریدتے تھے۔ اس طرح ہر ملک اپنی پیداوار میں آزاد اور معاشی طور پر خود کفیل تھا۔ مگر جدید مغربی عالمگیریت نے ایسا عمل شروع کیا جس میں ممالک کو عالمی معیشت سے منسلک کروا کے ایک

دوسرے پر زبردستی انحصار کروایا گیا۔ انحصار کے اس عمل کے لیے دو ذرائع اپنائے گئے؛ ایک سرمایہ اور دوسرا پیداوار، یعنی ایک ملک دوسرے پر سرمائے کی فراہمی کے لیے انحصار کرے گا یا دوسرے ملک کی پیدوار پر انحصار کرے گا۔

یہ کام 'عالمی تنظیم برائے تجارت' (ڈبلیوٹی او) کے ذریعے کیا گیا۔ ان تمام ممالک کو عالمی تجارت کرنے کے لیے اس تنظیم کا رکن بننے پر مجبور کیا گیا۔ اس طرح بیشتر ممالک عالمی تجارت کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ رکنیت اختیار کرنے والے ممالک اس تنظیم کے قوانین کے پابند ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک اہم قانون 'ٹرپ' کہلاتا ہے۔ اس قانون کے مطابق ہر ملک پر لازم ہے کہ وہ اپنی زرعی و صنعتی پیداوار کو رجسٹر کروائے و گرنہ وہ عالمی منڈی میں اس پیداوار کی خرید و فروخت نہیں کر سکتا۔ پھر جب کوئی ملک کسی اجناس و اشیاء کی رجسٹریشن میں سبقت لے جائے تو باقی تمام ممالک اس اجناس و اشیاء کی پیداوار نہیں کر سکتے۔ اس طرح باقی ممالک کسی خاص پیداوار کے لیے اس ملک پر انحصار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر بھارت باسمتی چاول کی اقسام کی رجسٹریشن پر سبقت لے جاتا ہے تو پاکستان سمیت کوئی بھی ملک چاول کی وہ اقسام پیدا نہیں کر سکے گا اور اس طرح تمام ممالک اس قسم کے چاول کے لیے بھارت پر انحصار کریں گے۔ دوسری طرف اگر پاکستان کو کسی بڑے منصوبے کے لیے رقم درکار ہے جو وہ تجارت کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتا تو لامحالہ اسے اس سرمائے کے حصول کے لیے دوسرے ممالک کے قرضوں پر انحصار کرنا ہو گا۔ چونکہ عام طور پر ایسے ممالک عالمی اجارہ داری کی وجہ سے تجارت سے سرمایہ حاصل نہیں کر سکتے لہٰذا لامحالہ وہ دوسرے ممالک پر انحصار کرتے ہیں۔ یہی نئی 'عالمگیریت' ہے جس سے یہودیوں کا عالمی منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔

یوں ایک طرف تو عالمی معیشت کو ایک دوسرے کے ساتھ انحصار پر مجبور کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف ہر ملک اور قوم کو اقوامِ متحدہ کی قرار دادوں کا پابند بنایا جا رہا ہے۔ اگر کوئی حکمران اس کی پابندی نہ کرے تو اسے اقوامِ متحدہ کے تحت چلنے والی عالمی عدالت میں جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ پھر تیسری طرف سلامتی کونسل کی قرار دادوں کے ذریعے مغرب کسی بھی ایسے ملک کے خلاف حملے کا لائسنس حاصل کر کے اس پر حملہ کر دیتا ہے جو اس عالمی دجالی نظام کی تابعداری نہ کرنا چاہ رہا ہو۔

نیو ورلڈ آرڈر صلیبی صہیونی نظام ہے

نیو ورلڈ آرڈر انقلاب فرانس سے ۲۰۱۰ء تک ان دوسو اکیس سالوں میں کئی مرحلے طے کر کے آج ہمارے سامنے اس شکل میں موجود ہے۔ اس نظام کی بنیاد مذہب اور بادشاہت کی مخالفت

میں شروع ہوئی تھی۔ یہ نظام 'دینِ انسانی' ہے۔ یہ دین اللہ سے کسی اجر کی توقع رکھے بغیر انسانیت کی خدمت کا دعویدار ہے۔ مگر اس دین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اللہ سے اجر کی توقع رکھ کر اور نہ رکھ کر عمل کرنے والوں کے لیے جدت اور اجتہاد کے نام پر ایک ایسا راستہ بنا دیا ہے کہ جس سے ان دونوں گروہوں کے اعمال اور افعال ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اب اگر آپ اللہ سے بغاوت، دین، انبیاء اور وحی سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں تو جمہوری سرمایہ دارانہ افکار قبول کرکے اور اس نظام میں شامل ہو کر یہ سب کر سکتے ہیں، اور اگر آپ جنت میں جانا چاہتے ہیں تو بھی آپ جمہوریت، جمہوری ریاست، پارلیمنٹ میں انسان کے بنائے ہوئے قانون اور منڈی کی معیشت کے سود خوری کے نظام پر عمل کر کے نعوذ باللہ یہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

تمام انسانیت کو اس ایک نظام کی چھتری تلے اکٹھا کر لینے کے بعد، اور فرد، خاندان، معاشرے، امت اور خلافت کی قوتوں کو توڑ لینے کے بعد اب یہود کی سعی ہے کہ وہ اپنے مقاصدِ عظمیٰ کے حصول کے لیے کوششوں کو تیز تر کر دیں۔ ان کے صلیبی مددگار بھی اس مشن میں ان کے ساتھ ہیں۔ یہ صلیبی صہیونی اتحاد بخوبی جانتا ہے کہ ایسا عالمگیر تسلط اسے نہ پہلے کبھی ملا ہے اور نہ آئندہ ملے گا اسی لیے وہ اپنے تمام اہداف اسی نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پس اگرچہ ظاہر میں یہ ایک لادین اور سیکولر نظام نظر آتا ہے لیکن جب معاملہ اسلام دشمنی کا ہو تو اس کے پیچھے وہی صلیبی جنگوں والا بغض اور یہودی حقد و حسد پوشیدہ نظر آتا ہے۔

عصر حاضر کے جہاد کی فکری بنیادیں کیا ہیں؟

عصر حاضر کے جہاد کی فکری بنیادیں ان فکری حدود، عقائد اور منہج کو سمجھنے کا نام ہے جنہیں علمائے حق نے قرآن و سنت کی روشنی میں یہود، نصاریٰ مشرکین، لادینیت اور دینِ اسلام کے درمیان، نیز امت کے گمراہ فرقوں اور اہلِ سنت کے درمیان قائم کر دیا ہے۔ یہ وہ حدود ہیں جسے کوئی مسلمان جانتے بوجھتے پار نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ یہودیت، عیسائیت، شرک، لادینیت اور گمراہ فرقوں کے عقائد اور منہج ان حدود کو پار کر کے دین حق میں شامل ہو جائیں۔ عصر حاضر میں نیو ورلڈ آرڈر اور مغرب کے افکار نے مسلمانوں میں اس قدر فکری پیچیدگیاں اور خلفشار پیدا کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے بعض اہم عقائد اور اہلِ سنت کے طریقے کے کئی اہم پہلو خود مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ علمائے حق، سچے داعیانِ دین اور مجاہدین فی سبیل اللہ آج کوئی نئی بات نہیں کر رہے بلکہ امتِ اسلامیہ کے اصول و عقائد کے بعض اہم پہلوؤں پر پڑے غبار کو

صاف کرنے میں مصروف ہیں اور امت کو اس کے دین ہی سے دوبارہ جوڑنے کے لیے کوشاں ہیں، کہ اسی میں ان کی نجات ہے۔ یہ کتاب بھی اسی کوشش وجہد کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کیا نیو ورلڈ آرڈر آخری زمانے کی حدیثوں والا فتنہ ہے؟

عصر حاضر کے اس فکری ارتداد کی کیفیت دیکھ کر کوئی معمولی سا علم رکھنے والا مسلمان بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا نیو ورلڈ آرڈر کا نظام وہی فتنے ہیں جن کا ذکر رسول اللہ ﷺ کی ان احادیث میں آیا ہے جنھیں محدثین نے آخر الزمان کی احادیث کے عنوان سے احادیث کی کتابوں میں درج کیا ہے؟ عصر حاضر میں پوری امت کے علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے جن میں مصر، سعودی عرب، پاکستان اور ہندوستان کے علماء کی بڑی تعداد شامل ہے۔ ان میں حجاز سے شیخ سفر الحوالی، مصر سے شیخ ابو زہرہ، پاکستان سے مفتی ابو لبابہ اور مولانا عاصم عمر، ہندوستان سے اسرار عالم شامل ہیں جنھوں نے اس فکری وسیاسی صورت حال کو آخر الزمان کا فتنہ قرار دیا ہے۔ بہت سے علماء کی ایسی تعداد موجود ہے جنھوں نے اس فتنے کو ان احادیث کے مطابق قرار نہیں دیا لیکن ایسا کہنے والوں کی مخالفت بھی نہیں کی۔ ان تمام علماء کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کا نظام اگر آخری زمانے کا فتنہ نہ بھی ہو تو بہر حال تاریخِ اسلام کا ایک نہایت خطرناک فتنہ ہے۔

کتاب سے حاصل ہونے والے اہم اسباق

کتاب کے اختتام پر ہم مختصراً یہ تجزیہ پیش کرنا چاہیں گے کہ نیو ورلڈ آرڈر کی حقیقت سمجھ لینے سے ہمیں کیا اہم اسباق حاصل ہوتے ہیں؟ یہی چیدہ چیدہ اسباق ذیل میں ذکر کیے جا رہے ہیں اور یہی اس کتاب کا اصل حاصل ہیں:

- ہم بطورِ امت آج آزاد نہیں ہیں اور خود کو آزاد سمجھنا نفس کا دھوکہ ہے۔ دراصل ہم یہود کی راہنمائی اور امریکہ کی قیادت میں چلنے والے نیو ورلڈ آرڈر یا جدید عالمی نظام کے غلام ہیں، اور بطور امت اس کے شکنجے میں جکڑے جا چکے ہیں۔
- موجودہ عالمی نظام کی پشت پر موجود تصورات اور نظریات خالص الحاد ہیں اور وجودِ باری تعالیٰ کے انکار اور انبیاء کی تعلیمات سے بغاوت پر مبنی ہیں۔ آج ہمارا مقابلہ محض ماضی قدیم کی روایتی عیسائیت ویہودیت سے نہیں، بلکہ عیسائیت ویہودیت کی ایک نہایت بگڑی ہوئی شکل سے ہے جو الحاد ولادینیت سے مداہنت ومشارکت کا تعلق بنا کر، ایک سیکولر نظام کی سرپرستی میں ہمارے مدمقابل کھڑی ہے۔

- جمہوریت، سرمایہ داری، ہیومن ازم، انسانی حقوق، سیکولرزم...... کا ہماری تاریخ اور ہمارے دین سے کوئی ادنی تعلق نہیں۔ یہ مغرب کی تاریک تاریخ کی داخلی کشمکش اور انسانوں کی تراشی ہوئی عیسائیت اور انسانوں کے تراشے ہوئے عقل پرستانہ عقائد کی باہمی جنگ کا نتیجہ ہیں۔اور اس جنگ کے نتیجے میں فتح یاب ہونے والے افکار ایسا غلیظ کفر و شرک ہیں جن کا رشتہ اسلام سے جوڑنے یا جنہیں اسلامیانے کی کوشش کرنے والوں پر اظہارِ تعجب وافسوس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا!
- نیو ورلڈ آرڈر اپنا تسلط عسکریت، سیاست، معاشرت، معیشت ہر میدان میں قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے اور اسی طرح فرد، خاندان، معاشرے، ریاست اور پورے عالم، ہر سطح پر اپنی جڑیں پھیلا رہا ہے۔ایسے ہمہ گیر تسلط کو محض ترغیب و تبلیغ سے گرانے کا تصور کر لینا یقیناً اس نظام سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔
- اس نظام کو سمجھ لینے کے بعد شرعاً اور عقلاً کسی طرح بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں رہتا کہ اس امت کے لیے واحد پناہ گاہ اس کا اپنے دین کی طرف واپس پلٹنا ہے اور اور واحد راہِ نجات اپنے انفرادی واجتماعی سطح کے جملہ امور میں دین کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امت جو راہ بھی اختیار کرے گی مسائل کے دلدل میں مزید دھنستی جائے گی کیونکہ تاریخ چیخ چیخ کر بتا رہی ہے کہ اس امت کے مسائل وزوال کا آغاز اسی وقت ہوا جب اس نے دین سے دوری اختیار کی۔
- اس نظام کو سمجھ لینے کے بعد اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں رہتا کہ اس نظام کی وضع کردہ حدود وقیود کے اندر رہ کر، اسی کے سکھائے ہوئے طور طریقوں کو اختیار کر کے، اسی کے قوانین ودساتیر کی پابندی کرتے ہوئے اسلام کو مطلوب تبدیلی لانے کی سعی کرنا شرعاً بھی غلط ہے اور عقلاً تو صریح حماقت ہے! اس کی مثال اس طرح ہے گویا نعوذ باللہ ایک شراب خانہ جو بنا ہی دین کے احکامات پامال کرنے کے لیے ہو، جہاں ہر سمت رقص و سرود جاری ہو، شراب کے جام چل رہے ہوں...... اسے ڈھانے کی بجائے اس میں داخل ہو کر اس سب خرافات کے بیچا بیچ مصلی بچھا کر نماز پڑھنے کی کوشش کی جائے اور اسی کو ایمان کی معراج اور مسلمانوں سے ان کے دین کا اصل مطالبہ قرار دیا جائے۔عزیز قارئین! دنیا پر اور خود مسلم خطوں پر مسلط اس نظام کا اسلام سے کوئی جوڑ نہیں۔اس کا مکمل انہدام ہی ہمارے مسائل کا حل ہے اور یہی ہم سے ہمارے دین کا تقاضہ ہے۔
- اس نظام کو سمجھ لینے کے بعد شرعاً اور عقلاً کسی طرح بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں رہتا کہ

قوت کے بل پر قائم اس مجسم شر نظام کا انہدام اور اسے چلانے والے مفسدین کا زور توڑنا جہاد و قتال کے بغیر ناممکن ہے۔ یقیناً دین کے تمام احکامات پر عمل کرنا اور ہر حکم کو اس کی اہمیت اور مقام کے اعتبار سے توجہ دینا لازم ہے، لیکن ایسی کوئی بھی تحریک جو آج امت کو کفر کی غلامی سے نکالنے میں سنجیدہ ہو، اس کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بالآخر لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے اور اللہ کے کلمے کی سربلندی اور خلافت کے قیام کی منزل قتال فی سبیل اللہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

- اس نظام کو سمجھ لینے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ امت کے حقیقی محافظ وہ مجاہدینِ فی سبیل اللہ ہیں جو کسمپرسی اور صعوبتوں کے باوجود گزشتہ کئی دہائیوں سے اس امت کے دفاع میں مصروف ہیں اور امت کو غلام بنانے والے اس عالمی نظام کو نیست و نابود کرنے کے لیے مستقل کوشاں ہیں۔
- اس نظام کو سمجھ لینے سے یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام سے محبت رکھنے والا شخص اگر ان وطنی ریاستوں اور وطنی افواج کی حقیقت سمجھ لے تو لمحہ بھر بھی ان کے لیے محبت و وفاداری کے جذبات دل میں نہ رکھے، کیونکہ یہی وطنی ریاستیں اور ان کی محافظ افواج امت کی آزادی اور خلافت کے قیام میں حائل اساسی رکاوٹ ہیں۔
- اس نظام کو سمجھ لینے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ :
  - وطنی ریاستوں کے تصور کو پامال کر کے امت کا تصور زندہ کرنا،
  - انسانی عقل اور عوامی خواہشات کی حاکمیت کے تصور کو پامال کر کے حاکمیتِ باری تعالیٰ کا عقیدہ عام کرنا،
  - جمہوری حکومت کے تصور کو پامال کر کے شوریٰ کے اصول پر مبنی خلافت کی طرف بلانا،
  - انسان کو 'ہیومن' بننے کی بجائے اللہ کا 'عبد' بننے کا جذبہ دینا،
  - مغرب اور یونان کے فلسفیوں کی اندھی تقلید کی بجائے انبیاء علیہم السلام کی کامل اطاعت کی سمت دعوت دینا،
  - سرمایہ، نفع اور لذت میں اضافے کی بجائے اعمالِ صالحہ اور اجر و ثواب میں اضافے کو مقصدِ زندگی قرار دینا،
  - وطن یا مفاد کی بنیاد پر دوستی و دشمنی کی جگہ اللہ کی خاطر دوستی و دشمنی کے عقیدے کی تعلیم دینا،

- سِول سوسائٹی کی بجائے اسلام کا عطا کردہ مسلمان فرد، مسلمان خاندان اور حقیقی اسلامی معاشرہ تیار کرنا،
- معاشرے کو تھانے کچہری اور جمہوری جماعتوں کے گرد منظم کرنے کی بجائے مسجد، مدرسہ، دار الافتاء اور علمائے حق کے گرد منظم کرنا،
- مقبوضہ مسلم خطوں پر صلیبی صہیونی اتحاد کے قبضے کو قبول کرنے کی بجائے ان کے خلاف جہاد و قتال کی صدا عام کرنا،

یہ وہ بنیادی نکات ہیں جن پر امت کو جوڑنا، جن کی دعوت دینا، جن کو عملاً اپنی جدوجہد کا محور بنانا آج ہر عالمِ دین، ہر داعی، ہر خطیب، ہر لکھاری، ہر ادیب، ہر دینی تحریک اور مسلم معاشرے کے ہر صاحبِ حیثیت فرد کی ذمہ داری ہے۔

- اس نظام کو سمجھ لینے اور تاریخ کے اہم حقائق ذہن نشین کر لینے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ برصغیر کے مسلمان اس وقت جن مسائل و پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں، ان کے لیے بھی یہی راہِ نجات ہے کہ وہ برصغیر کے اسی شجرِ جہاد کا دوبارہ احیاء کرنے میں مجاہدین کا ساتھ دیں جس نے صدیوں تک فرنگی دشمنوں کو سکون کی نیند نہیں سونے دیا اور ان کے عالمی و مقامی عزائم کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا۔ آج اس خطے کے مسلمانوں کے لیے یہی لائحہ عمل ہے کہ وہ امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد حفظہ اللہ کے جھنڈے تلے یکجا ہو کر اس پورے خطے کو کفار کے تسلط سے آزادی دلانے اور یہاں حقیقی اسلامی خلافت قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔
- اس کتاب کا آخری پیغام قبائلی علاقہ جات کی غیور اقوام سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کے لیے ہے، کہ وہ اپنے اس جہاد کی شرعی، تاریخی، سیاسی اور عسکری اہمیت سمجھیں اور اس گہرے فہم کی روشنی میں اپنی مبارک جہادی تحریک کو آگے بڑھائیں۔ اگر وہ اس تحریک کو درست خطوط پر آگے بڑھاتے رہنے میں کامیاب ہو گئے تو ان شاء اللہ ان کا یہ جہاد محض قبائل یا پاکستان ہی نہیں بلکہ عالمی منظر نامے میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا باعث ہو گا اور پوری امت کی آزادی اور پورے نیو ورلڈ آرڈر کے انہدام کا ایک اساسی ذریعہ ثابت ہو گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر سی کاوش کو قبول فرمالے اور اس کو دین کے احیاء، امت کی آزادی اور خلافت کے قیام کا جذبہ عام کرنے اور ان مقاصد کا گہرا اور راسخ فہم پیدا کرنے کا ذریعہ بنادے۔آمین ! وصلی اللہ علی نبینا محمد و علی آلہ وصحبہ وسلم۔

مراجع و مصادر

ذیل میں ان مصادر کی فہرست دی جارہی ہے جن کی مدد سے اس کتاب کی تصنیف ہوئی اور اس پر نظر ثانی کر کے اضافے کیے گئے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ یہ کتاب مصنف نے اپنے بیس سالوں کے مطالعہ کی بنیاد پر لکھی ہے، اور لکھی اس وقت ہے جب وہ محاذ پر موجود تھے اور کتابیں بہت ہی کم تعداد میں ان کے پاس میسر تھیں۔ لہٰذا یہاں وہی مصادر درج کیے جارہے ہیں جو دورانِ تصنیف میسر تھے۔

1. تفسير الطبري، دار هجر، الطبعة الاولى، المكتبة الشاملة، الاصدار 3.28، www.shamela.ws
2. تفسير البغوي، دار طيبة للنشر والتوزيع، الطبعة الرابعة، المكتبة الشاملة، الاصدار 3.28، www.shamela.ws
3. زاد المسير، المكتبة الشاملة، الاصدار 3.28، www.shamela.ws
4. بحر العلوم للسمرقندي، المكتبة الشاملة، الاصدار 3.28، www.shamela.ws
5. تفسیر ابن کثیر، اردو ترجمہ، دار القدس، لاہور
6. ترجمان القرآن، مولانا ابو الکلام آزاد
7. تاریخِ طبری، اردو ترجمہ، دار الاشاعت، کراچی
8. تاریخ ابن کثیر، اردو ترجمہ، دار الاشاعت، کراچی
9. الكامل في التاريخ لابن اثير، المكتبة الشاملة، الاصدار 3.28، www.shamela.ws
10. مقدمہ ابن خلدون، اردو ترجمہ، دار الاشاعت، کراچی
11. قصص الانبیا از ابن کثیر، ترجمہ ظفر اقبال کلیار، مکتبہ زاویہ، لاہور
12. جدید تاریخ یورپ ۱۷۸۹ء تا ۱۹۶۵ء پروفیسر ایم شمس الدین، نذر سنز
13. بائبل سے قرآن تک، رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ، اضافہ مفتی تقی عثمانی، ادارہ معارف القرآن، کراچی
14. عیسائیت کیا ہے؟ مفتی تقی عثمانی، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
15. سید احمد شہید، مولانا غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور
16. سرگزشتِ مجاہدین، مولانا غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور
17. تاریخِ دعوت و عزیمت، مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ، ادارہ نشریاتِ اسلام، لکھنؤ

18. فتاویٰ عزیزی کامل، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی
19. روسو، قاضی جاوید، ادارہ مشعل، لاہور
20. والٹیئر، قاضی جاوید، ادارہ مشعل، لاہور
21. بالآخر کیا ہوگا؟ سفر الحوالی، مبشرات، اسلام آباد
22. روزِ غضب، سفر الحوالی، اردو استفادہ حامد کمال الدین، ادارہ مطبوعاتِ ایقاظ، لاہور
23. جدید اسرائیل کی تاریخ، محمد احسن بٹ، دار الشعور، لاہور
24. History of England by Andre Maurios revised edition 1956
25. Dictionary of American History by James Henretta and others Worth Publishers 1993
26. Europe since Renaissance 1931
27. American Foregien Policy third edition Bruce W. Jentleson Printed by Norton company England 2007
28. The Protocols of the Learned Elders of Zion Translated by Victor E. Marsden printed by Britons Publishing Company 1969 England
29. The History of Zionism Walter Laqueur printed 2003 in association with European Jewish Publication society
30. The History of Western Philosophy by Bertrand Russell, Stratford Press, New York
31. The Indian Musalmans by W. W. Hunter, Trübner and Company, London
32. On War, Carl von Clausewitz, translated, Princeton University Press, USA

33. Afgan Wars And The North-West Frontier 1839-1947 by Michael Barthorp
34. The Influence of Sea Power Upon History by Alfred Thayer Mahan
35. Secret Societies by Reynold
36. Encyclopedia Encarta Premium 2009

اس کتاب کے پہلے مخاطب دنیا کے مختلف خطوں میں برسرِ پیکار مجاہدین فی سبیل اللہ، خاص طور پر خراسان میں برسرِ جہاد مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں اور مقصود یہ ہے کہ وہ عصرِ حاضر کی دنیا سے بخوبی واقف ہو سکیں اور اپنے دشمنوں کی حقیقت اور ان کی چالوں سے کامل آگاہی حاصل کرلیں تاکہ اس وقت جاری تحریکِ جہاد درست سمت میں رواں رہے، نشانِ راہ آنکھوں کے سامنے رہیں اور جادہ ومنزل معلوم ومتعین ہو۔ اللہ تعالیٰ تمام مجاہدین کے حامی وناصر ہوں، آمین۔

اس کے بعد یہ کتاب پوری امتِ مسلمہ اور اس کے سنجیدہ طبقوں کو مخاطب کر رہی ہے اور ان کے سامنے عصرِ حاضر کے حالات کا درست تجزیہ اور پھر اس کا درست حل پیش کرنے کی سعی کر رہی ہے۔ بلاشبہ ہر صاحب نظر مسلمان جانتا ہے کہ موجودہ 'یہود کے ہاتھ غلام' عالمی ذرائع ابلاغ نے حقیقی صورتحال کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کر رکھا ہے اور ان کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمان حقیقت سے دور رہیں اور شکوک وشبہات کا شکار رہیں، تاکہ یہ امت بحیثیتِ امت کہیں جاگ نہ جائے، ان کے مقابلے کے لیے کھڑی نہ ہوجائے اور وہ خلافت دوبارہ معرضِ وجود نہ آجائے جس نے صدیوں دنیا پر حکمرانی کی۔ ہم اپنی محبوب امتِ مسلمہ کے سامنے یہ واضح کرتے چلیں کہ یہ جنگ محض گروہِ مجاہدین کی جنگ نہیں اور نہ ہی دشمن یہ جنگ محض ان چند نوجوانوں کے خلاف لڑ رہا ہے، بلکہ یہ جنگ تو صلیبی صہیونی اتحاد تمام مسلمانوں اور امتِ مسلمہ کے خلاف لڑ رہا ہے اور اس کا اصل ہدف دینِ اسلام ہے۔ لہٰذا اس کا مقابلہ چند مجاہدین کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ یہ وہ وقت ہے جب امتِ مسلمہ کو بحیثیت ایک 'امت' دوبارہ میدانِ عمل میں اترنا ہے، میدانِ قتال میں موجود اپنے بیٹوں کی پشتیبانی کرنا ہے اور قتال سمیت دیگر تمام محاذوں پر ......دستیاب وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے...... خود بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کرنا ہے۔ پس یہ کتاب پوری امتِ مسلمہ کے لیے پیغامِ عمل ہے۔

حطین